عورت ابلیس اور خدا



ادریس آزاد

(۱)

"جب پاپائے روم نے سسلی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔ ۱۰۳۰ء تک لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بکتا تھا۔ فرانس کے ایک دریا ساؤن کے کنارے انسانی گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔" (ڈاکٹر ڈریپر)

---

(۲)

"ہمیں وہ اسلام نہیں چاہیے جو بوقت "نکاح" خطبہ اور بوقت "نزع" یٰسین پڑھنے کے کام آئے اور باقی تمام معاملات زندگی میں یورپ کے دسترخوان کی چچوڑی ہوئی ہڈیوں پر گزارہ کرے۔" (ابوالکلام آزاد)

---

(۳)

"خودی کی تربیت کا اولین مرحلہ جنسی ضبطِ نفس ہے۔" (اقبالؒ)

فہرست

عرض حال

محترم قارئین! یہ کتاب لکھنے کی ضرورت مجھے یوں پیش آئی کہ ایک روز اتفاق سے مریم ہسپتال کے ایک کرسچن ڈاکٹر کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر میری بات ہوئی۔ ڈاکٹر کی گفتگو سن کر میرا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ غیر مسلم اسلام کو ایک شہوانی مذہب سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ہندو، یہودی اور عیسائی اسلام کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ کرسچن ڈاکٹر کے یہ الفاظ تھے۔

> ''اسلام کیا ہے؟'' ''مذہب جنسیات'' جس میں ایک مرد اپنی جنسی ہوس کی تسکین کے لیے چار چار عورتیں رکھ سکتا ہے اور مسلمانوں کا ''تصور بہشت'' کیا ہے؟ یہی نا کہ ایک ایک مرد کے پاس ستر ستر جوان اور حسین حوریں ہوں گی جن کی پنڈلیاں شفاف چاندی کی طرح خوش رنگ اور سڈول ہوں گی۔''

ڈاکٹر سے گفتگو کے دوران ہی میرے ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ یہ صرف ایک عیسائی کا اعتراض نہیں ہے بلکہ پورا مغرب اسلام کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ غازی علم دین شہید کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے ہندو پبلشر راج پال نے بھی مسلمانوں کی اسی روش کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ حتیٰ کہ تعدد ازواج پر اعتراض کرتے ہوئے اس نے آقائے نامدار، محبوب رب العالمین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی۔ پھر مجھے روزنامہ دی نیشن (The Nation) میں شائع ہونے والا سلمان رشدی کی کتاب (Stanic verses) شیطانی آیات کا وہ اقتباس یاد آیا جس میں اس نے اسلام کو جنسی ہوس کا مذہب کہا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میری نظر میں قدرت اللہ شہاب کا وہ اقتباس گھومنے لگا جس میں انہوں نے اپنے سفر ہالینڈ کی روداد بیان کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''یہ تعصبات صرف ہالینڈ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی اور معاشرے

بھی اسلام کے متعلق اسی قسم کی تنگ نظری کا شکار ہیں- یہ معاشرے اپنی جگہ بڑے متمدن، تعلیم یافتہ اور آزاد خیال ہیں اور سیکولر شمار ہوتے ہیں- لیکن اسلام کے سیاق میں ان کی آزاد خیالی، بردباری اور سیکولرازم بڑی حد تک سلب ہو جاتی ہے- اس کی ایک وجہ تو وہ زہر ہے جو مسیحی پادری اور یہودی مذہبی پیشوا صدیوں سے اسلام کے خلاف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے پھیلاتے رہے ہیں- دوسری وجہ یورپین مستشرقین کا ایک خاص گروہ ہے جس نے علم و دانش کے پردے میں اسلام اور مسلمانوں کے خدوخال مسخ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے- ان کے گمراہ کن اقوال وافکار صرف دوسروں ہی کو اسلام سے بدظن نہیں کرتے بلکہ احساس کمتری میں مبتلا بعض مسلمانوں کے لیے بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں- ہالینڈ میں اس گروہ مستشرقین کی ایک واضح مثال پروفیسر سنوک ہرگوئین (Prof. C. Snouck Hurgronje) ہے- یہ صاحب لائیڈن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر تھے- ۱۸۸۴ء میں انہوں نے چھ ماہ جدہ میں گزارے اور پھر ایک فرضی اسلامی نام رکھ کر چھ ماہ کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے- حدود حرم میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے- لیکن پروفیسر صاحب جعلی مسلمان کے بھیس میں وہاں رہے اور بلد الامین میں مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت پر جرمن زبان میں دو جلدوں کی ایک کتاب "مکہ" (Makkah) لکھی- اس کے علاوہ وہ ڈچ زبان میں حج کے موضوع پر ایک کتاب "جشن مکہ" (Het Mdkkansche Feest) کے عنوان سے بھی لکھ چکے تھے- جو لوگ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی رسومات اور مسلمانوں کے حالات کا کھوج لگانے نکلے ہوں ان کے مقاصد میں خوش نہادی، خیرسگالی اور انصاف طلبی کی تلاش سعی لاحاصل ہے- یہ ایسی ہی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ ایک عام ولندیزی کے ذہن میں مسلمانوں کا تصور حرم گشتگی، بے راہ روی، بربریت اور بدمعاملگی کے مترادف تھا-

میونسپلٹیوں کے نظام کے مطالعہ کے سلسلہ میں مجھے ہالینڈ کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی جانا پڑتا تھا- ایک جگہ میری رہائش کا بندوبست ایک ایسے خاندان

میں ہوا جس میں پانچ بیٹیاں اور چار لڑکے تھے- یہ خاصا مذہبی گھرانہ تھا- پہلی شام جب ہم اکٹھے بیٹھے تو سارے لڑکے اور لڑکیاں میرے گرد ہو گئے کہ بتاؤ پاکستان میں تمہاری کتنی بیویاں، کتنی لونڈیاں اور کتنے غلام ہیں- وہ بڑی دیر تک مجھ سے اسی موضوع پر جرح کرتے رہے- میرے جوابوں سے مایوس ہو کر ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یا تو یہ شخص واقعی مسلمان نہیں یا ہمارے ساتھ مصلحتاً جھوٹ بول رہا ہے(۱)-"

قدرت اللہ شہاب کا ایک ایک لفظ میرے تصور میں دھیرے دھیرے تیرتا رہا- مجھے یاد آیا کہ یہود و نصاریٰ شروع دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد پر اعتراض کرتے آئے ہیں- میرے تصور میں جوں جوں غیر مسلموں کے الزامات اور بہتان جو انہوں نے اسلام پر لگائے گردش کرتے گئے- میرا دل گہرے افسوس کی اداس جھیل میں ڈوبتا چلا گیا- مجھے محسوس ہوا کہ مغرب کا کامیاب پروپیگنڈا پوری دنیا کے انسانوں کی اسلام کے بارے میں سوچ کو بدل چکا ہے- وہیں بیٹھے بیٹھے میری چشم خیال میں فرائڈ کی ریسرچ، ڈاکٹر انون کے نتائج اور گرو رجنیش کے لیکچرز گھومنے لگے- وہیں بیٹھے بیٹھے میرے تصور میں کئی کتابوں کے مضمون، کئی مستشرقین کے تبصرے اور کئی لوگوں کی باتیں ایک ایک کر کے گردش کرنے لگیں جو مسلمانوں کو ایک شہوت زدہ قوم سمجھتے تھے- میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور ایسا کس نے کیا؟ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسلام تو ایسا نہیں- مجھے معلوم تھا کہ اسلام میں تعدد ازواج کے مسئلے کی کیا حقیقت ہے یا "بہشتی حوریں" قرآن حکیم نے کن عورتوں کو کہا ہے-

میں نے اپنی بساط کے مطابق کرسچن ڈاکٹر کی غلط فہمی دور کرنے اور اسے سمجھانے کی کوشش کی- میں نے دیکھا کہ میرے سمجھانے سے اس کے خیالات میں تبدیلی آئی- یہیں سے میں نے فیصلہ کیا کہ میں جنسیات کے موضوع پر ایک ایسی کتاب لکھوں گا جس میں مسلمانوں کی شہوت پسندی سے متعلق سمجھدار غیر مسلموں کو حقائق سے آگاہ کیا جائے- لیکن اگر میں ان خیالات کو عملی جامہ پہناتا تو میرے لیے ضروری تھا کہ میں صرف غیر مسلموں سے خطاب کروں اور اسلام کا دفاع کروں- لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا- میری خواہش تھی کہ میں اس موضوع پر غیر جانبدار ہو کر کڑی اور عرق ریز قسم کی تحقیق کروں تاکہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہر طبقہ کے افراد ان حقائق سے باخبر ہو جائیں جو شہوانیت کے موضوع پر اس دنیا میں فی الحال تک دستیاب ہیں-

ظاہر ہے یہ بہت بڑا کام تھا- میں نے اس سلسلے میں جب مطالعے کا آغاز کیا تو میرے پیش نظر سب سے پہلے ''تخلیق آدم'' پھر ارتقاء تمدن' پھر تاریخ انسانیت' پھر دانشور کے افکار' پھر مذاہب عالم اور آخر میں اسلام تھا اور یہی ترتیب یونہی خود بخود اس کتاب کی ترتیب بن گئی-

میرے سامنے بڑی وسیع دنیا تھی- مجھے درحقیقت اسلام اور مغرب کے درمیان مصالحت کا راستہ تلاش کرنا تھا- چنانچہ ضروری تھا کہ میں ان گم شدہ حقائق سے پردہ ہٹاؤں جو چند خفیہ ہاتھوں نے جان بوجھ کر چھپا رکھے ہیں- مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ سمندر پار بسنے والا مغرب کا انسان تعصب اور کینہ کا شکار ہو چکا ہے- مغرب کے ارباب دانش کا دہرا طرز عمل دیکھ کر مجھے گہرے دکھ سے دوچار ہونا پڑا- اس دوران میری نظر سے یورپ کے مایہ ناز مفکرین کے خیالات بھی گزرے- ان میں وہ سائنسدان اور ماہرین بھی شامل تھے جو اپنے کام کے حوالے سے غیر جانبدار سمجھے جاتے ہیں- خصوصاً فرائڈ اور ڈاکٹر انون کے نظریات...... انسانی تمدن کی بہبود کے سلسلے میں جنسی علوم کے ماہر سگمنڈ فرائڈ کے الفاظ یہ تھے-

''ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے- کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے- ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے- ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصد زندگی نہ بن جائے تو یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں (۲)-''

فرائڈ کا یہ خیال کہ جنسی ضبط نفس سے کام لے کر انسان کی سماجی صلاحیتوں کو بڑھایا جا سکتا ہے- خالص قرآنی نظریہ ہے- جسے ''نظریہ عفت'' کہتے ہیں-

اہل مغرب تو جنسی ضبط نفس کے نام تک سے واقف نہیں- جنسی ضبط نفس یہ ہے کہ انسان اپنے شہوانی جذبات پر قابو رکھے اور اپنے جیون ساتھی کے سوا کسی اور کے ساتھ آلودہ نہ ہو- اس سے بڑھ کر ضبط نفس یہ ہے کہ انسان اپنے جیون ساتھی کے ساتھ جنسی تعلقات فطرت کی رہنمائی میں قائم کرے- یعنی صرف اور صرف ''مجامعت برائے افزائش نسل'' پر عمل کرے- یہ تو ہے صحیح معنوں میں

جنسی ضبط نفس- لیکن کیا یہ بھی جنسی ضبط نفس ہے کہ جو نسل کنٹرول کرنے کے لیے اہل یورپ کا طریقہ ہے- بچے کی پیدائش روکنے والی ادویات کا استعمال ضبط نفس تو نہ ہوا الٹا جنسی بے راہ روی کا ثبوت ہوا اور اب یہ عالم ہے کہ بچے پیدا کرنے کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے اہل یورپ کو جنسی اختلاط برائے لذت محض کی عادت ہو گئی ہے- انہوں نے معاشرے کو نئی نسل فراہم کرنے کا فریضہ بھلا دیا ہے- عوام افزائش نسل کے کام کو ناپسند کرنے لگی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج یورپ کے ارباب اختیار آبادی کے کم ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو گئے ہیں-

نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ میں فرانس کے قومی مرکز برائے مطالعہ آبادی کے سربراہ کا یہ بیان شائع ہوا-

''تاہم یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مغرب کے قائدین اس وقت مغرب کی آبادی میں اضافہ اور ترقی پذیر ممالک میں اس کی کمی کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں (۳)-''

امریکی سی آئی اے نے ایک تفصیلی غیر خفیہ دستاویز تیار کی ہے- جس میں مغرب کی گھٹتی ہوئی آبادی اور اس کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے (۴)- ''سٹوانگلینڈ'' کے مطابق محض جرمنی میں آبادی کی کمی کو روکنے کے لیے اگلے پچاس سالوں میں ایک کروڑ بہتر لاکھ افراد کی ضرورت ہو گی (۵)-

یہ ہے اہل مغرب کا ضبط نفس حقیقت میں یہ ضبط نفس نہیں ضبط اولاد ہے- اس کے برعکس مشرق میں فیملی پلاننگ کے منہ زور لشکر کی یلغار کے باوجود آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے- اہل مغرب نے اپنے ہاں بچے روکنے والی ادویات بنائیں تا کہ محض جنسی حظ اٹھایا جا سکے اور ان کی پالیسیوں نے مغرب کو نئی صحت مند نسل سے محروم کرنا شروع کر دیا- وہی پالیسیاں جو مغرب میں ایسے بھیانک نتائج کا باعث بنی ہیں- تیسری دنیا میں روک کیوں نہیں دی جاتیں- یہی وہ تعصب ہے اور وہ دہرا کردار جو اہل یورپ کی سوچ کا خاصہ ہے- دراصل اہل یورپ کو تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خطرہ نہیں بلکہ ان کو لاحق اصل خطرہ اپنی تیزی سے کم ہوتی ہوئی آبادی کا ہے- حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یورپ کے لوگ جذبہء شہوت کی تسکین کے لیے ہر اصول اور قاعدے سے بے پرواہ ہو کر شب و روز مادۂ منویہ کی نہریں بہاتے رہتے ہیں- اتنے زیادہ انسانی سپرم

(انڈے) ضائع کردینے کے باوجود وہاں انسانی آبادی پریشان کن حد تک گھٹتی جارہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح محض جنسی چسکے کے لیے شب و روز زنا کرنے والی اقوام بالآخر فنا ہو جاتی ہیں۔ اسی بات کو بیان کرنے کے لیے میں نے اس کتاب میں "قدیم اقوام کے ابلیسی مذاہب" کا باب باندھا ہے۔ قوموں کے تمدن پر جنسیات کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جے ڈی انون (J.D. Unwin) کی تحقیق بھی آئی ہے۔ ڈاکٹر انون مغرب کے مشہور اور مایہ ناز ماہر جنسیات ہیں۔ ڈاکٹر انون نے لکھا ہے۔

"کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات پر کس قسم کے ضوابط قائم کر رکھے تھے۔ اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک شادی سے پہلے زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے (۶)۔"

ڈاکٹر انون کو اہل علم طبقہ اتھارٹی تسلیم کرتا ہے اور ڈاکٹر انون کی تحقیق سے یوں لگتا ہے جیسے وہ اسلامی معاشرہ سے بے حد متاثر ہیں۔ کیونکہ جس عفت و عصمت یا ضوابط کی بات ڈاکٹر انون نے کی ہے اسی کو مسلمانوں کے ہاں "نظریہء عفت" کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت محض عیاشی کی خاطر نہیں بلکہ قرآن کا یہ حکم ہے۔

فان خفتم ان لاتقسطو فی الیتمیٰ فانکحو ما طاب لکم مثنیٰ وثلثہ وربع ○ وان خفتم ان لا تعدلو فواحدۃ ○

ترجمہ: اور جب تمہیں خوف ہو کہ معاشرے میں بے سہارا عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا تو تم اپنی استطاعت کے مطابق ان کے ساتھ نکاح کرلو، دو کرلو، تین کرلو یا چار کرلو اور اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ تم اپنی بیویوں کے مابین عدل نہیں کر پاؤ گے

تو ایک ہی کرنا۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم مرد اور عورت کو کسی اور طریقے سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گویا شادی سے قبل اور شادی کے بعد عفت و عصمت کی سلامتی کا حکم دیتا ہے۔ یہ تو ہے اسلام کی صورت حال لیکن جب ہم یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں یا بعض دیگر مذاہب کی تعلیمات پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ دیکھ کر کلیجہ کانپ جاتا ہے کہ ان مذاہب کے پیش کرنے والوں نے انسان کی جنسی زندگی کو آخری حد تک مسخ کر دیا ہے۔ انبیاء کے بعد یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشواؤں نے آسمانی صحائف میں تبدیلیاں کر دیں۔ اسی طرح سری رام چندر جی اور مہاتما بدھ کے ماننے والوں نے بھی اپنے مصلحین کی تعلیمات کو شہوانی عقائد سے آلودہ کر دیا۔ "آسمانی مذاہب میں شہوانیت کا نفوذ" کے نام سے اسی کتاب کا ایک باب بائبل کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ جبکہ اسلام "خفظین فروجھم والخفظت" (اپنے اعضائے تناسل کی حفاظت کرنے والے اور کرنے والیاں) کو "مومنین" یعنی انسانی معاشرے کے بہترین لوگ کہا ہے۔

اسی کتاب میں میں نے جینز اور لاشعور کے حوالے سے بھی کچھ باتیں کی ہیں۔ جن کے ذریعے مجھے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ انسانی فطرت میں جذبہء شہوت کا طرز عمل بری طرح بگڑ چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ انسان ہی تھا جس نے ایک سیدھے سادھے فطری جذبے کو شعوری کوشش کے ذریعے بگاڑ کر ایک شیطانی جذبہ بنا دیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ صرف قرآن کے نظریہء عفت پر عمل کرکے ہی انسانیت کی ڈولتی ناؤ کو سہارا دیا جاسکتا ہے۔

دراصل انسان کب اور کس طرح دنیاوی مصائب و آلام پر قابو پا کر بہترین بہشتی معاشرہ تخلیق کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانوں میں دو طریقوں سے معتدل سوچ راسخ کی جاسکتی ہے اور دونوں طریقے لاگو کرنا لازم بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک ہے ارتقاء (Evolution) اور دوسرا ہے انقلاب (Revolution) یعنی نظریات کا ارتقاء اور پھر نظریاتی انقلاب اور جب ارتقاء کے ذریعے انقلاب آئے گا تو اسی انقلاب کے ذریعے پھر مزید تیزی کے ساتھ نظریات کے مختلف مراحل کا ارتقاء شروع ہو جائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ارتقا اور انقلاب کا یہ چکر تقدیر کے ماتحت خود بخود چلتا رہے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ارتقا ہو یا انقلاب دونوں انسان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہوں گے۔ نہ کہ تقدیر کے پھیر کا۔ یعنی پہلے افراد

معاشرہ کو ایک متوازن نظام کے قیام کے لیے آمادہ کیا جائے گا- عوامی رائے کے نتیجے میں انقلاب برپا ہوگا- پھر انقلاب کے ذریعے عوام کو ان کی شعوری سطح پر سمجھایا جائے گا کہ فطری جذبات خصوصاً جذبہء جنس پر قابو پانے سے جینز میں تبدیلی واقع ہوتی ہے- جینز کی تبدیلی جو کہ ایک طویل ارتقائی پروگرام ہے- ایک نہ ایک دن انسان کے خلیات میں ہونے والی ہے- انسان اپنی سرشت میں سے ایک نہ ایک دن جناتی خصلتوں کو نکال کر پھینک دے گا اور وہ دن ضرور آئے گا جب انسان کائنات کے اکھاڑے میں تمام ملائکہ کے سامنے ابلیس کو اٹھا کر پٹخ دے گا- یہی انسان کی پیدائش کا مقصد ہے اور یہی اب کائنات کا نظام-

ایک اور چیز جسے کتاب میں شامل کرنا میں نے ضروری سمجھا وہ ہے لاشعور- انسان کے جذبہء شہوت کا سب سے گہرا تعلق نفسیات کے ساتھ ہے- جذبہء شہوت پر کنٹرول سے نفسیات میں ہلچل مچ جاتی ہے- گرور جنیش کا یہ کہنا کہ......

> "جنسی ضبطِ نفس محض دکھاوا ہے- حقیقت میں کوئی انسان اس جذبے پر قابو نہیں پا سکتا- بلکہ جو شخص یہ کہے کہ وہ شہوت پر کنٹرول رکھتا ہے درحقیقت اس کے اندر سب سے زیادہ شہوت کی تحریک پائی جاتی ہے- جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں روزہ رکھوں گا تو حقیقت میں اس کے اندر کھانے کا شدید شوق پایا جاتا ہے- لہٰذا ایسا کہنے والا جھوٹ کہتا ہے (۷)-"

مکمل طور پر درست نہیں- کیونکہ اسلام کا متوازن نظام عیسائیت یا یہودیت کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا- اسلام قوت شہوانیہ کے اعتدال کو انسان کے لیے بہترین راہ حیات کہتا ہے- چنانچہ یہ قوت شہوانیہ کا اعتدال ہی ہے جو انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتا اور اس کے لاشعور میں فجور اور تقوے کی مقداریں مقرر کرتا ہے-

اس طرح میں نے کوشش کی ہے جہاں جہاں ضرورت ہو اپنی بات کی وضاحت کے لیے سائنس خصوصاً حیاتیات کی مدد سے بھی گریز نہ کیا جائے- مجھے انسان کے جنسی رجحانات میں ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنا تھا- لہٰذا مجھے تخلیق آدم کے مسئلے کو بیان کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی- یہ بنیادی طور پر الٰہیات کا مسئلہ تھا جو میرے بس کی بات نہ تھی- لامحالہ الٰہیات یا فلسفہ بیان کرنے کے لیے مجھے بڑے بڑے فلسفیوں کے خیالات کا مطالعہ کرنا تھا اور یہ ایک انتہائی مشکل اور دقت طلب

کام تھا- لیکن اس سلسلے میں علامہ اقبال کے خطبات "Reconstrrction of Relegious thought in Islam." نے میری تمام مشکل آسان کر دی- علامہ محترم کے خطبات میں نظریہء ارتقا سے متعلق مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی- لیکن اب مسئلہ تھا قرآن کے نظریہء حسن کو سامنے رکھتے ہوئے ارتقائے حیات اور الٰہیات اپنی ضرورت کے تحت بیان کرنے کا- کیونکہ میرا مطمع نظر تو یہ تھا کہ جنسی تبدیلیوں کو بیان کیا جا سکے- اس سلسلے میں میں نے نینڈرتھل کے زمانے سے انسان کی نفسیاتی تاریخ بتانا شروع کی- نینڈرتھل سے پہلے معاملہ الٰہیات کا تھا- چنانچہ مجھے کتاب کے آغاز میں "عشق کا ادھورا افسانہ" تحریر کرنا پڑا- میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا، کوئی طریقہ نہ تھا کہ میں ان حقائق کو جن کے لیے انسانی زبان میں الفاظ نہیں ہیں عام فہم انداز میں بیان کروں- چنانچہ میں نے عشق کا ادھورا افسانہ میں وہ تمام بڑے بڑے حقائق سمیٹنے کی کوشش کی ہے جن میں ہر ایک پر کئی کئی کتابیں لکھنے کی گنجائش ہے- لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں سب سے اہم چیز "عشق کا ادھورا افسانہ" ہے- میرا اللہ پر بھروسہ ہے کہ میرے جس قاری کو "عشق کا ادھورا افسانہ" کی سمجھ آ گئی اس کے لیے اسلام کا متوازن نظام حسن سمجھنا معمولی بات رہ جائے گی-

میں نے اپنی بات کے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب لکھنے کی ضرورت مجھے مستشرقین کے اعتراضات کی وجہ سے پیش آئی- دراصل اہل یورپ کا یہ پروپیگنڈا کہ اسلام شہوانیت کا مذہب ہے یا یہ کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے- فی زمانہ ماضی کی نسبت کئی گنا بڑھ گیا ہے اور اب تو مسلمانوں پر قتل و غارت گری کا شوقین ہونے کا الزام لگا کر انہیں دہشت گرد کہہ دیا گیا ہے- اس طرح گویا اسلام کو ایک نظام اور مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے کاروبار جہاں کے دائرہ سے نکال دیا گیا ہے- اس وقت دنیا بھر کے مسلمان احساس کمتری، خفت، مایوسی اور غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں- اہل یورپ کا میڈیا برق رفتار ہے اور ان کے مواصلاتی سیارے زمین کے مضافات میں چوکیداری کر رہے ہیں- ایسے عالم میں ان کے گمراہ کن پروپیگنڈے کا کیا سدباب کیا جا سکتا ہے- یہی سوچ تھی جس نے مجھے "عورت، ابلیس اور خدا" کی تکمیل کے لیے متحرک رکھا- سچ تو یہ ہے کہ یورپ کے دانشور اسلام کی حقانیت سے خوفزدہ ہیں- بریفولٹ نے اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" میں مسلمانوں کے ساتھ مغربی مفکرین کا سلوک بیان کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ

"لہٰذا تجربی منہاج پر فخر کرنے کا حق راجر بیکن کو پہنچتا ہے- نہ ہی اس کے مشہور ہم نام فرانسس بیکن کو راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ مسیحی یورپ میں اس کا شمار اسلامی سائنس اور منہاج سائنس کے مبلغین میں ہوتا ہے- وہ یہ کہتے کبھی نہیں تھکا کہ اگر اس کے معاصرین کو سچ مچ علم کی تلاش ہے- تو انہیں چاہیے عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کریں- رہی یہ بحث کہ منہاج تجربی کس کی ایجاد ہے- سو یہ بھی ایک نمونہ ہے ان زبردست غلط بیانیوں کا جو مغربی تہذیب کے مبداء و ماخذ کے بارے میں کی جاتی ہیں- اس لیے کہ بیکن کا زمانہ آیا تو عربوں کا تجربی منہاج سارے یورپ میں پھیل چکا تھا-" (ص ۲۰۲)

"سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب نے جدید دنیا کی کی ہے وہ سائنس ہے- گو اس کے ثمرات بہت آگے چل کر ظاہر ہوئے- یہ عفریت پوری شان اور قوت سے نمودار ہوا تو اس وقت جب اسلامی اندلس تاریکی کے پردوں میں چھپ چکا تھا- لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی- اسلامی تہذیب وتمدن کے اور بھی متعدد اور گوناگوں اثرات ہیں جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب وتاب حاصل کی- مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب وثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتہ نہ چلے (۸)-"

بریفولٹ کے اس اعتراف کی سند ہمارے پاس نہ بھی ہو تو بھی کسی دانشمند کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یورپ کی تمام تر ترقی اسلامی تہذیب کا عکس ہے- ورنہ صرف تین صدیاں قبل اہل یورپ کی تہذیبی حالت قابل رحم تھی- ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ

"وسطی یورپ میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا- لوگ مویشیوں کے ساتھ رہتے- سال سال ایک ہی لباس پہنتے- نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی (۱۲۱۲ تا ۱۲۵۰) پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے- جب سپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا تو فلپ دوئم (۱۵۵۶ تا ۱۵۹۸) نے تمام حمام حکماً بند کر دیے- اسی بادشاہ نے اشبیلیہ کے گورنر کو محض اس لیے معزول کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی

طرح روزانہ ہاتھ منہ دھوتا ہے- غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے لوگوں میں جوؤں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ کنٹری بری (برطانیہ) کا لاٹ پادری باہر نکلتا تو اس کی قبا پر سینکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتیں- ۱۰۳۰ء تک لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بکتا تھا- فرانس کے ایک دریا ساؤن کے کنارے انسانی گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں (۹)-"

جب صرف تین صدیاں قبل اہل یورپ کی جہالت اور بدتہذیب کا یہ عالم ہے تو پھر وہ کون سی طاقت ہے جس کے بل پر انہوں نے آج دنیا کی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے اور اس بات کا یہی جواب ہے کہ اہل یورپ کی تمام تر تہذیب اسلامی تہذیب وتمدن کا عکس ہے- ورنہ اخلاقی لحاظ سے تو آج بھی اہل یورپ پستی کے اندھے کنوؤں میں گرے ہوئے ہیں- واشنگٹن میں یہ قانون پاس ہوا ہے کہ:

"جنسی تسکین ایک بنیادی ضرورت ہے- اسے طبعی جوڑوں تک محدود یا قدیم اخلاقی اصولوں کا پابند ہرگز نہیں بنانا چاہیے-"

اسی طرح "سیکس فری کرانیکل" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک بیالیس ۴۲ سالہ خاتون نے نیویارک میں اپنے بیٹے سے شادی کر لی- اس طرح کی خبریں آئے دن مغربی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں- "سنڈے پوسٹ" اپنی چودہ اگست انیس سو ستانوے ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ

"جونز برگ پولیس نے بالآخر اس راہبہ کو گرفتار کر لیا ہے جس کے زیر اثر تربیت حاصل کرنے والے بارہ سے پندرہ سال کے تین بچے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تھے- تفصیلات کے مطابق راہبہ "کیتھرین" اپنے مقامی چرچ میں بچوں کو مذہبی تعلیم دینے پر مامور تھی- تین سال قبل اس کے پاس کچھ بچے بغرض تعلیم آئے- جن سے اس نے مذہبی تعلیم کی آڑ میں ناجائز تعلقات استوار کر لیے جو مسلسل تین سال تک جاری رہے- جس سے تین بچے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تھے- جنہیں والدین نے ماہرین نفسیات کو دکھایا تو انہوں نے نفسیاتی معائنے کے بعد اس راہبہ کے خلاف عدالتی کارروائی کرانے کا کہا- راہبہ نے بھی پولیس تفتیش کے دوران اپنی زیادتی کا

اعتراف کرلیا ہے۔ بچے ابھی تک نارمل نہیں ہو سکے۔''

یہیں پر اکتفا نہیں ''بشپ آف کنٹربری'' نے تو حد ہی کردی...... اس نے اہل یورپ کی جنسی بے راہ روی کو حسب سابق مذہب کی سند عطا کردی۔ اس کے بقول

''حضرت عیسیٰؑ نے اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ ہم جنسیت میں مبتلا تھے۔ (معاذ اللہ)''

یہ ہے اہل مغرب کی تہذیبی صورت حال...... اس کے برعکس ان کے تعصب کا یہ عالم ہے کہ ہر لمحہ اسلام کے متوازن نظام میں رخنے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مغربی مفکرین کی ہرزہ سرائی اہل اسلام کے خلاف بلاجواز ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ''جین پیئر پیرونسل'' بھی ایسا ہی ایک مغربی دانشور ہے جو قاہرہ میں حصول تعلیم کے سلسلے میں رہ چکا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے۔ ''محمد کی کشتی''...... اس کتاب میں ''پیرونسل'' نے کچھ عیسائی عربوں کی جنسی بے راہ روی کی روایات جمع کی ہیں۔ مثلاً اس نے لکھا ہے کہ

''کچھ عرب شوہر اپنی بیویوں سے جسم فروشی کرواتے تھے تاکہ ان لڑکوں کا خرچ اٹھانے کے قابل ہوسکیں جنہیں بدفعلی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔''

''محمد کی کشتی'' میں ''پیرونسل'' نے ایک اور مقام پر یہ غلاظت اگلی ہے۔

''صرف اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ افریقہ میں مردوں اور لڑکوں کے درمیان شہوت پرستانہ افعال فروغ پا رہے ہیں۔''

یاد رہے کہ عربوں اور مسلمانوں میں واضح فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''پیرونسل'' نے محمد کی کشتی میں غیر مسلم عربوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کی ہیں۔ مستشرقین کی یہ علمی بددیانتی مخلص یورپی علماء کے نزدیک بھی قابل مذمت ہے۔ ان غیر جانبدار مغربی مصنفین میں ''بریفولٹ'' اور ڈاکٹر ''ڈریپر'' جیسے لوگ شامل ہیں۔

بریفولٹ اور ڈاکٹر ڈریپر جیسے لوگ جو بات تسلیم کرتے ہیں۔ مغرب کے دیگر بہت سے مفکرین اس بات سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر انون کو ہی لیجیے جن کا ایک اقتباس میں نے پیچھے درج کیا ہے۔ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت اور تمدن دنیا کا بہترین تمدن ہے۔ لیکن ڈاکٹر انون کا وہی تعصب جو اہل مغرب کا خاصہ ہے عود کر آتا ہے اور وہ اپنی کتاب ''سیکس اینڈ کلچر'' میں لکھتے ہیں......

''جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ سپین میں۔'' (ص ۴۲۹)

آپ نے دیکھا ڈاکٹر انون نے کیسا سفید جھوٹ بولا ہے۔ کیونکہ عرب کے جن فاتحین کا وہ ذکر کر رہا ہے یہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم تھے اور اس وقت معاملہ بالکل الٹ پیش آیا تھا۔ یعنی ہوتا یوں تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا لشکر عیسائیوں یا یہودیوں کے کسی شہر میں داخل ہوتا تو ان کے پادری نوجوان لڑکیوں کو نیم برہنہ کر کے فاتحین کے سامنے لا کھڑا کرتے۔ جبکہ بقول علامہ واقدیؒ مسلمان ان نیم برہنہ لڑکیوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومتوں کو تو پریشانی ہی یہی رہی کہ یہود و نصاریٰ اپنی نوجوان لڑکیوں کو جنس کی تربیت دے کر مسلمان امراء کے پیچھے چھوڑ دیتے اور یہ روش تو یہود و نصاریٰ نے آج تک نہیں چھوڑی۔ آج بھی مسلمان حکمرانوں کا ایمان خریدنے کے لیے یہودی اور عیسائی یہی ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے بہت سے عرب حکمرانوں کے علاوہ یاسر عرفات کی مثال بھی موجود ہے۔

''عورت' ابلیس اور خدا'' میں میں نے صرف اس بات پر زور نہیں دیا کہ مغرب نے جنسی بے راہ روی کو فروغ دیا ہے۔ بلکہ میں نے اپنے آپ کو کرۂ زمین پر بسنے والے ایک عام انسان کی جگہ پر رکھ کر جذبۂ جنس سے متعلق بے لوث تحقیق کی ہے۔

اس وقت یعنی ۲۰۰۲ء میں دنیا کی دونوں بڑی تہذیبیں یعنی اسلام اور مغرب آمنے سامنے آ چکی ہیں اور دونوں میں ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ ایسے عالم میں اس کتاب کی اشاعت خصوصی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ کیونکہ عوام کی نظریں بے شک طاقت پر رہیں...... اہل علم کی نظریں تو ہمیشہ حقائق پر رہتی ہیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ میری یہ محنت خصوصاً ان دنوں میں زیادہ رنگ لائے گی کیونکہ تہذیبوں کی یہ جنگ بہرحال ایک فیصلہ کن جنگ ہے۔

اس کتاب پر کام کرنے کے دوران میں پے درپے کئی کیفیتوں سے گزرا۔ اس دوران حالات بھی بڑی تیزی سے تبدیل ہوتے رہے۔ پچھلی صدی کی دنیا پیچھے رہ گئی اور نئی صدی کی دنیا

ایک نئے جوش کے ساتھ نمودار ہوئی۔ طالبان کوہ ہندوکش کی اوٹ میں غروب ہو گئے اور دنیا کا اکلوتا خدائی فوجدار امریکہ مسلمانوں کے سینے پر آ دھمکا۔ دہشت گردوں کے تعاقب میں امریکہ مسلمانوں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہے۔

بہت سے ملکوں کے پاس ایٹم بم ہے۔ بہت سی قومیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔ آسمان کی عمر رسیدہ آنکھیں زمین پر انسانوں کو ایک بار پھر دنگا اور فساد کرتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ ابن آدم اپنی ہی نسل ختم کرنے کے درپے ہے اور اہل دل اپنے اپنے دل تھامے ایک طرف حیران و پریشان انگشت بدنداں کھڑے ہیں۔ خدا جانے شعور مزید کیا گل کھلانے والا ہے۔

''عورت، ابلیس اور خدا'' کی تکمیل ایک میز کرسی پر بیٹھ کر نہیں ہوئی۔ مجھے اس کتاب کی تکمیل کے لیے کون کون سے گھاٹ کا پانی پینا پڑا۔ یہ تو آپ کو کتاب کے مطالعہ سے ہی پتہ چلے گا۔ ہاں البتہ اس کار خیر میں اپنے ان ساتھیوں کے نام خود بتاتا چلوں جنھوں نے میرے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔ سب سے پہلے میں محمد منیر ایاز صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے بعض کتابیں اور مضامین فراہم کیے۔ اس کے بعد میں اپنے ہمدم اور ہم قدم قاسم شہزاد کا شکر گزار ہوں جس نے اس تصنیف کا ایک ایک جملہ لکھنے میں میرا ساتھ دیا۔ حافظ محمد ریاض اور حافظ عبدالرحمٰن وہ نوجوان ہیں جنھوں نے اس کتاب کے ایک ایک صفحے کو سنا اور قدم قدم پر میری راہنمائی کی اور ywc کے منتظم سلیم سنی صاحب کی عنایات بھی شکریہ کی مستحق ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ان احباب کے تعاون کے بغیر میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا اور سب سے زیادہ تو میں ممتاز شاعر جناب سعد اللہ شاہ صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے اس تحریر کو شائع کروانے کے لیے میری راہنمائی فرمائی اور آخر میں میرے پبلشر جناب محمد طاہر نذیر صاحب کا ذکر بھی ضروری ہے جو میری تحریریں انتہائی شفقت سے شائع کر دیتے ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام

ادریس آزاد

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۴، اسلام آباد

باب ۱

آفرینش سے تمدن تک

عشق کا ادھورا افسانہ

''اے میرے محبوب!
میں تیرے دیدار کا متمنی ہوں
آ! میرے روبرو بیٹھ
کہ تجھے دیکھوں
تو کیا ہے؟
اسرار نہاں کہ رمز پوشیدہ
کھل
مجھ پر کھل
عیاں ہو
فاش ہو
اے! سب سے حسین راز
اپنا جلوہ دکھا''

معلوم نہیں کہاں سے فریادی کی گھٹی گھٹی آواز ابھر رہی تھی۔ یہ کون تھا؟ کہاں تھا؟ کیا تھا؟ جس کی لرزتی، کانپتی صدا بربط کے ڈھیلے تاروں جیسی مضمحل، دھیرے دھیرے سنائی دے رہی تھی۔ یہ فریادی تھا، عاشق، سودائی، دیوانہ۔

''میں تیرے درشن کے لیے بے چین ہوں
مجھے دکھائی دے

اے رمز سربستہ

اے حقیقت سرمدیہ

اے شعلۂ مستور

دیکھ

میری بے قراری دیکھ

سن

میری آہ و زاری سن

میرے سامنے آ

کہ میری جبیں میں ہزار ہا سجدے تڑپ رہے ہیں''

وقفے وقفے سے فریادی کی نحیف آواز ابھرتی رہی' اس کی آرزوئیں التجا بن گئیں' وہ گڑگڑانے لگا۔

''اے میرے حسین محبوب.

مجھے اپنے وصال سے محروم نہ رکھ

اے منتظر

میرا انتظار دیکھ

اے رخ روشن

ان گھٹاؤں سے نکل

میری چشم بے تاب کے سامنے آ

وقت رک جائے

زمانہ تھم جائے

اے حقیقت مستور

اپنا ظہور کر

اور پھر یوں ہوا کہ سمٰوات میں ایک سرسراتی ہوئی آواز گونج گئی

اے میرے عاشق

ہم مستور نہیں

ہم سربستہ نہیں

اپنی نظروں کا ظرف وسیع کر

ہمیں دیکھ

ہم تیرے سامنے ہیں''

فریادی چونک اٹھا' یہ صدا کیسی تھی۔ یہ الوہیاتی آواز جس کا ایک ایک لفظ دعوت نظارہ' جس کا ہر ہر حرف وصل کا اشارہ' فریادی دل گرفتہ ہوا۔

''اے کاش!

اے کاش! میری نظریں محدود نہ ہوتیں

میرا ظرف مختصر نہ ہوتا

میری ہمتیں پست نہ ہوتیں

اے کاش!

میں تیرے جلوے کی تاب لا سکتا

تیری تجلی کا نظارہ کر سکتا

اے حقیقت مطلقہ

اے حسن محیط

تو کہاں ہے؟

میں کہ سراپا انتظار ہوں

تیرے وصل کی آس میں بے قرار ہوں

مجھے بینائی بخش

کہ تیری تصویر اشکوں میں سجا لوں

مجھے روح عطا کر

کہ تیری خوشبو سانسوں میں بسا لوں

میرے من کے خالی برتن میں اپنے حسن کی بھیک ڈال
اے حسن آخر
اے روح کل
مجھے دکھائی دے۔"

اور پھر یوں ہوا کہ ایک شرارہ سا پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے روئے مکاں تخلیق ہوتا چلا گیا۔ ایک پٹاخہ پھوٹا اور سموات نورانی دھوئیں سے بھر گئے۔ ایک سنہرا غبار حد امکان سے بھی آگے تک پھیل گیا۔ جس کا ہر ذرہ متحرک اور ہر لحظہ متغیر تھا۔ یہ فریادی کے لیے حسن کا پہلا ظہور تھا۔ یہ سماں دیکھا تو فریادی کی گھگھی بندھ گئی۔

★ "اے نور ازل!
اے نقش اٹل!
اے روح رواں!
دل ہے کہ وجود کل؟
ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے
اے ظہور پیہم [۱۰]
میرے حال پر نظر کر
مجھے اپنی توانائیوں میں سے توانائی دے
مجھے اپنے حسن میں سے حسن عطا کر"

نہ جانے کہاں سے وہی لافانی آواز نور خورشید کی طرح پھر پست و بلند پر چھا گئی۔

"عاشق صدق دل
تیری فریادوں کی خیر ہو
اٹھ!
کہ تیرے نالوں کی شنوائی کا وقت آ پہنچا
دیکھ کہ تیرا محبوب رخ روشن سے چلمن ہٹانے کو تیار ہے
دیکھ حسن بے پرواہ نے تقریب رونمائی کا اہتمام کیا ہے

آنکھیں کھول
دروازۂ دل وا کر
اپنے خول سے نکل
سامنے آ
کہ تجھے سینے سے لگایا جائے۔"

اور پھر یوں ہوا کہ یکا یک حسن کا ظہور پیہم شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک جلوہ، ایک کے بعد ایک درشن۔ کائنات کی لامتناہی حدود تک پھیلا ہوا نورانی دھواں، رقص عشق کے شوق میں مبتلا ہو کر گردش کرنے لگا اور گردش کرتے کرتے ایک گھومتے ہوئے بگولے کی صورت اختیار کر گیا، زمانے نے جنم لیا، صدیوں کی گنتی شروع ہوئی، بگولے کا دباؤ اپنے مرکز پر بڑھا تو دھماکے سے پھٹ [۱۱] گیا۔ حسن نے چہرہ کائنات سے نقاب الٹ دی۔ بگولے کے شرارے، انگارے اور شعلے باہر کی طرف بکھر گئے۔ کہکشائیں وجود میں آئیں۔ سورج نے آنکھ کھولی۔ فرزندان خورشید [۱۲] عطارد، زہرہ، زمین، مشتری، مریخ، زحل وغیرہ نے اپنے اپنے پیکر اپنائے۔ یہ حسن کا ظہور تھا۔ حسن نے اپنی بے نقابی کے لیے مادی منہاج چن لیے۔ گردش لیل و نہار کی نمود ہوئی۔ فریادی کے محبوب نے زمان و مکان کا روپ دھارا۔ فریادی جس کے نالے سن سن کر نور ازل نے اپنے چہرے کے نقاب الٹ دیئے۔ جس کی التجاؤں پر حقیقت سرمدیہ نے مجازی پیرہن پہن لیا۔ وہ فریادی جو عاشق صدق دل تھا، جو پروانہء جاں نثار تھا۔ حسن بے پرواہ کی بے حجابی کا نظارہ کرتا رہا۔

اور پھر یوں ہوا کہ فریادی کے مختصر ظرف، محدود نظر کو دیکھتے ہوئے حسن محیط نے کرۂ ارض پر ظہور کیا، فریادی کہیں قریب ہی موجود تھا۔ شاید ان بادلوں میں جنہوں نے کرۂ زمین کو اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا۔ ہاں! یہی تھی وہ روزن دیوار جہاں سے فریادی کی گھٹی گھٹی آواز بلند ہوتی تھی۔

"اے حسن ازل!
اے جمال آفرینش!
اے نور لازوال!
اے روح مجاز!

اے طلوعِ حقیقت!
مجھے دیکھ
کہ میں ابھی تک تیرے وصال کو ترستا ہوں
اے کاش!
میری بصارت محدود نہ ہوتی
اے حقیقت منتظر
مجھے میری سطح پر نظر آ
میرے وجود میں حلول کر
میرے ظرف میں سما
تیری تجلی میری مجال سے باہر اور حدود سے ماورا ہے
میری مجال اور حدود میں آ
کہ تجھے دیکھوں
تجھے پہچانوں"

فریادی کے نالے سموات کو چیرتے ہوئے نکل گئے۔ کہکشائیں لرز اٹھیں۔ گردش لیل و نہار میں تیزی آ گئی۔ مہ و انجم بوکھلا گئے۔ یہ کیسی آواز ہے؟ یہ کس کی فریاد ہے؟ یہ کون ہے جو حدود حسن سے ٹکرا رہا ہے؟ یہ کون ہے جو آنکھیں طلب کرتا ہے؟ یہ کون ہے جو دل مانگتا ہے یہ کون ہے جس نے حقیقت سرمدیہ کو دعوت نظارہ کا چیلنج دیا۔ ہاں! یہ وہی فریادی ہے جو ازل سے، لاکھوں صدیوں سے حسن کو دعوت بے حجابی دیتا چلا آ رہا ہے۔ فریادی کی چیخوں سے بادلوں میں بجلیاں سی تڑپ گئیں۔ فریادی کی روح بادلوں پر مقیم تھی۔ برق آسمانی سے شعلہ فشاں ہوئی۔ بادلوں کے بخارات میں زندگی کے مواد[۱۳] نے جنم لیا۔ برق آسمانی تڑپتی رہی۔ رعد و صاعقہ کوندتی رہیں اور یوں خدا خدا کر کے فریادی کی التجا مقبول ہوئی۔ بادل برسے، کرۂ زمین کا چہرہ دھل گیا۔ لاکھوں[۱۴] سال تک بارش ہوتی رہی اور کرۂ ارض کے دیو ہیکل گڑھے اس پانی سے بھرتے رہے۔ جس میں فریادی کی زندگی کا مواد تیار ہو چکا تھا۔

فریادی نے پیکر محسوس کی خلعت فاخرہ پہن لی۔ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ اس کا حسین

محبوب اپنے مجازی وجود کی رونمائی کے لیے بے قرار تھا۔ یہ کیسی بے قراری ہے؟ عاشق کے لیے معشوق کی بے قراری۔ زمین و آسمان گواہ ہو گئے۔ کائناتی قوتیں شاہد ہو گئیں۔ حسن کو بے تاب دیکھ کر سموات کے دل دھڑکنے لگے۔ وہی پرکشش سرسراہٹ سنائی دی جس کا ذائقہ سماعت کو باعث راحت تھا۔

"اے زمین و آسمان![۱۵]
گواہ ہو جاؤ
ہم نے فریادی کی دہائی سن لی
اپنے عاشق کے نالے گوش گزار کر لیے
ہم مشہود ہوا چاہتے ہیں
ہم کہ منتظر ہیں
ہم کہ حسن محیط ہیں
ہم نے آب و گل میں ظہور کیا
ہم فریادی میں ظہور چاہتے ہیں
ہم اپنے عاشق کے لیے بے قرار ہیں
اے کائناتی قوتو!
اے آسمانی فرشتو!
اے ملائکہ!
ہمارے چاہنے والے کو بلاؤ
اسے گہرے سمندروں[۱۶] سے نکال کر لے آؤ
کہ وہ ہمارا دیدار کرے
ہمیں دیکھے
ہم منبر محسوس پر جلوہ افروز ہو چکے
اسے کہو کہ آئے

ہمارا دیدار کرے"

سرسراتی ہوئی آواز ملائکہ کے کلیجے میں اتر گئی' کہکشائیں چونک اٹھیں' آسمان کانپ گئے' یہ کیا ہونے والا ہے' یہ کون آنے والا ہے' حسن کی یہ بے قراریاں کیسی ہیں' یہ کس کا ظہور ہے' سارے گونگے بہرے دیوتا بول (۱۷) اٹھے۔

"اے روح عالم!

اے تغیر پیہم!

اے حسن بسیط!

ہم کہ تیرا (۱۸) نور ہیں

ہم کہ تیرا ظہور ہیں

ہم کیوں تیرے شوق بے حجابی کے لیے ناکافی ہوگئے

اے ثبات دائم!

اے وجود مکمل!

ہم "جو سر تسلیم (۱۹) " کے عادی ہیں

ہم جو تیرے وجود کا مجازی پیکر ہیں

کیوں! تیری تمنا پر پورے نہ اترے؟"

ارض و سماء کا اظہار احتجاج درد انگیز تھا' مہ و انجم کی فغاں دل افروز تھی اور پھر وہی سرسراہٹ' جیسے کائنات کی سانس میں اللہ بولتا ہے۔روح عالم پر اوس کی طرح اترتی چلی گئی۔

"ہمارے "پروردوں" کا احتجاج بے جا ہے

سمٰوات کی فریاد بے معنی ہے

اے جہان مجاز کے اجالو!

اے مکان فانی کے باسیو!

اے زمان ناقص کے اسیرو!

یاد رکھو!

ہم نے کارگہ ہستی میں اپنے سودائی کے لیے ظہور کیا

ہم نے اپنے چہرۂ روشن سے اپنے عاشق کے لیے نقاب الٹی

ہم فریادی کی دہائی پر بے حجاب ہوئے

اے پست و بلند کے مکینو!

جان لو!

ہم فریادی کے محبوب ہیں"

اور پھر یوں ہوا کہ حسن کی یہ ادا دیکھ کر فریادی تڑپ اٹھا۔وہ جو سمندروں میں آب و گل (۲۰) کی مشہود خلعت پہن رہا تھا۔اپنے محبوب کی بے قراری دیکھ کر وجد میں آ گیا۔ایسا وجد کہ جیسے بے جان پانیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو۔اب عاشق' شب وصل کے لیے تیار (۲۱) ہو رہا تھا۔ حجرۂ محبوب میں سج دھج (۲۲) کر جانا چاہتا تھا...... ہائے! یہ لگن' ہائے! یہ بے تابیاں' ہائے! یہ جستجو۔وہ جو عجلت میں گہرے پانیوں سے نکل (۲۳) آیا تھا' بولا! "کہاں ہے میرا محبوب!" وہ پروانے کی طرح بے تاب چراغ روشن کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔اس نے ایک سے ایک لباس بدلا۔ایک سے ایک روپ' ایک سے ایک حلیہ اپنایا' ایک سے ایک بھیس' نئے نئے پیکر ڈھالے' رنگ رنگ کے پیراہن بدلے' طرح طرح کے اطوار (۲۴) اختیار کیے۔اسے کسی کل چین نہ آیا۔ کسی پل سکون نہ ملا۔وہ بے تاب تھا۔اسے جلدی تھی وصال کی جلدی' ملاقات کی عجلت۔ہائے! یہ خارزار عشق۔ہائے! یہ دشت جنوں۔ہائے! یہ وجدان۔اس کی یہ سیماب صفتی' یہ بے قراری' یہ عشق' یہ جنون ہر منزل (۲۵) پہ بڑھتا چلا گیا۔وہ زمین کی پستی سے اٹھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔آسمان کا کلیجہ کانپ گیا' زمین سہم گئی' یہ کون ہے؟ جو ایک زندہ و جاوید حقیقت کی طرح دھرتی کے سینے پر دندناتا ہوا چل رہا ہے۔کہکشائیں متحیر تھیں۔شمس و قمر خوفزدہ تھے۔افلاک کی وسعتیں لرزہ براندام تھیں۔سمندروں کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے' زمین کی طنابیں تن گئیں' یہ کس کی دہشت ہے' یہ کس کا طنطنہ ہے' سموات گھبرا کر پکار اٹھے۔

"اے وجود مستقل!

اے صداقت لازوال!

اے ظہور دائم!

الامان! الامان!

الحفیظ! الحفیظ!

اے حقیقت لطیف!

تیرا فریادی ہمیں پابند سلاسل کیے جاتا ہے۔"

صدا آئی

"اے کائنات کی تو تو!

اے عزرائیل و اسرافیل کا لشکر جرار!

اے میکائیل و جبریلؑ کی فوج ظفر موج!

اے کارگہء عالم!

جان لو!

کہ حسن مقتدر کا یہ فیصلہ ہے

جمال متین کی یہ مرضی ہے

کہ ارض و سموات کی بلندیاں اور پستیاں

فریادی کے حضور سر بسجود (۲۶) ہو جائیں

یہ کسی کی حق تلفی نہیں

انعام عشق ہے

ثمر جنون ہے۔"

حسن بے پرواہ کی وضاحت سن کر نوری خاموش ہو گئے۔ کائنات کی فضائے بسیط نے چپ سادھ لی۔ زمین و آسمان مستعد ہو گئے۔ دشت و بیاباں چونک اٹھے۔ یہ کس کی آمد ہے؟ یہ کس کا انتظار ہے؟ یہ کون ہے جسے انعام عشق عطا ہوا؟ جسے ثمر جنون بخشا گیا۔ گل و گلزار نے رستے سجا دیے۔ پہاڑ دست بستہ کھڑے ہو گئے، سبزۂ زار فرش راہ بن گئے، آفتاب نے دیدۂ دل وا کیا، کہکشاؤں نے شامیانے تان لیے، ستاروں کے قمقمے جل اٹھے، دریاؤں نے دست اطاعت دراز کیا، چٹانوں نے سر تسلیم خم کیا، سمندروں نے موتی اگل دیے، درختوں نے حلف وفاداری اٹھایا، پرندوں نے خوشامدانہ گیت گائے، جانوروں نے اقرار وفا باندھا، پستیوں نے قدم چومے، بلندیوں

نے سر جھکایا، ہواؤں نے منہ میں لگامیں ڈال لیں، پہاڑوں نے انتساب لکھنا شروع کیے، موجیں حمد و ثنا گاتی ہوئی محو رقص تھیں، آبشاریں تسبیح خوانی کرتی ہوئی اتر آئیں، مہتاب نے استقبال کی تیاریاں کیں، شبنم نے پتے پتے کو غسل دیا۔ یہ کس کے استقبال کی تیاریاں ہیں، یہ کس کے آنے کا جشن ہے؟ کیا یہ وہی دیوانہ تو نہیں جو "حسن مکمل" کا عاشق ہے۔ یہ وہی فریادی تو نہیں جس کی آہ و فغاں کا اثر روح کائنات میں موجود ہے۔ جس کا خون سموات کی رگوں میں موجزن ہے۔ جس کے حضور عالم ہست و بود سر بسجود ہوا۔ ہاں! یہ وہی فریادی ہے۔ حسن کا دیوانہ، عاشق صدق دل، جبرائیل پیام الفت لے جانے کے لیے تیار تھا کہ ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ یکا یک حسن بسیط کی سرسراتی ہوئی آواز پتے پتے کی رگوں میں اتر گئی۔

"اے عاشق صدق دل!

تیری بے قراری بجا

تیری آہ و زاری درست

یاد کر تو ایک قدم بڑھا تھا

تو ہم دس قدم بڑھے تھے

تو نے جو طلب کیا ہم نے عطا کیا

لیکن ذرا رک

اے عجلت باز سودائی!

اے جلد باز دیوانے!

ایک لمحے کو ٹھہر

اور حسن لازوال کی تنبیہ سن

تیرا سفر دشت جنوں میں جس رخ پر ہے

اس طرف کوئی نخلستان نہیں

اس دشت کے ذرات دہکتے ہوئے سونے کی طرح گرم اور راستے مسدود ہیں

اس دشت کے سراب بے رحم اور سفاک ہیں

یہ گلزارِ مجازی نہیں، خارزارِ حقیقت ہے
منزلیں کٹھن، راستے دشوار
یہیں سے لوٹ جانا چاہتا ہے تو لوٹ جا
اگر تو نے آگہی کا پھل (۲۷) کھالیا تو یاد رکھ
تیرے ہاتھ میں حسن مقتدر کا اختیار
اور پیر میں خوابِ ضرورت کی زنجیر آ جائے گی''

ہمت ہے تو آگے بڑھ اور حسن لطیف کے چہرۂ اختیار سے نقاب الٹ دے۔''

لیکن وہ تو دیوانہ تھا، عاشق تھا، بے جھجکے صحرائے عشق میں اتر گیا۔ اس نے آگہی کا پھل کھا لیا۔ ابھی چشمِ شعور وا نہ ہوئی تھی کہ کائنات میں فرشتوں کا گیت گونج اٹھا۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اور پھر یوں ہوا کہ فریادی کو آنکھیں عطا ہو گئیں، دل دے دیا گیا۔ فریادی کے وجود میں حسن بسیط نے ظہور کیا اور حسن لازوال نے فریادی کو انوکھے خطاب سے نوازا۔ ''انسان'' خلقاً آخر۔ اب وہ فریادی نہیں ''آدم'' تھا۔ حقیقت سرمدیہ کی روح اس کے سینے میں اتری تو خطا کھا گیا۔ خود کو حقیقت کل سمجھ بیٹھا۔ ایسا بیگانہ ہوا کہ اپنی ازلی فریاد بھی بھول گیا۔ وہی گھٹی گھٹی آواز کہ

''اے نورِ ازل!
اے حسنِ محیط!
مجھے آنکھیں عطا کر کہ تجھے دیکھوں
دل بخش دے کہ تجھے پہچانوں
اے میرے محبوب!
مجھے میری سطح پر نظر آ
مجھے دکھائی دے''

اب فریادی کی آواز کہیں سنائی نہ دے رہی تھی۔ وہ کہاں گیا؟ حسن کا دیوانہ، حسن خود کو بے نقاب کیے موجود ہے۔

اے پڑھنے والے! جان لے کہ یہ افسانہ نامکمل ہے۔ فریادی کا محبوب اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن اس کا پرستار کہیں کھو گیا ہے۔ وہ جلد باز بے صبرا فریادی کہیں گم ہو گیا ہے۔

ہم اپنے آپ کو اک دوسرے میں دیکھ لیتے تھے
کہ میرا آئینہ تم اور تمہارا آئینہ میں تھا

میں جب سارا زمانہ دیکھ کر پہنچا ترے در پر
تو میرے سامنے بیٹھا تھا جو وہ تو نہ تھا میں تھا

(آصف آس)

نینڈرتھل کا دورِ حکومت

انسان کی پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ مذاہب نے ابتدائی ضروریات کے پیشِ نظر حقائق کو بدلنے کی کوشش کی اور مخصوص تخلیق (Special Creation) کا طریقہ اپنایا۔ حالانکہ ''وحی'' کی کتابوں میں ارتقائے حیات کا نظریہ اب بھی موجود ہے۔ مخصوص تخلیق کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دنوں میں بنایا اور انسان سب سے آخر میں آیا۔ اس نظریے کے مطابق قدیم سے یہ خیال چلا آ رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز جس حالت میں ہے اسی حالت میں یکے بعد دیگرے یک لخت تخلیق کی گئی اور چھ دنوں میں انسان سمیت پوری کائنات تخلیق کرنے کے بعد ساتویں دن خدا نے آرام کیا۔ بائبل میں ہے:

''سو آسمان اور زمین اور ان کے لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن ختم کیا اور فارغ ہوا (۲۸)۔''

مذاہب کا یہ تحریف شدہ نظریہ دیر تک علماء میں زیر بحث رہا۔ گزشتہ صدی تک ''لیناکس''، ''کوویئر''، ''اگاسز'' اروِن جیسے سائنس دانوں سمیت دنیا کی اکثریت اسی نظریے کی قائل تھی۔ اس نظریے کے مطابق انسان کو مٹی کے ایک مجسمے کی شکل میں تعمیر کیا گیا اور جس میں خالق کائنات نے

اپنی روح پھونکی تو وہ زندہ ہو گیا۔ لیکن اب آ کے اہل علم و دانش نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا سمندر کے پانی (۲۹) اور ساحلوں کے کیچڑ (۳۰) اور گارے سے ہوئی اور پھر زندگی بتدریج کئی منازل (۳۱) طے کرتی ہوئی شرف انسانیت تک پہنچی۔ بعض یونانی فلاسفر انیکسی مانڈر۔ ایم پی ڈوسل اور ارسطو ارتقاء میں کسی حد تک یقین رکھتے تھے۔ لیکن مسلمان مفکرین ابن باجہ، ابونصر الفارابی اور ابن مسکویہ نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ مسلمان حکماء علم کیمیا کے موجد ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ نباتات، حیوانات اور انسانوں میں زندگی کے بنیادی عناصر ایک سے ہیں تو انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ یقیناً زندگی ایک ہی سلسلے کا نام ہے جو مختلف منزلوں پر پڑاؤ کرتی اور اپنے نشان چھوڑتی بتدریج بڑھتی ہوئی انسان تک پہنچی ہے۔ مسلمان صوفیاء میں مولانا روم جنہیں علامہ اقبال اپنا پیر کہتے ہیں۔ نظریہ ارتقاء کے قائل تھے۔ مثنوی میں مولانا روم کے یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں۔

آمدم اول بہ اقلیم جماد
وز جمادے در نباتے اوفتاد
وز نباتے چوں بہ حیواں اوفتاد
نادرش حالے نباتے ہیچ یاد

مثنوی میں مولانا روم کے یہ اشعار بھی درج ہیں۔

از جمادی مردم و نامی شدم
وزنماں مردم بحیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمردن کم شوم
حملہء دیگر بمیرم از بشر
پس بر آرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک براں شوم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون
گویدم کا نا الیہ راجعون

اب تو نظریہ ارتقاء خاصا مقبول ہو چکا ہے اور پاکستان سمیت دنیا بھر میں بچوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو نظریہ ارتقاء سے واقف نہیں فی زمانہ تو وہ بھی آدم کے مٹی کا پتلا بنائے جانے والے نظریے کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ دراصل جدید سائنسی علوم نے اس قدر تیزی سے دنیا کے سامنے کائناتی حقائق پیش کیے ہیں کہ ماضی والوں کے بہت سے باطل عقائد خود بخود ہی سوئے عدم چل پڑے ہیں۔ لیکن دنیا کی ناخواندہ آبادی تخلیق آدم کے بارے میں ابھی تک اسی مخصوص تخلیق کے نظریے پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ انسان کے لیے نظریہ ارتقا اجنبی نہیں رہا بے جا نہ ہوگا اور یہ حقیقت کہ انسان زمین کا موسم معتدل ہونے کے بعد قدرت کے ایک زندہ و جاوید نظام کے تحت بتدریج دھیرے دھیرے پیدا ہوا۔ روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ البتہ ماضی میں علماء فلسفہ اور سائنس دانوں کے درمیان نظریہ ارتقاء پر زوردار بحث رہی ہے۔ مخصوص تخلیق کے نظریہ کے حامل علماء اور مذہبی پیشوا ایک وزنی دلیل یہ دیا کرتے تھے کہ دیر تک پڑے رہنے والے گوشت میں سنڈیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اٹلی کے ایک مشہور ڈاکٹر ''فرانسسکو ریڈی'' نے گوشت پر مختلف تجربات کر کے یہ ثابت کیا کہ جب تک گوشت پر مکھیاں نہ بیٹھیں، سنڈیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ فرانس کے ایک سائنس دان ''ڈی لی مارک'' نے گہرے غور و فکر اور مشاہدات کے بعد یہ اعلان کیا کہ ''جسم کا وہ عضو جو متواتر استعمال ہوتا رہے۔ نشوونما اور ترقی پا جاتا ہے۔ جبکہ وہ عضو جس کا استعمال نہ کیا جائے سکڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل سینکڑوں سالوں میں رفتہ رفتہ رو پذیر ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے اگلی نسلوں میں مفقود ہونے والا عضو پیدا ہی نہیں ہوتا۔'' اس نے مفروضہ قائم کیا کہ بطخ نے پانی میں متواتر پیر چلائے اور سینکڑوں سال بعد اس کی انگلیوں کے درمیان جھلی پیدا ہو گئی۔

ان سب سائنس دانوں نے اپنی اپنی کوششوں کے نتائج پیش کیے۔ لیکن آخر میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء بہت مقبول ہوا۔

ارتقائی مراحل پر ایک نظر

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین کا کرہ سورج سے الگ ہونے کے بعد جب ٹھنڈا ہو کر شعلے سے ایک ٹھوس شکل اختیار کر گیا تو زمین کے گرد موجود بادلوں میں ابتدائی چھ مرکبات پیدا ہوئے۔ جنہیں پانی (H_2O)' امونیا (NH_3)' میتھین (CH_4)' کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2)' ہائیڈروجن سی اے نائیڈ (HCN) اور ہائیڈروجن مالیکیول (H_2) کہا جاتا ہے۔
کرۂ ارض مزید ٹھنڈا ہوا تو بادلوں سے بارش برسنے لگی جو صدیوں تک جاری رہی جس میں یہ چھ مرکبات بہہ کر سمندروں کے پانی میں چلے آئے۔ سمندروں میں مزید کیمیائی مادے موجود تھے۔ جن میں مٹی' لاوا' کیچڑ (۳۲) اور دیگر معدنیات کے ساتھ ان چھ مرکبات نے کیمیائی تعاملات کیے۔ ان کیمیائی تعاملات کے نتیجے میں مزید پانچ مرکبات پیدا ہوئے جنہیں شوگرز' گلیسریز' چربیلے تیزاب' امائینو ایسڈز اور نائیٹروجن کے مرکبات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ مرکبات جب آپس میں ملے تو ابتدائی آرگینک (Organic) مرکبات وجود میں آئے۔ جنہیں ایڈی نوسین فاسفیٹس' پالی سیکرائیڈز' روغنیات' لحمیات اور نیوکلک ایسڈ کے نام دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیمیائی تعاملات کا یہ کھیل ایک دلچسپ مرحلے میں داخل ہوا یعنی ابتدائی زندہ خلیہ (Cell) پیدا ہوا۔ ابتدائی زندہ خلیات جن میں پروٹوزوا اور پروٹسٹا اولین دور کے ابتدائی خلیات ہیں۔ زمین کے پہلے زندہ اجسام شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ ابتدائی خلیات جو اپنی نسل بڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لاکھوں سال کے طویل پراسیس کے بعد وجود میں آئے۔ یہی خلیے پودوں' پرندوں' جانوروں اور حشرات الارض کے آباء تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ خلیے ہزاروں لاکھوں سال مزید کیمیائی تعاملات اور حیاتیاتی تجربات سے گزرتے رہے۔ زمین پر نباتات کے ساتھ ساتھ سمندر میں بغیر ہڈی کی جونک نما مچھلی پیدا ہونے تک مزید لاکھوں سال گزر گئے۔ سمندری مخلوقات وقفے وقفے سے خشکی پر آتی اور جاتی رہیں۔ بعض جانوروں نے طویل مدت کے بعد خشکی کی زندگی اختیار کر لی۔ خشکی کے ابتدائی خزندے جو پرندوں اور جانوروں کے آبا ہیں۔ انڈے دینے والے حیوانات تھے۔ ان خزندوں نے لاکھوں سال تک زمین پر حکومت کی اور ان میں بڑے بڑے دیوہیکل جانور پیدا ہوئے۔ جیسے ڈائنوسارس اور برانٹو سارس وغیرہ جو انتہائی قد آور جانور ہونے کے باوجود اپنی

افزائش نسل انڈوں کے ذریعے کرتے تھے۔
زمین کے ماحول میں تبدیلیاں ہوئیں۔ نئے پہاڑ نمودار ہونا شروع ہوئے۔ موسم بدلتا چلا گیا۔ بارشیں کم ہوئیں اور جنگلات جھلس کر ختم ہوتے گئے۔ بڑے بڑے جانور مفقود ہوئے اور دودھ دینے والے جانوروں نے جنم لیا۔ دودھ دینے والے ابتدائی جانور درختوں پر رہتے تھے۔ جن میں ''اودھ بلاؤ''، ''شجری شریو'' اور ''بندر'' وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وہ دور تھا جب زمین کے ذہین ترین جانور ''بن مانس'' اور ''ہومی نائیڈس'' ہوا کرتے تھے۔ ان جانوروں نے لاکھوں سال زمین پر گزارے اور مختلف ماحول' موسم اور آپس میں جنسی تعامل کے نتیجے میں انسان نما نسلوں کا آغاز ہوا۔

انسان نما نسلیں

سائنس دانوں کو جنگلوں' دریاؤں اور پہاڑوں سے ابتدائی انسانی نسلوں کے جو فاسلز (۳۳) ملے ہیں۔ ان میں ''پروکانسل''، ''اور یو پیتھکس''، ''زنجینو تھروپس''، ''ہوموہیبی لس''، ''آسٹریلو پیتھی کس''، ''پتھو کینتھروپس''، ''ہائیڈل برگ مین'' اور ''نینڈرتھل'' کے فاسلز قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام نسلیں زمین پر آج سے دو کروڑ پچاس لاکھ سال پہلے کے زمانے سے لے کر آج سے پندرہ بیس ہزار سال پہلے کے زمانے تک یکے بعد دیگرے پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ''پروکانسل'' سب سے پرانی نسل ہے جو دو پاؤں پر سیدھا کھڑا ہونے والا جانور تھا۔ جس کی دم نہیں تھی۔ ''زنجینو تھروپس'' بھی لاکھوں سال پہلے زمین پر موجود تھا اور یہ شکار کے لیے اوزار استعمال کرتا تھا۔ ایک اور اوزار استعمال کرنے والا اور دو پاؤں پر چلنے والا جانور ''ہوموہیبی لس'' تھا۔ جو آج سے دس لاکھ سال پہلے زمین کی بہاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اسی دور میں ''آسٹریلو پتھی کس'' نامی دو پاؤں پہ چلنے والا اور اوزار استعمال کرنے والا جانور زمین پر حکومت کرتا رہا۔ ''پتھو کینتھروپس'' زمین کی وہ پہلی مخلوق ہے جسے مکمل پیکن مین (سیدھا آدمی) کہا جاتا ہے۔ یہ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے زمین کے سینے پر دندناتا تھا۔ یہ پہلا انسان ہے جو آگ استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے فاسلز کے ساتھ جما ہوا دھواں بھی پایا گیا ہے۔ یہ غاروں میں رہنے والا انسان تھا۔ شکار کا گوشت

اس کی خوراک تھی اور جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرنا اس کی فطرت- اس نے زمین کی خوبصورتیوں، پھلوں اور پانی کی نہروں سے کئی لاکھ سال تک خوب فائدہ اٹھایا- اس کے بعد زمین کی زمام اقتدار "نینڈرتھل" کے ہاتھ آئی- تاریخ سے پہلے جتنے انسانوں کی دریافت ہوئی ہے- ان میں نینڈرتھل ہی وہ انسان ہے جسے باقاعدہ انسان کہا جا سکتا ہے- نینڈرتھل آج سے ڈیڑھ لاکھ سال پہلے صفحۂ زمین پر نمودار ہوا اور آج سے پچیس ہزار سال پہلے تک زمین پر انتہائی خوبصورت زندگی گزارتا رہا- نینڈرتھل غاروں میں رہتا تھا- بڑا مشاق شکاری تھا- قسم قسم کے اعلیٰ ہتھیار، اوزار، شکاری کلہاڑیاں، ڈنڈے اور گھریلو سامان بناتا تھا- گوشت خور ہونے کی وجہ سے جناتی (۳۴) صفات کا مالک تھا- پرندوں اور جانوروں کی آوازوں کی مدد سے اپنے لیے اشیاء کے نام تجویز کرتا اور ٹوٹی پھوٹی زبان استعمال کرتا تھا- جنوب مغربی فرانس کی ایک وادی سے ان کا جو ریکارڈ ملا ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رجحان ابتدائی مذہب کی طرف پایا جاتا تھا-

"نینڈرتھل" جسمانی ساخت کے لحاظ سے موجودہ انسان جیسا تھا- البتہ اس کے دماغ کی رگوں کی ساخت موجودہ انسان سے کم پیچیدہ تھی- یہ جس زمانے میں زمین پر رہا اس وقت زمین سبزے سے ڈھکی ہوئی اور شفاف پانی کی نہروں سے سجی ہوئی تھی- ہر طرف درختوں کے پھل وافر مقدار میں تھے اور زمین کا ماحول انتہائی پاکیزہ اور صاف ستھرا تھا- نینڈرتھل نے سوا لاکھ سال تک زمین پر زندگی بسر کی- یہ خاندانوں کی صورت میں رہتا اور اپنے بچوں کو بڑا ہونے تک اپنے ساتھ رکھتا تھا- سوا لاکھ سال تک زمین کی بہاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد آج سے تقریباً پچیس ہزار سال پہلے نینڈرتھل دھیرے دھیرے نابود ہوا یا یوں کہہ لیا جائے کہ اس کی نسل ترقی پا کر ماڈرن مین یعنی موجودہ دور کے آدمی کی صورت اختیار کر گئی- ماڈرن مین جسے سائنسدان "کومب مین" بھی کہتے ہیں- لگ بھگ اسی زمانہ میں زمین پر نمودار ہوا- پہاڑوں کی برف پگھلنا شروع ہوئی تو نینڈرتھل کے لیے غاروں میں رہنا مشکل ہو گیا اور اس نے ہزاروں سال میں بتدریج میدانی زندگی اختیار کرنے کا آغاز کیا- اس میدانی زندگی میں موجودہ دور کے آدمی نے آنکھ کھولی اور یوں کروڑوں سال کے طویل مراحل کے بعد زمین پر احسن (۳۵) تقویم کا ظہور ہوا، یہ انسان تھا- اشرف المخلوقات نے جنت کی پربہار زندگی سے نکال کر معاشرے کی پرمشقت زندگی میں اس لیے پھینک دیا گیا کہ اس نے شعور کا وہ میٹھا پھل چکھ لیا تھا جس کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد انسان

میں نیکی اور بدی کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے-

"خلیفۃ اللہ فی الارض"

شعور کا تحفہ ملنے کے بعد انسان دوسرے جانوروں سے یکسر مختلف ہو گیا- اب اس کے سامنے بڑی وسیع دنیا تھی- اب اسے اس ہدایت کی طلب نہ تھی جو دوسرے جانوروں کی سرشت میں رکھ دی گئی ہے (۳۶)- وہ ہدایت جو پرندے کو اڑنا سکھاتی ہے، بطخ کو تیرنا، شہد کی مکھی کو زندگی بخش اکسیر بنانے کا نسخہ (۳۷) بتاتی ہے اور رینگتے ہوئے کیڑے کو ریشم بنا- وہ اب اپنی ذات کے بھروسے پر جینا چاہتا تھا- وہ کائنات کا اکلوتا ذی روح تھا- جس میں "حسن" کو پہچاننے کی صلاحیت تھی- اب اس کی ہدایت اس کے اپنے ہاتھ میں (۳۸) تھی- وہ چاہتا تو کائنات کی ہر ایک قوت کو اپنا تابع فرمان (۳۹) بنا کر حسن بسیط کے عظیم الشان ارتقائی پروگرام کو نہایت تیزی سے آگے بڑھاتا- کیونکہ اب وہ قادر کے منصوبوں میں خلل اندازی کی قدرت رکھتا تھا اور اگر چاہتا تو ان بے زبان قوتوں کو دیوی دیوتا مان کر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا- کیونکہ اس کی جلد باز طبیعت اسے مفاد عاجلہ (عارضی فائدہ) کی طرف جھکنا سکھا سکتی تھی- یہ تھا وہ انسان جس کے کان (۴۰) آواز کا مفہوم سمجھنے کے قابل تھے- جس کی آنکھیں (۴۱) سیاہ و سفید کا فرق پہچانتی تھیں- جس کا دماغ (۴۲) منصوبہ سازی کی قدرت رکھتا تھا- اب اس کی ذات میں حقیقت سرمدیہ کا ظہور (۴۳) ہو چکا تھا- اب وہ بذات خود خدائی صفات کا مظہر تھا- اب وہ قادر بھی تھا اور خالق بھی- جبار بھی تھا اور قہار بھی، قدوس بھی تھا اور غفار بھی، رزاق بھی تھا اور ستار بھی، معبود بھی تھا اور مسجود بھی- اب تمام نوری مخلوقات جو اس کی آمد سے پہلے حسن کی پرستار (۴۴) تھیں- اس کے حضور سجدہ ریز ہو چکی تھیں- وہ مسجود ملائک ہوا تو اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں- اس کے ہاتھوں میں زمانے کی زمام اقتدار تھما دی گئی اور اسے کائنات کا مختار (۴۵) بنا دیا گیا- یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی- وہ ذمہ داری جسے اٹھانے کی ہمت کائنات کی کسی قوت کے بس میں نہ تھی- اسے انسان (۴۶) نے اٹھا لیا- اب وہ زمین پر خدا کا نائب تھا- اسے خلیفۃ اللہ فی الارض کا خطاب عطا ہوا اور تکمیل کائنات کی کٹھن ذمہ داری سونپ دی گئی- ہاں! یہی وہ انسان تھا جسے عالم ارواح میں

حقیقت مطلقہ نے مخاطب کیا- الست بربکم؟ تو اس نے جواب دیا قالوا بلٰی-
ہاں! یہ وہی انسان تھا جسے دیدار محبوب کی جلدی تھی اور جس نے اپنی سچی لگن کے دوران جو کچھ مانگا بارگاہ حسن سے اسے عطا ہوا- اسے شعور کی تمنا ہوئی تو خالق کائنات نے اسے شعور کی وجہ سے پیش آمدہ مشکلات کی طرف متوجہ کیا- گویا اسے خبردار کیا- ولا تقربا ھذہ الشجرۃ لیکن انسان کی طلب کچھ اور بڑھ گئی اور پھر جب اسے شعور عطا ہوا تو اس سے خودکار ہدایت کی دولت چھن گئی- اب وہ کروبیاں کی طرح تسبیح خواں نہیں تھا- اب اسے عمل کی (۴۷) تسبیح کرنی تھی- لیکن یہاں ایک تکلیف دہ معاملہ یہ ہوا کہ عمل کی اس راہ میں اس کے مدمقابل ابلیس آ کھڑا ہوا-

ابلیس کی دشمنی

اس کے راستے میں بڑے بڑے پہاڑ آئے- لیکن دم دبا کر بھاگ گئے- اس کی آتش شوق کو وسیع سمندر بھی نہ بجھا سکے- زلزلے اور طوفان اس کے پاؤں کی ٹھوکر پر رہے- لیکن اس کے راستے میں جو قوت حائل ہوگئی- وہ بظاہر ایک معمولی بھڑکتا ہوا شعلہ تھا- جو اس کے اپنے وجود میں بھڑک رہا تھا- لیکن ایسا ظالم شعلہ تھا کہ اس کے اعمال کی کھیتیوں کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتا تھا- ہاں! یہ ابلیس تھا‘ شیطان- ایک ایسی سرکش قوت جو اس کے حضور سجدہ ریز (۴۸) نہ ہو سکی- لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کائنات کی ہر قوت حسن بسیط کا ظہور ہے تو پھر ابلیس کی تخلیق جو خدا کا دشمن ہے کیا معنی رکھتی ہے- کیا ابلیس خالق کائنات کے مدمقابل برابری کی سطح کا دشمن ہے؟ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت مشکوک ہو جاتی ہے اور اگر برابر سطح کی دشمن قوت نہیں تو پھر یقیناً مخلوق ہے اور یہی سوال الجھا دینے والا ہے کہ اپنا ہی دشمن خود پیدا کرنا کہاں کی عقل مندی ہے- لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اجالا اس وقت تک اجالے کے طور پر پہچانا نہیں جا سکتا جب تک اس کے مقابل اندھیرے کو نہ لایا جائے- دھوپ دھوپ نہیں رہتی اگر سایہ نہ ہو- زندگی زندگی نہیں رہتی اگر موت نہ ہو- حسن کو اپنی پہچان کرانے کے لیے بدصورتی کی ضرورت تھی- تاکہ نور کو اندھیروں سے ممتاز دیکھا جا سکے- تاکہ حسن کو قبح کے مدمقابل پہچانا جا سکے اور پھر ابلیس کی حیثیت ہی کیا ہے- زمین پہ بسنے والے چند انسانوں کو گمراہ کرنے والا اور بدصورتیوں کی طرف کھینچنے والا ایک معمولی ہرکارہ جو اتنی

بڑی کائنات کے مالک کل کے حضور ریت کے صحرا میں ایک ذرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا- گویا قباحت کی یہ تخلیق محض انسان کے لیے حسن کو پرکھنے والے ترازو کے دوسرے پلڑے کی حیثیت سے کی گئی- انسان کو بتا دیا گیا کہ ابلیس اس کا دشمن ہے جو اس کے نفس میں چھپ کر بیٹھا ہے اور رہ رہ کر خطرناک حملے کرتا ہے- آگے سے‘ پیچھے سے‘ دائیں سے‘ بائیں سے (۴۹)- غرض وہ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے (۵۰) ڈالتا ہے اور اسے قائل کرتا ہے کہ وہ حسن جس کی تلاش اور جس سے وصال کی آرزو انسان کی ازلی خواہش اور ضرورت ہے‘ محدود مادی اشیاء میں موجود ہے- وہ انسان کو حقیقت سرمدیہ تک پہنچنے سے روکتا اور گمراہ کرتا ہے اور انسان کے راستے میں تکلیف دہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے- انسان جس پر لازم ہے کہ وہ اسے لعنت‘ ملامت کرتا اور کنکر مارتا ہوا گزر جائے بہت جلد بھٹک جاتا ہے- ہاں انسان بھٹک جاتا ہے- وہ بھول جاتا ہے کہ اس کا مقصد زندگی اس کی تگ و دو وصال محبوب کے لیے ہے- وہ بھول جاتا ہے کہ اسے حسن محیط کی قربت حسین کاموں سے حاصل ہو سکتی ہے- واقعی یہ ابلیس گمراہ کرنے والا اور یہ شیطان مقصد اصلی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے والا ہے-

انسان بحیثیت وارث کائنات

یہ انسان ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا نائب بنایا- زمین پر انسان کی تخلیق کا مقصد نیابت الٰہی ہے- قرآن نے کہا:

واذا قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفہ

ترجمہ: میں زمین پر خلیفہ بنانے لگا ہوں-

اور قرآن نے یہ بھی کہا:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو ”بندگی“ کے لیے پیدا کیا-

یہ بندگی کیا ہے؟ یعنی عبدیت کیا ہے؟ یہ بندگی امانت داری کی صلاحیت ہے- جیسے کسی آقا کا ایک بندہ یعنی غلام اس کی تمام اشیاء کا نگران اور محافظ ہوتا ہے ویسے ہی اس آقا اور مالک کی

پوری کائنات انسان کے ہاتھوں میں ایک قیمتی امانت ہے۔ کیونکہ اس اللہ نے جو مالک الملک ہے انسان کو اپنی نیابت مرحمت فرمائی۔ اسے اپنی کائنات کا امین ٹھہرایا اور اسے ہدایت کی کہ

تؤدّ الامانات الیٰ اھلھا

ترجمہ: یعنی امانتیں ان کے پاس لوٹا دو جن کی ہیں۔

اور یوں ارض و سموات انسان کے تصرف اور اختیار میں دینے کے بعد مالک حقیقی نے اسے قیام توازن کی نصیحت بھی کر دی۔ تاکہ اس کے اعمال و افعال میں توازن ہو۔ کیونکہ توازن حسن ہے اور حسن حقیقت مطلقہ۔

ان تصریحات کی رو سے انسان وارث کائنات بھی ہوا اور قادر مطلق کے منصوبوں میں خلل انداز بھی۔ علامہ اقبال کی ''پیام مشرق'' میں جب پروردگار انسانوں سے یہ کہتا ہے۔

من از خاک پولاد ناب آفریدم
تو شمشیرو تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی خیال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

تو انسان جس میں خالق کائنات کی روح بولتی ہے اور جو ارض و سموات کے پروگراموں میں خلل انداز ہوتا ہے۔ یوں بولا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

مالک کائنات نے کہا' میں نے خالص فولاد پیدا کیا اور اے کوتاہ بخت انسان! تو نے اس فولاد سے شمشیر' تیر اور توپ بنا ڈالی تاکہ تو لڑے اور فساد کرے۔ اے انسان تو نے لوہے کا پنجرہ بنایا تاکہ تو میٹھی بولیاں بولتے پرندوں کو اسیر کرے۔ لیکن انسان نے جواب دیا' اے مالک کل! تو نے رات بنائی میں نے چراغ بنایا۔ تو نے مٹی بنائی میں نے پیالہ بنایا۔ تو نے بیابان' خشک پہاڑ اور صحرا

بنائے میں نے خیابان' گلزار اور باغ بنائے۔

ہاں! یہ ہے وہ انسان جو قادر کے پروگراموں میں اپنے شوق سے شریک ہوتا ہے اور محدود سطح پر رہتے ہوئے آب و گل کے اس جہان میں خدائی منصوبہ بندی کی تکمیل کرتا ہے۔ پہلے ارتقائی مراحل لاکھوں سال میں طے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب انسان بہت قلیل وقت میں حسن کی عظیم الشان تخلیق کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ گویا اس میں صلاحیت ہے کہ کائنات کے طویل ارتقائی مراحل میں مصنوعی تیزی پیدا کر دے۔ کائنات کے حسن میں مزید اضافہ کرے۔ تاکہ اسے جلد از جلد حقیقت سرمدیہ کا دیدار نصیب ہو جو اس کی زندگی کا مقصد اصلی [۵۱] ہے۔ اب وہ تقدیر کا پابند نہیں' بلکہ تقدیر اس کے تابع فرمان ہو چکی ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

انسان باشعور تو ہو گیا لیکن پرندے کا سا عرفان کھو بیٹھا۔ کارل مارکس نے کہا تھا ''شعور انسان کے خلاف مادے کی منظم سازش ہے۔''

انسان بھٹک گیا

انسان جب پرندے کی طرح جیتا تھا تو ایک گھونسلے پر اکتفا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کا توکل جو ملائکہ کا خاصہ ہے فنا ہو گیا۔ قناعت جاتی رہی اور وہ ایک گھونسلے سے بڑھ کر اپنی ہوس کی تسکین کے لیے مکان پہ مکان بناتا چلا گیا۔ یہ اس کے دشمن ابلیس کی شرارت تھی۔ جب حیوانات کے درجے میں تھا تو ایک وقت کی کھا کے سو رہتا تھا۔ لیکن اب ابلیس نے جو اس کے ''گھر کا بھیدی'' تھا۔ اسے آنے والے کل کے لیے ذخیرہ کرنے کی عادت ڈال دی۔ انسان نے ملائکہ کو تو اپنے حضور سجدہ ریز کر لیا۔ ملائکہ...... پہاڑوں کے فرشتے' دریاؤں کے فرشتے' سمندروں کے فرشتے' صحراؤں کے فرشتے' چاند سورج اور ستاروں کے فرشتے' جانوروں کے فرشتے' درندوں' چرندوں' پرندوں کے فرشتے' بجلیوں کے فرشتے' بارشوں کے فرشتے' طوفانوں کے فرشتے' زلزلوں کے فرشتے' فصلوں کے فرشتے' اناج کے فرشتے۔ گویا ارض و سماء کی ہر قوت انسان کے حضور بے دام

بک چکی تھی۔ لیکن انسان ان تمام پر تصرف بلا شرکت غیرے حاصل کرنے کے باوجود ایک ایسی قوت کے سامنے بے بس اور مجبور ہو گیا جو اس کے اپنے من کے اندر سر چھپائے بیٹھی تھی اور وہی ایک قوت تھی جس نے شعور ملنے کے بعد انسان پر ایسا غلبہ پایا کہ وہ اپنے ساجدین یعنی ملائکہ کو ہی اپنا معبود سمجھ بیٹھا۔ گویا بساط الٹ گئی۔ یہی انسان فرشتوں کو مسخر کرنے نکلا تھا۔ یہی انسان فرشتوں کے حضور ایسا جھکا کہ ہر قوت کو الگ دیوتا مان لیا۔ بجلی کا دیوتا، بارش کا دیوتا، فصلوں کا دیوتا، اناج کا دیوتا، جانوروں کا دیوتا، زندگی کا دیوتا، موت کا دیوتا۔

انسان نے اپنے نفس کے ہاتھوں شکست کھائی تو خالق کائنات کا ایک اعلان سموات میں گونج گیا۔

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین"

ترجمہ: ہم نے انسان کو احسن تقویم میں تخلیق کیا اور پھر اسے رد کر کے اسفل سافلین بنا دیا۔

گویا انسان بھٹک گیا اور اشرف المخلوقات سے ارذل المخلوقات بن گیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

"اولئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا"

ترجمہ: وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

واقعی شعور ایک ایسا فردوسی پھل تھا جسے حاصل کر کے انسان نے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر لی اور اب انسانی فطرت ہزاروں سال کے بوجھ تلے دب کر تار تار ہو چکی ہے۔ اب وہ لوٹنا چاہتا ہے۔ لیکن اب لوٹنا اسے اپنے بس سے باہر معلوم ہوتا ہے۔

لیکن خالق کائنات یہ جانتا تھا کہ یہ "حیوان" اشرف المخلوقات بننے کے بعد اتنی صلاحیت حاصل کر لے گا کہ تسخیر کائنات کے ساتھ ساتھ اپنی "شعلہ مثال" فطرت پر بھی قابو پا سکے۔ وہ انسان سے مایوس نہیں ہے۔ زمین پر پیدا ہونے والا ہر بچہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مالک کل ابھی انسان کے درخشاں مستقبل سے پرامید ہے۔

★ جہاں میں ہر نیا بچہ ہمیں یہ درس دیتا ہے
نہیں مایوس انساں سے ابھی یزداں بحمداللہ

انسانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہے۔ وہ چاند کی ویران غاروں میں جھانکنے کی جرأت تو کر چکا ہے لیکن زمین پر موجود انسان کے آنے والے کل سے خوفزدہ ہے۔ وہ انسان کو لڑتا، جھگڑتا اور فساد برپا کرتا دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ وہ بلی کو دیکھتا ہے جو چوہے کو کھا جاتی ہے۔ وہ شیر کو دیکھتا ہے کہ بکری کو چیر پھاڑ دیتا ہے۔ وہ بڑی مچھلیوں کا مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is Right) کا قانون رائج ہے۔ وہ انسان سے اعمال صالحہ کی توقع نہیں رکھتا۔

★ وہ خالق کائنات کو ایک تخریبی قوت سمجھتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس چڑیا کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنے بچوں کے منہ میں ایک ملکوتی معصومیت کے ساتھ دانہ ڈالتی ہے۔ اس کی نظر ان دریاؤں پر نہیں پڑتی جو پہاڑوں کی رگوں سے نکل کر زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کی نظر چٹختے ہوئے غنچوں پر نہیں پڑتی جو حیات عالم کو پر بہار زندگی کی نوید دیتے ہیں۔ وہ مہکتے ہوئے پھولوں کو نہیں دیکھتا جو کرۂ زمین کے چہرے کو غازے اور افشاں سے سجا دیتے ہیں۔ اس کی نظر سے شاخوں کی اطاعت نہیں گزری جو دست بستہ سر جھکا کر اپنے پھل مخلوقات میں تقسیم کرتی رہتی ہیں۔ وہ ہواؤں کی دل افروزی سے بے خبر ہے۔ جن کے فرحت افزا جھونکے حبس کی بدصورتی سے تن تنہا برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔ ہاں! یہ سچ ہے کہ وہ اگر کائنات کے اس تعمیری رویے پر نظر ڈالتا تو اسے یہ کائنات (Might is Right) کی دنیا نظر نہ آتی۔ اس جلد باز انسان کو جان لینا چاہئے کہ پروردگار عالم نے زمین پر جس عاشق صدق دل کی تخلیق کی وہ نمونے کے طور پر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں کرۂ ارض پر ظہور فرما چکا ہے۔

امید کا سورج

امید کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی شعور کا ارتقاء مکمل ہی ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا اور اب انسان کو مزید کسی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ قرآن

مجید میں ہے کہ

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

ترجمہ: آج میں نے دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی دینی نعمتیں تمام کر دیں اور میں راضی ہوں کہ تمہارے لیے دین اسلام ہے۔

اور اب انسان کے پاس آخری ہدایت نامہ موجود ہے۔ جسے عطا فرماتے ہوئے خالق کائنات نے اپنے سب سے بڑے احسان کو جتلایا۔

"لقد من اللہ علی المومنین اذبعث فیھم رسولاً"

ترجمہ: ہم نے مومنوں پر احسان کیا کہ ان میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم (آخری) بھیجا۔

اس رسولؐ کے ہاتھ انسانوں کے لیے حسن محیط کی طرف سے بھیجا جانے والا امید کا روشن سورج انسانیت کا واحد سہارا ہے۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کائنات کے سب سے باشعور انسان ہیں۔ زمین پر بعثت فرما چکے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انسان نے اپنے تمام ارتقائی مراحل طے کر لیے اور اس کا شعور مکمل ہو گیا۔ خالق کائنات کے پروگرام کے مطابق انسان امید کے اسی سورج کی روشنی میں اپنے شعور کی مدد سے اس منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے جسے جنت الفردوس کہتے ہیں اور جہاں اسے اپنے محبوب حقیقی کا دیدار کرنا ہے (۵۲)۔ یہ تمام وقت جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ملاقات حسن تک گزرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک آن سے بھی کم ہے۔ اس کا منصوبہ مکمل ہو کر رہے گا کیونکہ اگر اسے معلوم نہ ہوتا کہ آگے کیا ہونے والا ہے تو وہ کچھ بھی تخلیق نہ کر سکتا۔ احسن الخالقین اپنے اس منصوبے کی تکمیل انسان کے ہاتھوں چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان اس کے منصوبے کو ناکام بنانے کی کوشش کرے یا تاخیری حربوں سے کام لے تو حسن بے پرواہ کو انسان کی یہ بات پسند نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کے بقول انسان کو ناپسندیدہ کاموں کے لیے اکسانے والا ابلیس ہے۔ ابلیس جو انسان کی اپنی حیوانی فطرت کا دوسرا نام ہے۔ انسان نے اسی حیوانی فطرت کی غلامی قبول کر کے اپنے آپ کو مقام انسانیت سے گرا رکھا ہے اور اپنی خواہشات

نفسی کی تکمیل کے لیے اپنی بشریت کو قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ حیوانی سطح سے بھی گر جاتا ہے۔ ابلیس کے سکھائے ہوئے جن جرائم نے آدمیت پر سب سے برا اثر ڈالا ان میں جنسی ہوس سرفہرست ہے۔ کیونکہ اشتہاء کے بعد شہوت ہی ایسی قوت ہے جو شخص کے کردار کو مسخ کرنے کے لیے خالص شیطانی فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ انسان کے پاس اپنی کھوئی ہوئی جنت کو حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ جنسی ضبط نفس سے کام لے کیونکہ بقول اقبال "خودی کی تربیت کا اولیں مرحلہ ہی جنسی ضبط نفس (۵۳) ہے اور یہ خودی ہی ہے جس کی تکمیل "قرب حسن" کا واحد راستہ ہے۔

باب ۲

انسانی تمدن کی ابتداء

انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے تقریباً آٹھ ہزار سال پہلے کیا- سائنس کی زبان میں اسے ''نیوسٹون ایج'' (New Stone age) یا ''نیا حجری زمانہ'' کہتے ہیں- یہ حضرت ابراہیم کی پیدائش سے تقریباً ایک ہزار سال قبل کا زمانہ ہے- یہی وہ دور ہے جب انسان نے کھیتی باڑی شروع کی اور مویشی پالنے کے کاروبار کا آغاز کیا- اس سے پہلے کے زمانے کو ''وسطی حجری زمانہ'' کہتے ہیں- وسطی حجری زمانے میں انسان زراعت سے واقف نہیں تھا اور شکار کرتا تھا- زمین کی آب وہوا نرم ہو چکی تھی- لہٰذا انسان نے غاروں کی زندگی ترک کر کے کھلے میدانوں میں رہائش اختیار کرنا شروع کر دی تھی- یہ وہ دور ہے جب انسان زیادہ تر ''گوشت'' کھاتا تھا- کیونکہ وہ کھیتی باڑی نہیں جانتا تھا- اس لیے اجناس کو بطور خوراک اختیار نہیں کر سکتا تھا- اس دور کو انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز نہیں کہا جا سکتا- اس دور میں انسان کوے کی کائیں کائیں' چڑیوں کی چوں چوں اور بلی کی میاؤں میاؤں سے اپنے لیے زبان پیدا کر رہا تھا- گویا بیس ہزار سال قبل انسان نے کچھ اشاروں' کچھ مہمل آوازوں' کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو ملا کر اپنے لیے ابتدائی زبان تخلیق کرنا شروع کر دی تھی-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ ہزار سال پہلے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں انسان کی شہری زندگی اچھی خاصی چل نکلی تھی- مصر' کنعان' حاران' بابل' سدوم' سعار' اریوک اور ضغر وغیرہ گھنی آبادیوں کے شہر بس چکے تھے- کاہنوں اور جادوگروں کے پیدا کردہ توہمات' بجلی کی کڑک' زلزلہ' آتش فشاں پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ اور مفاد پرست ذہین لوگوں کی گھڑی ہوئی جھوٹی کہانیوں سے خوفزدہ ہو کر انسان نے ''بت پرستی'' شروع کر دی تھی- یہی دور ہے جب یکے بعد دیگرے انبیاء آئے اور لڑتے' جھگڑتے' فساد برپا کرتے- لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا- انہوں نے انسانیت کو متحد اور متوازن کرنے کے لیے انتہائی مشقت سے کام کیا اور جھوٹے

جادوگروں اور کاہنوں کے خود ساختہ مذاہب کی جگہ ایک مرکز پر اکٹھا ہونے یعنی ایک پروردگار کی اطاعت کے لیے انسانوں میں تحریک چلائی-

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین بطور سیارہ سورج سے کم وبیش پانچ ارب سال پہلے الگ ہوئی اور دوسری طرف ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے تقریباً آٹھ ہزار سال قبل کیا- گویا یہ درمیان کے پانچ ارب سال زمین پر ''ارتقاء'' ہوتا رہا- سائنس دانوں نے ان پانچ ارب سالوں کو چھ ادوار میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے- پہلے دو ادوار زیادہ طویل......مدت کے ہیں اور ان میں زمین پر بے جان مادوں' آگ کے شعلوں اور زہریلی گیسوں کا راج رہا- باقی کے چار ادوار زمین پر پانی' سبزے' ابتدائی زندگی اور پھر اب تک کی زندگی کی نمود کے ہیں- اس قدر طویل......منصوبے کے تحت انسان کو پیدا کرنے کے بعد جب آج سے آٹھ دس ہزار سال پہلے انسان کا شعور اپنی پختگی کے مراحل میں تھا تو اس ناسمجھی کے زمانے میں انسان سے بڑی بڑی خطائیں سرزد ہوئیں- جن کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں- اگر انسان کو شعور نہ ملتا اور انسان دوسرے جانوروں کی طرح عقل سے محروم رہتا تو یقیناً اس سے یہ خطائیں سرزد نہ ہوتیں- لیکن اسے اشرف المخلوقات بننا تھا- اس لیے اسے شعور کی دولت عطا کی گئی اور اختیار وارادہ کا مالک بنا دیا گیا- اب وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کے درپے ہو گیا- اس نے طاقت ور جانوروں کو اپنا مطیع بنا لیا اور ان جانوروں کی مدد سے کھیتی باڑی شروع کر دی-

مذہب کا آغاز

''بیل'' وہ پہلا جانور ہے جسے انسان نے اپنا کاروبارِ حیات چلانے کے لیے استعمال کیا- یہ وہی دور تھا جب انسان مکار کاہنوں کے جھوٹے قصے کہانیوں کے جھانسے میں آ گیا- یہی دور تھا جب انسان نے کائنات کی ہر زبردست قوت کو دیوتا اور خدا کہنا شروع کر دیا- بیل بھی اس دور کے خداؤں میں سے ایک تھا- بیل انسان کی زراعت چلانے کا واحد سہارا تھا- یہی وجہ ہے کہ اس دور کے انسانوں نے گائے اور بیل کی بے پناہ پوجا کی- تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ بابل' مصر' ایران اور ہندوستان وغیرہ میں ''بیل'' کو سب سے بڑا ''دیوتا'' مانا جاتا تھا-

یہ انسان کی ناسمجھی کا زمانہ تھا- اگرچہ انبیاء اور مصلح‘ حکماء اور فلسفی متواتر ان کوششوں میں لگے رہے کہ یہ ناسمجھ انسان اپنے نومولود شعور کا غلط استعمال نہ کرے- لیکن پھر بھی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور انسان کی سابقہ حیوانی فطرت انسانی تمدن پر غالب رہیں اور انسان بدستور لڑتا‘ جھگڑتا اور جھوٹے خداؤں سے ڈرتا رہا-

اسی زمانے میں انسان نے اپنی فطرت کے سب سے زیادہ طاقتور جذبے یعنی ''جذبہ ءجنس'' کا اپنے ناپختہ شعور کی بدولت انتہائی غلط استعمال کیا- اس دور کے مذاہب جن میں اہل بابل‘ اہل مصر‘ اہل یونان اور اہل ہند کی تاریخ لائبریریوں میں دستیاب ہے- ''سیکس'' کے سب سے بڑے مبلغ تھے- ان ملکوں کے علاوہ بھی کرۂ ارض کا ہر خطہ جہاں اس وقت انسان بستے تھے جذبہ ءشہوت کے منہ زور طوفان کی زد میں تھا- یہی وہ دور ہے جب بڑے بڑے کاہنوں‘ پجاریوں اور پروہتوں نے جذبہ ءجنس سے متعلق عجیب وغریب کہانیاں دیوتاؤں سے منسوب کر کے مذہب میں داخل کر دیں-

اصل میں جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں- ان ادوار میں انسان ابھی لاعلم اور کم ذہین تھا- ان ادوار میں خال خال جو لوگ قدرے ذہین ہوتے وہ اپنی عقل کے مطابق باقی لوگوں کی راہنمائی کرنے کی کوشش کرتے- ان میں سے جو لوگ مثبت خیالات کے مالک ہوتے وہ حکیم‘ فلسفی اور دانشور کہلاتے اور جو لوگ منفی خیالات کے مالک ہوتے وہ کاہن‘ پروہت اور پجاری بن جاتے اور اپنی طرف سے عجیب وغریب مافوق الفطرت کہانیاں گھڑ کے لوگوں کے سامنے مذہب کے نام سے پیش کرتے اور اپنی عیاشی اور آرام کے لیے سادہ لوح عوام سے ناجائز فائدے اٹھاتے- یہ سب کچھ تو تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خالق فطرت کی طرف سے انبیاؑ بھی انسانوں کی تبلیغ واصلاح کے منصب پر فائز ہوتے رہے اور انسانوں کو جھوٹے خداؤں کی پوجا‘ فساد‘ خون خرابے اور جنسی بے راہ روی سے روکتے رہے-

مذہب میں سیکس کا نفوذ

یہاں ایک بات غور سے سمجھنے کی ہے اور وہ یہ کہ کوئی بھی انسان اس نصیحت کی طرف مائل نہیں ہوتا جس میں اس کا کوئی فائدہ‘ لذت یا آرام شامل نہ ہو اور پھر اس دور کا انسان تو تھا بھی کم علم اور کم

عقل- جب جھوٹے مذاہب کے پیشواؤں نے اسے بتایا کہ دیوی دیوتا اور خدا وغیرہ بھی آپس میں جنسی اختلاط کرتے اور لذت وسرور حاصل کرتے ہیں تو اس وقت کا انسان ان پیشواؤں کی باتوں سے خوش اور مطمئن ہوا- اس وقت کے انسان نے مذہب کی جنسی ترغیبات کو دل وجان سے قبول کیا اور کھانے پینے اور سونے کے علاوہ اپنا باقی تمام وقت جنسی خواہشات کی تکمیل میں گزارنے لگا- وہ مندر یا معبد میں جاتا تو اسے برہنہ دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں‘ دیوی دیوتاؤں کی داسیاں اور معبد کا جنس زدہ ماحول یہ یقین دلاتا کہ اس کی زندگی کا مقصد کھانا پینا اور جنسی لذائز حاصل کرنا ہی ہے-

ایک افسوس کی بات یہ ہوتی رہی کہ برگزیدہ انبیاؑ اپنے ساتھ اصلاح کا جو پیغام لاتے‘ انبیاؑ کی وفات کے بعد لوگ اس پیغام میں جھوٹے قصے کہانیاں شامل کر دیتے اور اس الوہیاتی ہدایت کو اپنی خواہشات کے مطابق جنسی قصے کہانیوں سے آلودہ کر دیتے اور یوں انبیاؑ کی تبلیغ بعد والوں تک صحیح نہ پہنچ سکتی اور جو پہنچتی اس میں پھر وہی جنسی ترغیبات اور کہانیاں ہوتیں- جس کے خاتمے کے لیے انبیاؑ آئے تھے-

قدیم تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ ماضی میں انسان کس طرح ''سیکس'' کے دیوتا کی پوجا کرتا رہا- مصر‘ یونان‘ بابل‘ ہندوستان اور فارس کی تاریخ تو اس بات کی گواہ ہے ہی- بیت المقدس کی سرزمین جو بنی اسرائیل کا مسکن تھی اور بنی اسرائیل جو اس وقت کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی‘ سمجھدار اور مہذب قوم تھی‘ بھی جنس کے طاقت ور دیوتا کے حضور سجدہ ریز ہونے سے باز نہ رہ سکی- جہاں بابل‘ نینوا اور مصر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ مذہب شہوانیت کا شکار تھے وہاں تحریف شدہ بائبل میں انبیاء کے ساتھ منسوب بہت سے شرمناک واقعات سے بنی اسرائیل جیسی مہذب قوم کی ذہنیت کا بھی پتہ چلتا ہے-

انسان کو اپنے کسی عمل کے لیے اگر مذہب کی طرف سے کوئی تائیدی سند مل جائے تو وہ شیر ہو جاتا ہے اور دیدہ دلیری کے ساتھ اس فعل کو سرانجام دیتا ہے- جس کی تائید اس کے مذہب نے بھی کی- ماضی کا ہر بت پرست مذہب اور پھر بنی اسرائیل کی تحریف شدہ کتابیں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید اپنے قصے کہانیوں اور مضامین میں سیکس کی بڑی بھرپور تائید کرتے ہیں-

یہاں ہم مذاہب عالم کی وہ روایات جمع کر رہے ہیں جن میں ان مذاہب نے اشارۃً یا صریحاً شہوانیت کی تعلیم دی ہے اور جن سے ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی فطرت میں انتہا درجہ کی بڑھی ہوئی جنسی بے راہ روی جس نے روئے زمین کے نظام اخلاق، اقدار، امن اور سلامتی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے مذہب کے بطن سے نمودار ہوئی اور یہ مذہب ہی ہے جس نے انسان کو اس کی پامال فطرت کے حق میں دلائل اور اسناد مہیا کیں۔ البتہ اسلام نے جسے مذہب کی بجائے صرف ''دین'' کہنا زیادہ مناسب ہے اور جو قرآن حکیم کی تعلیمات کی شکل میں پوری انسانیت کے سامنے ہر وقت موجود ہے۔ فاران کی چوٹیوں سے بلند ہو کر یہ اعلان کیا کہ شرم و حیا ہی اشرف المخلوقات کا خاصہ (۵۴) ہے اور انسان کو اس کی ''فطرت اصلیہ'' کی طرف لوٹنے یعنی ''جنسی ملاپ برائے افزائش نسل'' کی تلقین کی (۵۵)۔

اہل بابل کا مذہب اور جنسی حالت زار

ہم انسان کے آبائی مذاہب میں سب سے پہلے اہل بابل کے مذہب پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ جس کی جنسی ہوس سے بھرپور شہری زندگی آج بھی عالمی اخلاقیات پر اثر انداز ہے۔

بابل جس کا ذکر قرآن مجید میں (۵۶) ہے اور جس کے بارے میں بائبل میں لکھا ہے کہ:

''بابل خداوند کے ہاتھ میں سونے کا پیالہ تھا جس نے ساری دنیا کو متوالا کیا۔ قوموں نے اس کی مے پی اور وہ دیوانہ ہوئیں۔ بابل یکا یک گر گیا اور غارت ہوا۔ اس پر واویلا کرو؛ اس کے زخم کے بلسان لو۔ شاید! وہ شفا پائے (۵۷)۔''

دنیا کا ایک عظیم شہر تھا جس کی شان و شوکت سے اس وقت کے پرہجوم شہر ''نینوا'' اور ''ممفس'' دبتے تھے۔ آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل کرۂ ارض پر اپنی ساٹھ لاکھ (۵۸) کی آبادی سمیت موجود تھا۔ جرمن محقق پروفیسر جارج ایبرس کے بقول یہی شہر ہے جس کی سب سے بلند عمارت پر بیٹھ کر یونان کے مشہور دانشور ''فیثا غورث'' کا استاد عظیم منجم ''انوفس'' کلدانی عالموں کو علم نجوم سکھاتا رہا۔ اسی سرزمین پر سمیری، عموری، حطی، اشوری اور کلدانی تہذیبوں نے جنم لیا اور معدوم ہوئیں۔ یہی شہر ہے جہاں ''ہاروت ماروت'' کے علاوہ زکریا علیہ السلام، دانیال علیہ السلام، حجیؑ نبی وغیرہم ہو

گزرے۔ اپنے وقت کا ناقابل تسخیر شہر تھا۔ جس کی اونچی اونچی مضبوط دیواریں اور برج کسی لشکر یا فاتح کے لیے ناقابل عبور تھے۔ جس کی دولت قابل رشک تھی اور جس کا تمدن اپنے وقت کا جدید ترین تمدن تھا۔ جب نابود ہوا تو ایسا کہ اب صفحۂ ہستی پر اس کا نام و نشان بھی نہیں۔ تورات میں ہے کہ......

''قوموں میں اعلان کرو
اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو
منادی کرو
پوشیدہ نہ رکھو
کہہ دو کہ بابل لے لیا گیا
اور بیل رسوا ہوا
مردوک سراسیمہ ہوا اور اس کے بت خجل ہوئے
اس کی مورتیں توڑی گئیں (۵۹)۔''

تاریخ شاہد ہے کہ اہل بابل کی تباہی کا باعث ان کا وہ غیر فطری جنسی طرز عمل تھا جسے انہوں نے اپنے مذہب کی اسناد کے ساتھ اپنائے رکھا۔ اہل بابل کے مذہب میں عورت اور مرد کا جنسی اختلاط گلی گلی میں فحاشی کے مظاہرے، ہم جنس پرستی اور شہوانیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ خاص خاص مواقع پر سر عام ہم بستری کرنا ثواب سمجھتے تھے۔ طوائفیں، کسبیاں، کسدیاں اور پیاریاں شہر میں بہت بھاری تعداد میں تھیں۔ اہل بابل آئے دن جنسی تہوار مناتے، رقاصائیں اور کسبیاں بتوں کے سامنے الف ننگا رقص پیش کرتیں۔ عظیم الہیبت پتھر اور پیتل کے بت جو ان کے جنسی دیوی دیوتا تھے۔ اپنے سایے میں اپنے چاہنے والے نوجوانوں کے جنسی اختلاط اور ہم بستری کا تماشہ دیکھتے۔ بابل کو تورات نے مملکتوں کی خاتون، شہروں کی دلہن، فاحشہ اقوام، کسدیوں کا ملک، دیوتاؤں کی محبوبہ کے القابات سے نوازا ہے۔ لوگ دن بھر اپنی داشتاؤں کو ساتھ لے کر گھومتے اور جب جی چاہتا سر بازار بوس و کنار کرتے۔ بابل میں ایک بہت بڑا بازار تھا جسے ''بازار عیش'' کہا جاتا تھا۔ جہاں فاحشہ عورتیں مردوں کو زبردستی پکڑ کر انہیں اپنے جوان جسم کا نذرانہ پیش کرتیں۔

مشہور مؤرخ اسٹرابو کے بقول بابل میں چالیس ہزار عورتیں یہی دھندہ کرتی تھیں۔ یہ تو عام بازاری عورتیں تھیں۔ گھریلو عورتیں بھی اپنے خاوندوں سے ہٹ کر غیر محرموں کے ساتھ ہم بستری مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتیں۔ بتوں کے سامنے کنواریوں کا ننگا رقص ان کے مذہب کا حصہ تھا اور دیوی دیوتاؤں کے بتوں کے سامنے خصوصاً زہرہ دیوی کے بڑے مندر ہیکل زہرہ میں دیوی کے بڑے بت کے حضور کنواری لڑکیاں اپنے پہلے جنسی ملاپ کا مظاہرہ کرتیں اور یوں ان کا عقیدہ تھا کہ کنواری کی دوشیزگی لٹتے دیکھ کر دیوی خوش ہوتی ہے۔ اکثر دیوی دیوتاؤں کے مجسمے نہ صرف برہنہ ہوتے بلکہ سنگتراش ان کے جنسی اعضاء یوں ناپ تول کر بناتے کہ چاہنے والوں کے مزاج اپنے خداؤں کو دیکھتے ہی جنس زدہ ہو جاتے۔ بابل میں جگہ جگہ نیلام گھر تھے جہاں کنیزیں اور لونڈیاں فروخت ہوتیں۔ عام عورتیں دو دو نام استعمال کرتیں۔ ایک نام پہچان کے لیے اور دوسرا جنسی تعلق قائم کرتے وقت مردوں کو بتانے کے لیے۔ دوسرے نام میں جنسی کشش ہوتی۔ مثلاً پیغام محبت، نرم و گداز، رس بھری، جیسے معنوں کے نام رکھے جاتے۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں بابل کی ایک حسین رقاصہ کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

”اے امیر زادی (۶۰)! تیرے پیر جوتیوں میں کیسے خوبصورت ہیں
تیری رانوں کی گولائی ان زیوروں کی مانند ہے جسے کسی استاد کاریگر نے بنایا ہو
تیری ناف گول پیالہ ہے جس میں ملائی ہوئی مے کی کمی نہیں
تیرا پیٹ گیہوں کا انبار ہے جس کے گرداگرد سوسن ہوں
تیری چھاتیاں دو آہو بچے ہیں جو توام پیدا ہوئے ہیں
تیری گردن ہاتھی دانت کا برج ہے
تیری آنکھیں بیت ربیم کے پھاٹک کے پاس حبون کے چشمے ہیں
تیری ناک لبنان کے برج کی مثال ہے جو دمشق کے رخ بنا ہے
تیرا سر تجھ پر کرمل کی مانند ہے اور تیرے سر کے بال ارغوانی ہیں
بادشاہ تیری زلفوں میں اسیر ہے۔
اے محبوبہ! عیش و عشرت کے لیے تو کیسی جمیلہ اور جانفزا ہے۔

اہل بابل کی شہوت پسندی

گویا شہوت انگیزی بابل کا مذہب تھا۔ شہوانی دیوتاؤں کے لیے الگ مندر تھے جہاں نوجوان مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی جو مندر کے بڑے ہال میں سب کے سامنے وصل و اختلاط کا تماشہ دکھاتے۔ بابل میں کسی لڑکی کے لیے چیرا بند کنواری ہونا جرم اور گناہ سمجھا جاتا۔ ہیرلڈم کے مطابق جسم فروش عورتیں نقاب پہنتیں اور عام شہری خواتین کھلے منہ پھرتیں۔ معاشرے کی جنسی گراوٹ کا یہ عالم تھا کہ لوگ شراب، انسانی لہو حتیٰ کہ ”مادۂ تولید“ کی بھی باقاعدہ پوجا کرتے تھے۔ اس شہوت زدہ شہر میں آئے دن مذہب کے نام پر جنسی تہوار منائے جاتے جن میں ”عید بیلس“، ”جشن زہرہ“ اور ”جشن سال نو“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زہرہ کا جشن بابل کے مشہور باغات معلقہ میں منایا جاتا جو عظیم شہنشاہ بخت نصر نے اپنی محبوبہ کی خوشنودی کے لیے بنوائے تھے۔ یہ عجائب زمانہ باغات سات منزلوں پر مشتمل تھے۔ جن کے کھنڈرات موجودہ زمانہ کے شہر ”بلہ“ جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے، میں اب بھی موجود ہیں۔ جشن زہرہ، زہرہ دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے منایا جاتا۔ زہرہ دیوی حسین و جمیل تھی اور جنسیت کے شائقین کی محبوب تھی۔ اس پر کئی دیوتا عاشق تھے اور وہ سب دیوتاؤں کو خوش رکھتی تھی۔ اسے چیرا بند کنواری لڑکیوں کا کنوارہ رہنا ناپسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوشیزگی کو جلد از جلد ختم کرنے کے حق میں تھی۔ زہرہ دیوی کا ہر بت انتہائی حسین لیکن الف ننگا ہوتا تھا۔ جس کے بھڑکیلے اعضاء ہر لحظہ دیکھنے والے کو جنسی طور پر بہکائے رکھتے تھے۔ دانشوران اہل بابل کا خیال تھا کہ انسان کا یہ فطری عمل یعنی جنسی ملاپ جلد از جلد شروع ہو جانا چاہئے (۶۱)۔ جشن زہرہ اسی زہرہ دیوی کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ تھا جو بادشاہ کے زیر سایہ باغات معلقہ میں منایا جاتا (۶۲)۔ جشن میں شریک ہونے والی کنواریاں سب سے پہلے زہرہ دیوی کے مجسمے کی حاضری دیتیں اور اس کا طواف کرتیں۔ طبقہ اشراف اپنی نوجوان بیٹیوں کو سارا سال جنسی اختلاط کے عمل سے اس لیے بچا کر رکھتا کہ جشن زہرہ کی رات ان کی دوشیزگی لٹا کر دیوتاؤں کے حضور سرخرو ہو سکے۔ جشن زہرہ دو تین دن اور دو تین راتوں تک جاری رہتا اور یوں پورا بابل اجتماعی طور پر شب و روز اس مقدس زنا کا مرتکب ہوتا۔

جشن زہرہ کے بعد دوسرا سب سے بڑا جنسی تہوار ”عید بیلس“ تھا۔ عید بیلس کے دن

''مقدس بیل'' جو اہل بابل کا سب سے بڑا خدا تھا' کے ساتھ گائے کے جنسی ملاپ کا شرم ناک تماشہ
بابل کے سب سے بڑے سٹیڈیم میں ہزاروں لوگوں کے سامنے دکھایا جاتا - اس مقصد کے لیے
بابل کے مذہبی پیشوا مقدس بیل کو سارا سال گائیوں سے دور رکھتے - اس کو خوب کھلاتے پلاتے ا
عید کے دن اسے سجا کر بڑے سٹیڈیم میں چھوڑ دیتے - جہاں اسے یکے بعد دیگرے سات صحت مند
گائیوں کے ساتھ جنسی ملاپ کرنا ہوتا تھا - دین اکد (اہل بابل کا مذہب) کے بزرگ اس شرمناک
تماشے کو افزائش نسل کا فطری عمل قرار دیتے اور ترقی حیات کے لیے مثالی نمونہ سمجھتے - عید بیلس بیل
کی جفتی کا دن تھا اور اس عجیب تہوار کے منانے میں دانشوران بابل کا یہ فلسفہ کارفرما تھا کہ عید بیلس
زمین و آسمان کے اختلاط کا دن ہے - اہل بابل کے مذہب کے مطابق بیل آسمانی بجلی کے نطفے سے
پیدا ہوا - لہٰذا سموات کا نمائندہ تھا - جبکہ گائے یا بیل زمین کی قوت نمو تھی اور یوں اہل بابل اس غلط
اور شرمناک رواج کو فطرت اور مذہبی تقدیس کا رنگ دے دیتے - اس روز کوئی مرد کسی بھی عورت
ہاتھ پکڑ کر اسے دعوت زنا دے سکتا تھا - اسی طرح کوئی بھی عورت اپنی مرضی کا مرد چن کر جنسی عمل
مقدس فریضہ سرانجام دیتی - عید بیلس کو بابل کے لوگ انتہائی شوق اور خوشی سے مناتے اور سا
سال اس شرم ناک تہوار کی تیاریاں کرتے - عید بیلس کی تقریبات بھی دو تین روز تک جاری رہتیں
اور یوں لگتا جیسے ساٹھ لاکھ کی آبادی کے اس شہر کو زنا اور بدکاری کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا - سب
سے زیادہ بدکاری کا ارتکاب مندروں' معبدوں' ہیکلوں اور عبادت گاہوں میں کیا جاتا - جہاں
عبادت گاہوں کے حجرے عورتوں اور مردوں کے استعمال کے لیے کھول دیے جاتے اور خداؤں
رضامندی کے لیے مادۂ منویہ کی نہریں بہادی جاتیں [٦٣] -

اہل بابل کے جنسی عقائد

مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس نے اہل بابل کے دین اکد پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور ان تہواروں
اخلاق باختہ قرار دیا ہے - اہل بابل کی جنسی بے راہ روی کا یہ عالم تھا کہ بھائی اور بہن کا مقدس رشتہ
بھی محفوظ نہ رہ سکا -

حمورابی کے قوانین کے مطابق بہن بھائی کی شادی جائز تھی [٦٤] -

یہ تو تھے اس معاشرے کے جنسی حالات لیکن سوال یہ ہے کہ اس حد تک شرمناک جنسی اعمال
اہل بابل کے لیے کیوں پسندیدہ تھے - دراصل اس دور کے مذہبی پیشواؤں نے دیوی دیوتاؤں اور
خداؤں کے نام سے عوام کے سامنے جس قسم کا مذہب پیش کیا - وہ مذہب ہی سارا جنسی بنیادوں پر
استوار کیا گیا تھا -

پروفیسر جارج ایبرس کے بقول ''پرکی'' دیوی جنسی ملاپ کی دیوی تھی - عوام کی سب سے
پسندیدہ دیوی ایشتار جو بظاہر جنگ جو تھی اور ''خاتون اورک'' کہلاتی تھی - دو شوہروں [٦٥] کی
بیوی تھی - بابلی عقائد کے مطابق اس کے دو شوہر ''بل'' اور ''مردوک'' تھے - مذہبی پیشواؤں نے
لوگوں کو بتایا کہ آسمانوں پر دیوتا ''بل'' اور دیوتا ''مردوک'' کے مابین حسین جنگجو دیوی ایشتار کے
حصول کے لیے لڑائی ہوئی اور دونوں دیوتا برابر طاقت کا مالک ہونے کے باعث ایک دوسرے کو
شکست نہ دے سکے - لہٰذا ایشتار دیوی نے بہ یک وقت دو شوہروں کی بیوی ہونا قبول کر لیا - یہ
بالکل اسی طرح ہے جیسے ہندوستانی ''دیوی تھیامتا'' کے دو شوہر تھے' اپسو اور کنگو - بابل میں ایشتار
دیوی کے بت برہنہ بنائے جاتے اور ان کی جسمانی ساخت اس طرح بنائی جاتی جیسے وہ ہم بستری
کے لیے اپنے محبوب شوہر مردوک کا انتظار کر رہی ہو [٦٦] - اہل بابل کا ایک اور عقیدہ تھا کہ ان کا
ایک خدا (دیوتا) جس کا نام ''بعل'' تھا ایک حسین دیوی جس کا نام عستارات تھا کی خواب گاہ میں
جنسی اختلاط کی نیت سے چوری چھپے گھس گیا تھا [٦٧] - اہل بابل اپنے دین کو دین فطرت کہتے
تھے - ان کا خیال تھا کہ جنسی آزادی ایک فطری حق ہے - لہٰذا فطرت پسندی ہی درست مذہب
ہے - موجودہ زمانے میں ہپی ازم کی تحریک بھی اسی عقیدے کی حمایت میں اٹھی تھی اور جس کے
ماننے والے فطرت پسند (نیچرلسٹ Naturalist) آج بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں -
بابل کے لوگ ''انلیل دیوی'' کی بھی پوجا کرتے تھے - جس کا حسین برہنہ مجسمہ نوجوان عورتیں اپنی
خوابگاہوں میں سجاتیں - بہن بھائی کی شادی کا جواز مذہبی پیشواؤں نے ایشتار دیوی اور بل کی
شادی سے لے رکھا تھا - کیونکہ ایشتار دیوی اور بل بیک وقت میاں بیوی بھی تھے اور بہن بھائی
بھی - زمین اور آسمان اہل بابل کے نزدیک میاں بیوی تھے اور آسمان جب زمین سے جفتی کرتا تو
فصلیں پیدا ہوتیں' گویا اولاد ہوتی - یہ نظریہ ذرا مختلف الفاظ میں آج بھی پایا جاتا ہے - بعض لوگوں

کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر چیز جب اپنے شباب کو پہنچتی ہے یعنی جب وہ زیادہ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی ہے تو یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ چیز جنسی ملاپ کی خواہشمند ہوتی ہے اور افزائش نسل کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتی ہے (۶۸)- مثلاً پھول کھلتا ہے جو پودے کا ایک جنسی عضو ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ پودا جنسی عمل کے لیے تیار ہے- اسی طرح کوئل کی کوکو' پپیہے کی پی ہو پی ہو اور مور کا رقص- ایک طرف تو خوبصورتی اور حسن کی مثالیں ہیں لیکن دوسری طرف جنسی ملاپ کی تیاریاں ہیں اور اس خیال کی بدولت جنسی بے راہ روی کے شوقین اپنے حق میں دلائل بھی قائم کرتے ہیں- لیکن اہل نظر کو یہ دیکھنا چاہئے کہ مظاہر فطرت کا یہ جنسی رویہ محض افزائش نسل کے لیے ہے' نہ کہ محض وقتی حظ کے لیے- تاریخ شاہد ہے کہ اہل بابل نے جنسی خواہشات کو مذہبی رنگ دے کر ناجائز طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی اور تباہ ہو گئے- تورات میں ہے-

''بابل سے نکل بھاگو! اور ہر ایک اپنی جان بچائے- اس کی بدکرداری کی سزا میں شریک ہو کر ہلاک نہ ہو- کیونکہ یہ خداوند کے انتقام کا وقت ہے (۶۹)-''

آج بابل صفحۂ ہستی پر موجود نہیں- وہ قوم فنا ہو گئی ان کی نسل بے پناہ جنسی ملاپ کے باوجود بھی باقی نہ رہی' بلکہ مٹ گئی- تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شہوانیت کی خواہش ناجائز حد تک ذہنوں پر سوار کر رکھی تھی اور جیسا کہ ہم اپنی تحقیق سے ثابت کر رہے ہیں کہ انسان نے اپنے ......ابتدائی مذاہب میں ناجائز جنسی روابط جان بوجھ کر اختیار کیے اور یہ مذاہب ہی تھے جنہوں نے انسانیت کے اس......قیمتی جذبے کا استحصال کیا اور انسانیت کو ورغلایا' گمراہ کیا- جس کی وجہ سے انسانی تہذیب صحیح سمتوں میں سفر نہ کر سکی اور غیر فطری اعمال کو شعوری طور پر اپنا لیا- نتیجتاً تباہی اور خسارہ انسان کا مقدر ٹھہرا-

اہل مصر کا مذہب اور جنسی حالت زار

بابل جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے بھی قبل ایک بڑا شہر بن چکا تھا- آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے اپنے برے اعمال کے ہاتھوں تباہ ہوا- بابل انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہے- اس زمانہ میں پوری دنیا میں بسنے والے انسان انہیں چند بڑے ملکوں یعنی یونان' چین' ہندوستان'

بابل' عراق' ایران' حجاز' فلسطین اور مصر وغیرہ میں آباد تھے- عراق' حجاز اور عرب بابل کے گرد و نواح میں تھے- لہٰذا ان کے جنسی عقائد بھی بابل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اہل حجاز و عرب کی شہوانیت پسندی کی روایات بھی تاریخ میں ملتی ہیں- اس علاقہ کے بعد مصر کرۂ ارض پر ایک عظیم اور شان و شوکت کا حامل ملک تھا- یہ بات تو مشہور ہے کہ مصر کے فرعون خالص نسل کے حصول کے لیے بہن بھائی کی آپس میں شادی کو فرض سمجھتے تھے- فراعین مصر جنہوں نے ہزاروں سال تک حکومت کی- زمین پر خدا کے اوتار سمجھے جاتے اور ان کا ہر حکم مذہبی احکامات کا درجہ رکھتا تھا- مصر کی تاریخ اگرچہ مختصر الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں لیکن ہم یہاں اہل مصر کی جنسی حالت اور عقائد پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کے آباؤ اجداد نے شہوانیت کا مذہب اختیار کر کے جنسی حوالے سے انسان کے شوق اور عادات کو بدل ڈالا اور جس کے نتیجے میں آج انسانی فطرت بھی بدل چکی ہے- ہزاروں سال میں کیے جانے والے گناہوں کا کفارہ یہ ہے کہ ہم اپنی عادات کو ایک مرتبہ پھر اصل انسانی فطرت کے ماتحت ڈھالنے کی کوشش کریں- تاکہ چند صدیوں میں ہی ہماری غیر فطری عادات و حرکات ہم سے چھوٹ جائیں-

مصر ایک بہت بڑا ملک تھا- جہاں کے لوگ دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ اپنے بادشاہوں کے خاندان حتیٰ کہ اپنے مردوں اور میتوں کی بھی پوجا کرتے تھے- مصر میں انسانی لاشوں کو حنوط کر کے ''ممیاں'' بنانے کا رواج تھا- وہ لوگ بڑے بڑے مقبرے بناتے جن میں حنوط شدہ لاشیں اس طرح رکھی جاتیں کہ ان لاشوں کے چلنے پھرنے' کھانے پینے' جنسی ملاپ کرنے' غرض زندگی گزارنے کے ہر سامان کا خیال رکھا جاتا- مصر کی قدیم تہذیب کے فناء ہونے کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے اب تک سینکڑوں ایسے مقبرے دریافت کیے ہیں جہاں مصر کے شاہی خاندانوں' امراء اور بادشاہوں کی حنوط شدہ ممیاں رکھی گئی تھیں- ماہرین آثار قدیمہ نے دنیا کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ان ممیوں کے ہمراہ اہل مصر جو ضروریات زندگی کا سامان تو رکھتے ہی تھے- زندہ انسانوں' غلاموں اور کنیزوں کو بھی مقبرے میں لاش کے ساتھ بند کر کے باہر سے دیواریں چن دیتے تھے- ان کا خیال تھا کہ لاش مقبرے کے اندر دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے اور باقاعدہ ضروریات زندگی کے ساتھ سفر زیست طے کرتی رہتی ہے- بادشاہوں کی دیکھا دیکھی اور ان کے احکام کے زیر سایہ رہنے

والے اہل مصر نے بھی ان عقائد کو اپنا لیا- اگرچہ اہل مصر اہل بابل جیسے شہوت پرست تو نہ تھے لیکن ان کی شہوت پرستی بھی غیر انسانی حد تک بگڑی ہوئی تھی- قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مصری خواتین کی جنسی دست درازیاں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں-

دراصل عہد قدیم کی تمام تہذیبیں جنسیات سے اس لیے آلودہ ہوتی رہیں کہ ان کے مذہبی پیشواؤں نے انہیں دیوی دیوتاؤں اور خداؤں کے نام سے جان بوجھ کر مذہب شہوانیت کی طرف مائل کیا- اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ یہ جذبہ یعنی جذبہء جنس انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے- لیکن ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت غیر انسانی حد تک اس شدید جذبے کا پرچار اہل مذہب نے کیا- جو بزعم خود الٰہوں اور دیوتاؤں کے فرستادہ تھے- مصر میں بھی دیوی دیوتاؤں کے جھوٹے نمائندوں، مذہبی پیشواؤں، پروہتوں اور کاہنوں نے ایسے ہی مذہب کی تبلیغ کی- نتیجتاً اہل مصر بھی دوسری بڑی تہذیبوں کی طرح غیر انسانی نظریات کا شکار ہوئے- مصر میں بھی گائے کی پوجا ہوتی تھی- یہود کی کتاب حدیث مثنا میں ان کی خصوصیات اور رنگ و نسل درج ہیں- مصر میں ''بیل'' کی بھی بڑے اہتمام کے ساتھ پوجا کی جاتی تھی- جسے رب افیس (۷۰)'' یا ''آپیس'' کہا جاتا تھا- قدیم مصر کے لوگوں کا یہ عقیدہ کہ سورج دیوتا نے سب سے پہلے اپنا ختنہ کروایا تھا اور اس کا جو خون ٹپکا...... اس سے باقی دیوتاؤں نے جنم لیا......

مصر کی ایک ''دیوی مہاماتا' ہاتھر'' تھی- جس کا جسم عورتوں جیسا پرکشش اور سر گائے کا تھا- یہ طاقت کی دیوی تھی اور اس کے سینگوں کے درمیان ایک بڑا سا گولا نظر آتا تھا...... مصر میں بھی دیوی دیوتاؤں کی جنسی کہانیاں مقبول تھیں اور انہیں مذہبی احکامات کا درجہ دیا جاتا تھا...... جس طرح بابل کی دیوی ایشتار بیک وقت ''راکب الغمام'' بل کی بہن بھی تھی اور زوجہ اور محبوبہ بھی اور جس طرح ایشوریوں کے سب سے بڑے دیوتا ''بعل'' کی بہن ''عنات'' جو ''عذرا'' کے لقب سے یاد کی جاتی ہے اور آسمانوں کی رانی کہلاتی ہے- بعل کی زوجہ (۷۱) بھی تھی- اسی طرح فراعنہء مصر کے مختلف خاندانوں میں تخت و تاج اور خالص شاہی خون کے تحفظ کی خاطر بہن بھائی کی شادی کا دستور مذہبی طور پر رائج تھا- بعض حکمران بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں اور بھتیجیوں سے بیک وقت شادیاں کر لیتے تھے- اس طرح شاہی خون ایک ہی خاندان میں گردش کرتا رہتا- ''فرعون اخناطون'' کی دو بیویاں آپس میں پھوپھی بھتیجی تھیں- اہل مصر بڑے پیمانے پر سورج کی پوجا کرتے تھے اور سورج کو ''رب

رع'' کے نام سے پکارتے تھے- فراعین مصر اپنے آپ کو ''فرزند نیتھ'' کہتے تھے-

نیتھ ایک دیوی تھی جو لیبیا سے آئی اور اہل مصر میں مقبول ہوئی- اسے حکمرانوں کی ماں کہا جاتا تھا- مصر کے دیوی دیوتا آمن، رع، نیتھ، حورس، افیس، اوسیرس، حرکو یعنی ابوالہول وغیرہ جو ان کے مذہب میں بڑے بڑے خدا سمجھے جاتے تھے- اپنی جنسی عادات کے حوالے سے مشہور تھے- نیتھ کے بارے میں اہل مصر کا خیال تھا کہ وہ از خود پیدا ہوئی کنواری رہی- خاوند کے بغیر ایک بیٹے کو جنم دیا (۷۲)- جس کا نام ''سبک'' تھا- ''حورس دیوتا'' دیوتا ''آئرس'' اور ''دیوی آسس'' کے جنسی اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہوا اور فرعونوں کا محافظ سمجھا گیا- ''حورس دیوتا'' کے ساتھ بھی عشق کی ایک جنسی کہانی منسوب تھی- حورس دیوتا جس کی محبوبہ زمین پر زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی- آسمانوں سے کودا اور اپنی محبوبہ کی زنجیریں کاٹ کر اٹھا لے گیا- ''ربہ ایسس'' اہل مصر کی سب سے زیادہ پسندیدہ دیوی تھی- وہ کبھی تو ہنستے ہوئے بچے کی صورت میں ظہور کرتی اور کبھی ماں بن جاتی- لیکن اس کا سب سے مقبول روپ اس کا عنفوان شباب تھا- جس میں وہ جنسی خواہش کے لیے دیوانی نظر آتی اور نوجوان لڑکی بن جاتی- ''ربہ ایسس'' کی مورتیاں ہر روپ میں دستیاب ہوتیں- ماں کے روپ میں وہ بچے کو دودھ پلاتی ہوئی دکھائی جاتی تو نوجوان لڑکی کے روپ میں عشق کرتی ہوئی- ربہ ایسس کے مندر میں ہیجڑے رہتے تھے جن کے ساتھ زائرین ہم جنس پرستی کرتے تھے- مصر کے اس وقت کے سب سے بڑے شہر سکندریہ کے شراب خانوں میں عورتیں بالکل عریاں رقص کرتیں اور ربہ ایسس کے گیت گاتیں- بابل کی مقبول ترین دیوی زہرہ کی پرستش مصر میں بھی کی جاتی تھی- یہاں اس کے دو نام تھے- ''بونو'' اور ''دوناؤ''- ''بونو'' غروب آفتاب کے وقت طلوع ہونے والے زہرہ کا نام تھا اور ''دوناؤ'' صبح کاذب کے وقت آسمانوں پر طلوع ہوتی- ''بونو'' اور ''دوناؤ'' عشق کی دیویاں تھیں اور اہل مصر میں مقبول تھیں- مصر کا مقدونی حکمران بطلیموس عاشق مزاج دیوانہ تھا- وہ شب و روز بے فکری کے عالم میں شراب پیتا اور اپنی محبوبہ کو مسرور کرنے کے لیے بانسری بجاتا تھا- بطلیموس کی بیٹی قلوپطرہ، بطلیموس کے بیٹے بطلیموس جونیئر کی بیوی بھی تھی اور بہن بھی- قلوپطرہ جس کے حسن اور جنسیت پسندی کی داستانیں آج بھی لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں اور جس نے صرف اڑتیس سال کی عمر میں خودکشی کر لی تھی- مصر کی مطلق العنان ملکہ تھی- جس کے عشق

میں روم کا ''سیزر'' دیوانہ تھا اور دونوں کی داستان محبت نے تاریخ میں ایک عظیم کہانی کا روپ دھارا۔ قلوپطرہ نے اپنے بھائی کو جو اس کا خاوند بھی تھا، زہر دے کر مروا دیا۔ مصریوں کی ''اوسیرس دیوی'' نیکی کی درخشاں قوت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن حسن پسند تھی۔ مصری اپنے دیوی دیوتاؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو برحق نہ سمجھتے تھے (۷۳) اور اپنے مذہب میں انتہائی سخت اور متشدد سمجھے جاتے تھے۔ ان کی کرخت مزاجی کی جہاں اور بہت سی وجوہات تھیں وہاں ان کا اپنی لاشوں کو ممیاں بنا کر گھر کے کمروں میں محفوظ کرنے کا عمل بھی کارفرما تھا۔ اس طرح لاشوں کے ساتھ رہتے رہتے ان کے مزاجوں میں عجیب طرح کی خشکی اور بدخلقی پیدا ہو گئی تھی۔

مصر جو ماضی میں انسانی تہذیب کا ایک بہت بڑا گہوارہ تھا۔ عرصہء دراز تک ظلم، ناانصافی اور غیر انسانی عادات کے حوالے سے دنیا میں قائم رہا۔ قرآن اور بائیبل نے جہاں اہل مصر کی غیر متوازن زندگی کا نقشہ بار بار کھینچا وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مصری خواتین جنسی ہوس کے معاملہ میں اہل بابل سے پیچھے نہیں تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام جو انتہائی حسین وجمیل نوجوان تھے، عزیز مصر کے پاس ایک غلام کی حیثیت سے فروخت ہو کر آئے اور جنہیں دیکھتے ہی مصر کی جنس زدہ خواتین پاگل ہو گئیں اور انہوں نے بے اختیار ہو کر اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ عزیز مصر کی بیوی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ اپنے آپ میں نہ رہ سکی اور بالآخر ایک روز حضرت یوسف علیہ السلام کو اکیلے کمرے میں گھیر لیا اور یعقوب علیہ السلام کے اس خوبصورت بیٹے کو اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا۔ لیکن ایک پیغمبر کے کردار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لباس کو پھاڑنا چاہا لیکن باہر سے بروقت آنے والے عزیز مصر اور اس کے رشتے دار نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ جس پر عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام پر جھوٹا بہتان دھر دیا کہ یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس بہتان کے نتیجے میں حضرت یوسف علیہ السلام کئی سال تک مصر کی جیل میں رہے۔

یہاں ہمارا مقصد مصر کی تاریخ درج کرنا نہیں بلکہ اس ماحول کا اجمالی جائزہ پیش کرنا تھا۔ جو ماضی کے جنس زدہ مذاہب نے انسانی معاشرے پر طاری کر دیے تھے۔ ماضی میں تقریباً آج سے ڈھائی تین ہزار سال قبل انسانی تمدن انتہائی غیر متوازن انداز میں اپنے عروج پر تھا۔ مصر، بابل، ایران، ہندوستان، چین، یونان، فلسطین وغیرہ بڑی پرشوکت سلطنتیں تھیں اور ابھی تک مغرب کے

بہت سے علاقوں میں باقاعدہ تمدن کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ البتہ انگلستان، فرانس، اٹلی، ترک اور یونان براعظم یورپ کے وہ علاقے تھے۔ جہاں نہ صرف تہذیب وتمدن پنپ رہے تھے۔ بلکہ یونان اور یونان کے طفیلی ممالک اپنے تمدن کے عروج پر تھے جبکہ امریکہ ابھی تک زمین کے نقشے پر دریافت ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں ہمارے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ کس طرح ماضی میں ذہین لوگوں نے مذاہب وضع کیے اور مذاہب نے کس طرح متواتر کوششوں سے انسانی نیک فطرت کو غلیظ شیطانی فطرت میں بدل دیا۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ یہ مذاہب ہی تھے جنہوں نے سیکس کی باقاعدہ تبلیغ کی اور انسان کی اس فطری ضرورت کو اصل مقصد یعنی افزائش نسل کے خیال سے ہٹا کر محض لذت، سرور اور سکون کا ذریعہ بنایا۔ گویا ہم یہی کہنا چاہتے ہیں کہ مذاہب عالم نے انسان کو ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت بھٹکایا اور گمراہ کیا۔ ہاں! البتہ انبیاء علیہم السلام وقتاً فوقتاً انسان کو اس غلط راستے پہ چلنے سے منع کرتے رہے۔ کیونکہ جذبہء جنس کا غلط استعمال ایک معمولی خامی نہیں۔ بلکہ پورے معاشرے کا تمام نظام درہم برہم کرنے کا باعث ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہوتی رہی کہ انبیاءؑ کی وفات کے بعد وہی ذہین لوگ جو لوگوں کو گمراہ کیا کرتے تھے انبیاءؑ کے پیغام کو بدل دیتے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بائبل مقدس کے حوالے سے بیان کریں گے۔ اگر بات کو مزید واضح کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں کہہ دینا بہتر ہے کہ ایک طرف انبیاء علیہم السلام، ان کے حواری اور اصحاب کی مختصر جماعت تھی جس کی راہنمائی ''حسن آخر'' یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھی اور دوسری طرف بدبخت ذہین لوگوں یعنی مذہبی پیشواؤں، کاہنوں، ساحروں، شامنوں، پنڈتوں اور پروہتوں کی فوج ظفر موج تھی جن کی زمام اختیار ابلیس کے ہاتھ میں تھی۔ ابتدائے شعور کے بعد انسان جس طرح بتدریج ذہین ہوتا چلا گیا۔ عام زندگی کی سہولیات بڑھتی چلی گئیں۔ تمدن بنتے چلے گئے اور معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طاقت ابلیس سے زیادہ تھی۔ لہٰذا مقابلہ برابر کا نہ تھا اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا کہ اس کے پیغام کو ذہین لوگ کاہن، ساحر اور پروہت بدل نہ سکیں۔ لہٰذا دنیا نے ایک ناممکن العمل اور عجیب وغریب معجزہ دیکھا کہ قرآن حکیم ابلیس کے حملوں سے بچا رہا اور یوں قرآنی تعلیمات جو حسن بسیط کی طرف سے انسان کی راہنمائی کے لیے آتی رہیں۔ تاحال اپنی اصلی شکل میں انسانوں کے سامنے موجود ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایک گروہ نے

اس خیرِ کثیر کے خزانے کو اپنے حجروں میں چھپا رکھا ہے اور خود کو اس کا وارث و امین بنا کر عام انسانوں کو دیدہ دانستہ بھلائی سے محروم کر رکھا ہے۔

مصر براعظم افریقہ کا سب سے بڑا ملک تھا۔ اسی طرح بابل ایشیاء کی عظیم ترین سلطنت تھی۔ ایشیا میں بابل کے ساتھ ساتھ مزید جو تہذیبیں آباد تھیں۔ ان میں حتی، اشوری، چینی (Kathy) ایرانی اور ہندوستانی تہذیبیں پرشوکت اور قدیم تھیں۔

ہندوستان کے جنسی عقائد

حتی اور اشوری تہذیبیں بابل کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے جنسی عقائد سے متاثر تھیں (۷۴)۔ ایران میں سورج کے پجاری زمین اور سورج کو میاں بیوی سمجھتے تھے اور چینی تہذیب (۷۵) جہاں کنفیوشس جیسا نیک طینت مصلح گزرا دیوی دیوتاؤں کو ماننے والی قوم تھی۔ خیالی اژدہے کی پوجا کرتی تھی اور انتہائی ناجائز جنسی عقائد کی مالک تھی۔ ان کے علاوہ ہندوستان ایک ایسی سرزمین تھی جہاں بدھ مت، ہندومت اور جین مت کے پیشواؤں نے قوم کی رگ و پے میں جنسیت کا زہر اتار رکھا تھا۔ اہل ہند کی معاشرتی حالت اس لیے بھی قابل رحم تھی کہ یہاں انسانی طبقات کا سب سے بدترین نظریہ پایا جاتا تھا۔ اہل ہند جو خدا کو بھگوان، برہمو دیوتا، رام، ایشور یا پرماتما کہتے ہیں۔ اس عقیدے کے قائل تھے کہ تمام انسان برہمو دیوتا کے جسم کے حصوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ برہمو دیوتا کے ''سر'' سے برہمن ''بازوؤں'' سے کھشتری ''پیٹ'' سے ویش اور ''پیروں'' سے شودر پیدا ہوئے ہیں۔ اس طبقاتی نظام کے نتیجے میں ظلم و استبداد کا پیدا ہو جانا لازمی بات تھی اور یوں برہمن جو مذہبی عقائد بناتے تھے، سب سے افضل سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بعد کھشتری (کھتری) نظام حکومت چلاتے تھے اور برہمنوں کے مذہبی عقائد کو تلوار کے زور سے منواتے تھے۔ ویش خوراک پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے اور شودر تمام لوگوں کی خدمت (سیوا) کرنے پر مجبور تھے۔ ذات پات کی اس تفریق سے جو شاید کبھی نیک مقصد کے لیے کی گئی ہو۔ ہندوستان میں عجیب و غریب ماحول پیدا ہو گیا تھا اور ہر طبقہ اپنے اپنے طور پر ابلیسی قوتوں کا آلہء کار بن گیا تھا۔ لیکن یہاں بھی جس چیز نے سب سے زیادہ انسانیت کو غیر متوازن کیا''

پروہتوں کے پیش کردہ شہوانی عقائد تھے۔ ''کرشن جی'' جو اپنے دور کے ایک مخلص مصلح تھے اسی طرح مہاتما بدھ جو ایک دردمند دل کے مالک نیک آدمی تھے۔ جب دنیا سے رخصت ہو گئے تو بعد والوں نے ان کے نظریات کو ایسی ایسی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا کہ انسانیت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اہل ہند (ہندو) بھی دیوی دیوتاؤں کو مانتے تھے اور آج تک پتھر کی مورتیوں کو پوجتے ہیں، اپنے مذہبی پیشواؤں کے عقائد اور احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور انسان کی اس فطرت یعنی جذبۂ جنس کے غلط استعمال کے مرتکب ہوتے تھے۔ اہل ہند کی ایک دیوی جس کے بے شمار روپ تھے اور جو مختلف معاملات میں مختلف روپ دھار کر ظہور کرتی تھی۔ ہندوستانیوں کے عقائد پر سب سے زیادہ اثر انداز تھی۔ آج بھی ہندومت کے ماننے والے نہ صرف اس دیوی کی پرستش کرتے ہیں بلکہ ان تمام جنسی عقائد کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو ان کے مذہبی پیشوا دیوی دیوتاؤں سے منسوب کر کے انہیں بتاتے ہیں۔ ہندوستان کی یہ مشہور دیوی پاربتی، درگا، لکشمی، اوتا، گوڑی، شیاما، رکت ونتی، گائیتری، بھوت نائیگی، مہاکالی، مہاسری، چامنڈا، مہیش پروتی، جگد گوڑی، مکت کیشی، ساوتری، کومڑی، کشیابدہی تن جا، پدما، کملا، ہیرا، اندرا اور مادھوری (۷۶) کے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اسی دیوی نے ''دیوتا درگ وئیت'' کو غصے میں آ کر قتل کر دیا تھا۔ جس وجہ سے اسے ''درگا'' کہا جاتا ہے۔ اس کا سب سے مشہور نام پاربتی ہے۔ اسے ہندوستان کی ''مہادیوی'' سمجھا جاتا ہے اور یہ ''شوجی'' کی بیوی ہے۔ محبت اور رحم دلی کی صورت میں یہ ''اتا'' دیوی بن جاتی ہے جو روشن اور خوبصورت ہے۔ لیکن یہ جب زرد اور چمکیلی ہوتی ہے تو گوڑی کہلاتی ہے۔ ناراضگی کی سیاہ رنگت میں یہ ''شیاما'' بن جاتی ہے۔ جب وہ انتہائی غصے میں خونخوار دانتوں والی شکل اختیار کرتی ہے تو اسے ''رکت ونتی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ برہنہ ہو کر اپنے جنسی اعضاء کی نمائش کرتی ہے اور اپنے پجاریوں کو شہوانیت کا حکم دیتی ہے۔ اس شکل میں اسے کومڑی کہا جاتا ہے اور وہ جب بدروحوں کی سردار بن کر خوف و ہراس پھیلاتی ہے تو ''بھوت نائیگی'' کہلاتی ہے۔ اس کی ایک انتہائی خوفناک شکل ''مہاکالی''، ''مہاسری''، ''چامنڈا''، ''مہیش پروتی''، ''جگد گوڑی'' اور ''مکت کیشی'' کے ناموں سے موسوم ہے۔ ان ناموں کے ساتھ وہ شدید ناراضگی اور غصے کی حالتوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اپنے کئی ہاتھوں والے کالے اور خوفناک جسم پر سیاہ ناگوں

کو لپیٹ لیتی ہے اور گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہن لیتی ہے۔لکشمی وشنو دیوتا کی محبوبہ اور بیوی ہے۔کنول کا پھول لیے سمندر سے پیدا ہوئی ہے۔اسے سمندر کی بیٹی بھی کہا جاتا ہے۔اس نے دوبار جنم لیا ہے۔ایک بار ''سیتا'' اور ایک بار ''رکمنی'' کے روپ میں۔اسے ''پدما'' اور ''کملا'' بھی کہتے ہیں۔''ساوتری'' بھی عاشق مزاج ہے۔یہ اپنے محبوب ''سیتادان'' کو موت کے دیوتا ''یم'' کے پنجے سے چھڑا لائی ہے۔اسے ''گائیتری'' بھی کہتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے نام ہیں۔جن سے یہ مختلف حالتوں میں پہچانی جاتی ہے۔مثلاً ''پھل ماتا'' (چیچک کی دیوی) وغیرہ۔

مہاتما بدھ

اہل ہند کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ایشور (خدا) کبھی کبھی انسانوں کی شکل میں ظہور کرتا ہے۔مثلاً ''سری رام چندر جی''، ''کرشن جی'' اور ''مہاتما بدھ'' ایشور کے اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ہوسکتا ہے ایشور کے یہ اوتار اپنے دور میں پیغمبر رہے ہوں۔کیونکہ زمین پر ہزاروں کی تعداد میں اللہ کے انبیاء وارد ہوتے رہے ہیں۔لیکن یہ محض میرا ذاتی خیال ہے۔کنفیوشس اور سقراط کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے کیونکہ ان لوگوں کے کردار اور نظریات میں بھی پیغمبرانہ دعوت پائی جاتی ہے۔میرا خیال ہے کہ اہل ہند نے خدا کے ان برگزیدہ بندوں کو خدا کا اوتار سمجھ لیا اور ان کی وفات کے بعد پوجا شروع کر دی۔یہ مہاتما بدھ ہی تھے۔جنہوں نے ڈھائی ہزار سال قبل ذات پات اور طبقاتی نظام کے خلاف آواز اٹھائی اور مساوات کی بنیاد رکھی۔جس طرح مشرق وسطیٰ اور یورپ میں عیسیٰ کی تبلیغ دور دور تک پھیلی اس طرح مہاتما بدھ کا مذہب ہندوستان، برما، سری لنکا، تبت، نیپال، چین، سیام، کمبوڈیا، ویت نام، فلپائن، جاپان، کوریا اور منگولیا تک پھیلتا چلا گیا۔بدھ مت وحدت الٰہی کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ برہمہ کے علاوہ کسی کی الگ ذات اور ہستی نہیں۔

اہل ہند کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین پر کوئی خاص واقع رونما ہوتا ہے تو چندر ماں (چاند) کو گرہن لگتا ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ ''سوریا دیوتا'' اور ''برہما'' دیوتا دوبدو جنگ کرتے ہیں اور چاند پر اندھیرے کی چادر ڈال دیتے ہیں۔اس اندھیرے میں ''چندر ماں'' یا ''سوم دیوتا'' زمین پر پیدا ہونے والی روحوں کو دیکھتا ہے اور جسے اپنے لیے پسند کرتا ہے اس پر گرہن کا نشان لگا دیتا ہے۔ہندوؤں کا عقیدہ

ہے کہ وہ خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کو پسند کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کے جسم پر گرہن کا نشان لگا دیتا ہے۔

بدھ مت اور ہندو مت کا مذہب شہوانیت

شاستروں میں لکھا ہے کہ سوم دیوتا نے پرانے وقتوں میں کبھی اپنے گرو ''برہسپت'' کی بیوی ''سندر تارا'' پر عاشق ہو کر اسے بہکایا اور اپنے گھر میں ڈال لیا۔برہسپت گرو دیوتاؤں کا استاد بھی ہے اور گرو بھی۔جب دیوتا غصے (کرودھ) میں ہوتے ہیں تو گرو برہست انسانوں کی سفارش کرتا ہے۔''سوم دیوتا'' جب گرو برہسپت کی تارا کو بھگا کر لے گیا تو برہسپت نے اپنے حامی دیوتاؤں کو بلایا۔جن میں ''اندر دیوتا'' سب سے آگے تھا۔مگر ''سوم دیوتا'' نے ''تارا'' کو دینے سے انکار کر دیا۔اس کی حمایت میں ''اوشنس''، ''اودر''، ''وانو'' اور کئی دوسرے دیوتا اکٹھے ہو گئے اور تارا کے لیے دیوتاؤں میں بڑی خوفناک جنگ ہوئی جسے ''تارکا نے'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس جنگ سے دھرتی کانپ اٹھی۔ آخر ''برہما دیوتا'' نے التجا کر کے لڑائی بند کروائی اور ''سوم دیوتا'' سے کہا کہ وہ ''تارا'' کو اس کے پتی (شوہر) ''برہسپت'' کے حوالے کر دے۔''سوم دیوتا'' نے مغموم دل کے ساتھ ''برہسپت'' کی بیوی اسے لوٹا دی۔مگر اس اثنا میں ''تارا'' حاملہ ہو چکی تھی۔اس نے ایک بڑا خوبصورت بچہ جنا جس پر ''برہسپت'' اور ''سوم دیوتا'' میں بچے کی ملکیت کا اختلاف پیدا ہو گیا۔اس مسئلے کے تصفیے کے لیے ''برہما دیوتا''...... ''تارا'' کے پاس گئے اور ''تارا'' سے بچے کے باپ کا نام پوچھا ''تارا'' نے کہا کہ وہ ''سوم دیوتا'' سے حاملہ ہوئی تھی۔تب وہ بچہ ''سوم دیوتا'' کا بیٹا کہلایا اور اس کا نام ''بدھ'' رکھا گیا۔

چونکہ تارا سوم دیوتا سے واپس لی گئی تھی۔اس لیے جب ''سوریا دیوتا'' اور ''برہما دیوتا'' (جو تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے) آپس میں لڑتے ہیں اور چندر ماں (چاند) پر اپنا سایہ ڈال دیتے ہیں۔تو اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ''سوم دیوتا'' دھرتی پر نظر ڈالتا ہے اور جس عورت کے پیٹ میں خوبصورت لڑکی پل رہی ہو اس پر اپنی مہر لگا دیتا ہے۔سوم دیوتا ''سندرتا کالو'' بھی ہے۔اس نے ''دکش'' کی ستائیس لڑکیوں سے شادی کی۔وہ اپنی سب سے زیادہ راتیں ''اوہنی'' کے ساتھ بسر

کرتا ہے جو ان میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ چنانچہ اپنی دوسری بیٹیوں کی شکایت پر "دکش دیوتا" نے "سوم دیوتا" کو بددعا (شراپ) دی ہے کہ وہ زوال پذیر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ وہ حالت گرہن میں جن لڑکیوں پر اپنے نشان لگاتا ہے۔ وہ لڑکیاں پیدا ہونے کے بعد اگر کنواری رہیں اور بھگوان کی "نرتکی" (داسی) بن جائیں تو "سوم دیوتا" کی دست درازی سے محفوظ رہتی ہیں اور اٹھارہ بیس سال کی عمر میں کسی رات سپنے میں بھگوان سے پھل ہو جاتی ہیں۔ ہر کنواری گرہن زدہ لڑکی ایک بند کتاب کی طرح ہوتی ہے اور وہ بند کتاب صرف بھگوان ہی کھولتا ہے۔ ایسی لڑکی اگر بھگوان کے علاوہ کسی کے بستر پر جائے تو اس سے زندگی چھین لی جاتی ہے (۷۷)۔"

اہل ہند کا شہوت پسند معاشرہ

اہل ہند کا یہ عقیدہ بدھ مت کے ماننے والوں میں پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کی منصوبہ بندی سے داخل ہوا اور دیوی دیوتاؤں کے یہ مخرب اخلاق قصے سادہ لوح عوام کی زندگیوں میں اتار دیئے گئے۔ ان عقائد کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ جس مذہب میں خدا اور دیوی دیوتا ایک دوسرے کی بیویوں اور بہنوں پر بری نظر رکھتے ہوں اس مذہب کے ماننے والوں کا زمین پر کردار کس طرح کا ہو سکتا ہے۔ ماضی میں ہندوستانی معاشرہ کس قدر جنس زدہ تھا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے ہندوستانی مذاہب کی یہی تصویر کافی ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے جب پہلے پہل برصغیر کی سرزمین پر انسان نے شعور کی آنکھ کھولی ہوگی تو اس کی عادات فطرت کے قریب ترین ہوں گی۔ لیکن بعد میں کچھ عقل مند اور مفاد پرست لوگوں نے انسانی فطرت کی جنسی جبلت سے ناجائز اٹھایا اور پورے معاشرے کو قحبہ خانے میں بدل دیا۔ یہی لوگ ابلیس کے نمائندہ تھے۔ جنہوں نے انسان کی شعوری صلاحیتوں کو پنپنے سے روکا اور انہیں خواہشات کی غلامی کا درس دیا۔ نتیجتاً انسانی معاشرہ غیر متوازن ہو کر ایسا معاشرہ بن گیا جو حیوانی معیار سے بھی گرا ہوا تھا۔ ہندوستان میں دیوی دیوتاؤں کی عبادت گاہیں، مندر اور آشرم، جسم فروشی کے اڈے بن گئے۔ پروہت جس لڑکی کو چاہتے مندر کی دیوداسی بنا لیتے۔ گرہن زدہ لڑکیاں تو ویسے بھی مندروں کی ملکیت تصور کی جاتیں اور چاند

دیوتا کی دست درازیوں سے بچانے کے بہانے سے پنڈت اور پروہت ایسی لڑکیوں کو اپنے حجرۂ خاص میں محفوظ کر لیتے۔ مندروں کی دیوداسیاں جو دیوتاؤں کی کنواریاں کہلاتیں۔ دیوتاؤں کے نمائندوں یعنی پروہتوں اور پجاریوں کے بستروں کی زینت بنتیں۔ صرف سومنات کے مندر میں سینکڑوں دیوداسیاں ہر رات بیسیوں حجروں میں زنا کی مرتکب ہوتیں۔ پروہتوں اور پجاریوں کے مذہبی احکامات پورے معاشرے میں آکٹوپس کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور کوئی گھر جنسی بے راہ روی کے مظاہروں سے محفوظ نہ تھا۔ ہندوستان کی یہ حالت زار جو تاریخ کی کتابوں میں عام دستیاب ہے مسلمانوں کے آنے سے پہلے تک رہی۔ ہندوستان کا پورا معاشرہ ذات پات، ظلم و استبداد اور جنسی بے راہ روی کا شکار تھا اور برہمنوں کے مذہبی ڈنڈے تلے سانس لینے والی سادہ لوح ہندوستانی قوم ایک بیمار روح کی طرح سسک رہی تھی۔ معاشرہ بے حد غیر متوازن تھا اور انسانیت اپنے وجود پر شرمندہ تھی۔

اب تک ہم نے اہل مشرق کی بڑی بڑی تہذیبوں کا سرسری سا جائزہ پیش کیا ہے۔ جس کی روشنی میں پورے مشرق کی ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان نے دنیا میں آ کر ایک کے بعد ایک منزل طے کی اور اپنے ابتدائی تمدنوں میں سب سے زیادہ جنسی خواہشات کو مذہبی رنگ میں قبول کیا۔ اہل مشرق کی مکمل تصویر دیکھنے کے بعد اگر مغرب کا اجمالی خاکہ بھی ملاحظہ کر لیا جائے تو یقیناً کرۂ زمین کے ابتدائی انسانی ماحول کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یوں ہم پورے کرۂ زمین کی ذہنی صورت حال دیکھنے کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ موجودہ معاشرتی بگاڑ، جنسی ہوس، لڑائی اور فساد، بدامنی، بھوک، افلاس اور دیگر تمام غیر فطری رویے کیونکر انسانیت کے منہ پر چھا گئے۔ گویا ہم بڑی آسانی سے یہ خیال قائم کر سکتے ہیں کہ ابلیس اور ابلیسی قوتیں جو رحمان اور رحمانی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ کس طرح زمین کے حسین چہرہ کو بگاڑتی اور توازن کو نقصان پہنچاتی ہیں اور کیونکر ان خوفناک قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور کن ہتھیاروں سے اس شیطنت کا قلع قمع کر کے انسانی معاشرے کو متوازن اور حسین بنایا جا سکتا ہے۔

کرۂ ارض کی ساری تقسیم دو ہی حصوں، مشرقین اور مغربین یا مشارق اور مغارب میں کی جا سکتی ہے اور مشرق یعنی ایشیا اور مصر وغیرہ کے بعد اہل مغرب کا طرز زندگی، بودو باش، عادات

مذاہب اور عقائد ہمیں انسانی تمدن کے ابتدائی حالات آسانی سے سمجھا سکتے ہیں۔ مغرب
بڑے ممالک جو اس وقت معروف تھے' اٹلی اور یونان ہیں۔ لیکن یورپ کے دور دراز علا
انگلستان' جرمن وغیرہ جو اس وقت مشہور اور طاقت ور نہیں تھے' بھی زمین پر موجود تھے۔ امریکہ
پندرھویں صدی عیسوی میں "کولمبس" نے دریافت کیا۔ ماضی بعید میں ایک سرسبز و شاداب جزی
نظیر جزیرہ تھا۔ جس میں انسانوں کے وہ قبائل آباد تھے جو ابھی شہری اور تمدنی زندگی سے ناآ
تھے۔

یونان کے مذہبی اور جنسی عقائد (۷۸)

یونان عیسیٰؑ کی آمد سے قبل دنیا کا عظیم ترین ملک تھا۔ یونانی جو پرشوکت تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ' علم و ادب اور فلسفہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اپنے وقت میں روئے زمین کی باعزت ترین قوم مشہور ہوئے۔ یونان کا سکندر اعظم جس نے دنیا کے گلوب کو تلوار کی نوک پر رکھ کر گھمایا جو دیوار چین کے پتھروں سے آ ٹکرایا اور جس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر پوری دنیا کو فتح کرنے' خواب دیکھا۔ تاریخ کا ایک بہت بڑا کردار ہے۔

سکندر اعظم کے دور میں یا اس کے آس پاس یونان نے فلسفہء حکمت اور دانائی میں ایسے ایسے کمالات کیے اور یونانی مفکرین نے ایسے ایسے نظریات اور افکار پیش کیے جس کا بھرپور استعمال آج بھی ہمارے علوم و فنون میں کیا جاتا ہے۔ اس قدر عقل مند اور مہذب ہونے کے باوجود عا یونانیوں کے مذہبی عقائد بابل' ہندوستان یا مصر وغیرہ سے مختلف نہیں تھے۔ اہل یونان بھی دیوی دیوتاؤں کے ماننے والے تھے اور ان کے دیوی دیوتا بھی ایک دوسرے سے عشق و محبت کرتے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ اہل یونان بھی دوسری بدقسمت قوموں کی طرح اس وقت کے منحوس جنسی عقائد سے نہ بچ سکے اور اپنے غیر فطری اعمال سے زمین کی جنت کو جہنم بناتے رہے۔ یونانیوں کے عقائد میں تمام کائناتی قوتیں دیوی دیوتاؤں کا درجہ رکھتی تھیں۔ "ہرکولیس" طاقت کا دیوتا تھا۔ جس نے کرۂ ارض کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جب وہ ایک کندھے سے دوسرا بدلتا تو زمین پر زلزلہ برپا ہو جاتا۔ "ہرکولیس' بھی زمین کی ایک حسین لڑکی پر عاشق ہو گیا

تھا۔ یونانیوں کا "پرومیتھوس" دیوتا انسانوں کا ہمدرد تھا اور نوجوان برہنہ لڑکیوں کے درمیان رہ کر خوش ہوتا۔ "پرومیتھوس"...... نے انسان کو آگ کے استعمال کا آسمانی راز بتایا لہٰذا خداوند زیوس کے حکم سے پرومیتھوس......کو کوہ قاف کی سب سے اونچی چوٹی پر زنجیروں سے باندھ دیا گیا اور اس پر ایک گدھ متعین کر دیا گیا۔ جو دن بھر "پرومیتھوس" کا کلیجہ نوچ نوچ کر کھاتا۔ البتہ رات ہوتی تو زخم خود بخود بھر جاتے۔ اس اذیت ناک سزا کے باوجود "پرومیتھوس" نے زیوس سے معافی نہیں مانگی۔ یونانیوں کے دیوتا کس قدر فحش اور جنس زدہ تھے اس کا اندازہ "ہومر" اور "ہسیاڈ" کے جنسی قصوں سے ہوتا ہے۔ یونانیوں کے خدا......ہم جنس پرست بھی تھے۔ خداوند "زیوس" کا محبوب "گنی میڈ" دیوتا تھا۔ "اپالو" کا "ہیاستھ"......اور "ہرکولیس" کا "ہائی لیز"۔ یونانیوں کی غیر اخلاقی طرز زندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشترکہ بیویوں کے قائل تھے۔ مشہور پاکستانی کیمونسٹ "سبط حسن" نے اپنی کتاب "موسیٰ سے مارکس تک" میں افلاطونی نظام حکومت کا منصوبہ یوں تحریر کیا ہے۔

> "نوجوان عورتوں کو تعلیم و تربیت دی جائے۔ یہ عورتیں بلا کسی استثناء کے مردوں کی مشترکہ بیویاں ہوں۔ اسی طرح ان کی اولاد بھی کسی ایک فرد کی اولاد نہ سمجھی جائے۔ بلکہ پورے حکمران طبقے کی اولاد سمجھی جائے۔ نہ والدین کو معلوم ہو کہ ان کا اپنا بچہ کون سا ہے اور نہ اولاد کو خبر ہو کہ ان کے ماں باپ کون ہیں۔ تندرست مردوں اور عورتوں کے درمیان مباشرت کی ہمت افزائی کی جائے۔"

یونان کے مشہور ڈرامہ نگار "ارسطوفینس" نے اپنے ڈراموں میں کیمونزم کا مذاق اڑایا اور یونانی معاشرے میں عورتوں اور مردوں کی عیش پرستیوں کا نقشہ پیش کیا۔ یونان کے دیوی دیوتاؤں میں "ڈلفی" کو غیب کی خبریں بتانے والا سمجھا جاتا ہے۔ جس کے مندر میں جا کر عورتیں اپنی محبت کے لیے منتیں مانگتی تھیں۔ اہل بابل کی "زہرہ" یا "ایشتار" دیوی کے مقابلے میں یونان کی "وینس دیوی" خاصی مقبول تھی۔ "وینس" حسین اور دلکش تھی اور عاشق مزاج لوگوں کی پسندیدہ دیوی تھی۔ یونانی دیومالا میں "وینس دیوی" کے ساتھ منسوب جنسی سفاکی کی ایک دلچسپ داستان تاریخ میں ملتی ہے۔ اصنامی روایات کے مطابق شاہ یونان کی سب سے چھوٹی اور حسین بیٹی "سائیکی" کے غیر معمولی حسن کی شہرت آسمانوں پر پہنچی تو آسمانوں کی سب سے خوبصورت دیوی وینس نے اپنے

آسمانی بیٹے ''کیوپڈ'' کو بھیجا کہ وہ جا کر زمین سے یونانی بادشاہ کی لڑکی ''سائیکی'' کو شکار کر لائے۔
''کیوپڈ''، ''جیوپٹر'' دیوتا کے نطفے سے پیدا ہوا تھا- کیونکہ ''وینس دیوی'' جیوپٹر دیوتا سے بھی ہم
بستر ہوتی رہتی تھی- کیوپڈ جس کے ہاتھ میں کمان اور کمر پر ترکش تھا- جب زمین پر پہنچا تو سائیکی کا
حسن دیکھ کر تیر چلانا بھول گیا اور الٹا خود سائیکی کے حسن کا شکار ہو گیا- وینس نے غصے میں آ کر
سائیکی کو کوہ المپس پر پھینکوا دیا- جہاں محبت کا مارا کیوپڈ اس کی حفاظت کرتا رہا- آخر کار سائیکی نے
وینس کی ایک کڑی شرط پوری کر کے کیوپڈ کو جیت لیا اور پھر جیوپٹر نے سائیکی کو شراب الوہیت پلا کر
آسمانوں کی غیر فانی اور ابدی مخلوق میں شامل کر لیا- جس کے بعد سائیکی بھی آسمانوں پر کیوپڈ کے
ساتھ رہنے لگی-

اہل یونان کا طبقہ علماء جن میں ''سقراط'' اور ''ارسطو''، ''دیو جانس کلبی'' اور ''فیثا غورث''
یونانیوں کے بھونڈی اور فحش کہانیوں کے سخت خلاف تھے- جبکہ عام یونانی قوم ان دیوی دیوتاؤں کو
مانتی اور انہیں کی سنت پر عمل پیرا ہوتی- یونان میں بڑے بڑے شراب خانے تھے جہاں دیوی
دیوتاؤں کے ننگے مجسموں کے سامنے یونانی رقاصائیں اپنے جسم کے نہاں گوشوں کی نمائش کرتیں
اور جنسی رقص پیش کرتی تھیں- ایتھنز کے بڑے بڑے مندروں میں پروہت لوگوں کو بتاتے کہ
دیوی دیوتاؤں کی خوشی جنسی اعضاء کی نمائش میں ہے- یونان کے ایک جزیرہ ''سپارٹا'' پر کیمونسٹوں
کی حکومت تھی- لیکن وہاں بھی جنسی بے راہ روی ایک مختلف رنگ میں حد درجہ بڑھی ہوئی تھی- سپارٹا
کے لوگ اپنی عورتوں کو کمروں میں بند رکھتے تا کہ ان کے نطفے سے خالص بچہ پیدا ہو- لیکن خود
دوسری عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے-

یونانی دیوتاؤں کی جنسی کہانیاں بھی اس دور کے دوسرے اصنامی مذاہب سے مختلف نہیں ہیں
اور یوں ثابت ہوتا ہے کہ اہل یونان بھی جنسی تسکین مذہبی فریضے کے طور پر حاصل کرتے تھے-
یہ تو تھی اہل یونان کے جنسی عقائد کی حالت جہاں تک یونانی معاشرے کا تعلق ہے تو جنسی
حوالے سے یونان کا معاشرہ بابل سے کسی طور کم نہیں تھا- سب سے بڑی برائی جو یونانیوں میں پائی
جاتی تھی وہ ہے سدومیت پرستی- تاریخ میں لکھا ہے کہ اہل یونان ہم جنس پرستی کی غلاظت کا انبار
تھے- یہاں تک کہ ان کے بڑے بڑے فلاسفر اس بیماری میں مبتلا تھے- ''ایموری ڈیرائن کورٹ''
اپنی کتاب ''جنس اور قوت'' میں لکھتا ہے:

''رومن عورتوں کی سماجی آزادی نے ایک اخلاقی انحطاط کی فضا میں جنم لیا- یونانی
عورتیں مردوں کی زن بیزاری سے اس درجہ بیزار تھیں کہ آخر الامر انہوں نے اپنے
معاشرے اور تہذیب کی بنیادوں کو تباہ و برباد کر دیا-''

یونان کے لوگ اہل بابل کی طرح سر عام جنسی اعمال سرانجام دینے کے عادی تھے- وہ کئی قسم
کے اعضائے تناسل کی پوجا کرتے تھے- شہر میں ''ہفسٹس'' کا ایک بڑا بت نصب تھا جس میں
''ھنسٹس'' ایک استادہ عضو تناسل والے گدھے پر سوار کوہ اولمپس سے اتر رہا تھا-
''افرودیتی دیوی'' کے معبد میں آنے والے زائرین کو نمک اور ایک عضو تناسل عطا کیے
جاتے تھے- افرودیتی جنسی آمادگی کی دیوی تھی- حتیٰ کہ ایک دیوتا کا نام ہی ''پرایاپس'' تھا-
یعنی...... ''استادہ عضو تناسل''- لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ''پرایاپس'' ''افرودیتی'' کا بیٹا ہے- اسے
باغوں کی سرپرست روح اور قبروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا- یونانیوں کی جنسی حالت زار کی تفصیل ایک
الگ کتاب کی متقاضی ہے- کیونکہ یہ اہل یونان ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانیت میں پہلی مرتبہ
جنسی بے راہ روی کے حق میں عقلی دلائل پیش کیے- ورنہ اس سے پہلے کی قومیں جنسی بے راہ روی کا
ارتکاب مذہب کی سند کے زیر سایہ کرتی تھیں-

یورپ کی مجموعی حالت

اہل یورپ نے بہت دیر بعد تہذیبی آنکھ کھولی- البتہ یونان جو یورپ کے ایک کنارے پر
واقع ہے- بہت پہلے عظیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہا- روم کا وہ حصہ جو یورپ کے ساتھ منسلک
ہے- ''سیزر'' کے زمانے میں خاصا مشہور ہوا- سیزر نے مصر کی ملکہ ''قلوپطرہ'' سے عشق کر کے شادی
کر لی تھی اور قلوپطرہ کی فوجوں کے ساتھ مل کر دور دور تک فتوحات کیں- عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے
بعد مذہبی حوالے سے دنیا کا مشہور ترین ملک بن گیا- روم جہاں اب اٹلی ہے- ابھی تک عیسائیت
کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے- شروع شروع میں عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی تبلیغ کی وجہ
سے رومیوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں جلد غلط جنسی عقائد سے باز آ گئے-
بائبل میں ہے-

"اسی سبب سے خدا نے انہیں گندی شہوتوں میں چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں نے اپنے طبعی کام کو خلاف طبعی کام سے بدل ڈالا۔ اسی طرح مرد بھی عورتوں سے طبعی کام چھوڑ کر آپس کی شہوت سے مست ہو گئے۔ یعنی مردوں نے مردوں کے ساتھ روسیاہی کر کے اپنے آپ میں اپنی گمراہی کے لائق بدلہ پایا (۷۹)۔"

اہل روم کے نام "پولس نبی" کے اس خط میں رومیوں کو نیکی پر چلنے اور گندے کام ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ روم کا ایک بڑا جزیرہ "کریٹ" قدیم زمانے میں اپنے تہذیبی عروج پر تھا۔ کریٹ میں دنیا بھر کی خوبصورت لڑکیاں جو دور دراز سے خرید کر یا اغواء کر کے لائی جاتیں۔ ایک بڑی منڈی میں فروخت ہوتیں۔ رومیوں نے چونکہ جلد دین عیسوی قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا رومیوں کے قدیم دیومالائی تصورات بھی عیسائیت کے عروج کے دور میں ختم ہو گئے تھے۔ لیکن جہاں تک رومیوں کے جنسی عقائد کا تعلق ہے۔ تحریف شدہ بائبل نے ایک بار پھر رومیوں کو عیسائی بنا کر مذہبی جنسیت میں ڈال دیا۔ عیسائیوں کے مذہب میں اگرچہ کھلم کھلا زنا کی تبلیغ تو نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ تحریف شدہ بائبل نے انسانی نفسیات کو جنسیت کی طرف مائل رکھا۔ رومی قوم کی جنس پرستی کی داستان بے حد طویل ہے۔ اس کے تفصیلی ذکر سے مضمون کے بے جا طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ رومیوں کے بعد یورپ کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں انگلستان، فرانس، جرمنی اور بقیہ یورپ کی مجموعی جنسی حالت زار پر نظر کرنا ہو گی۔ انگلستان جو صلیبی جنگوں میں سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ کیونکہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیر دل نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ برابر کی ٹکر لی اور عیسائیت کی گرتی ہوئی عمارت کو ناکام سہارا دیا۔ اگرچہ صفحہ زمین پر قدیم سے آباد ہے۔ لیکن وہاں کے لوگ شروع سے لے کر آج تک جنسی بے راہ روی سے نہیں بچ سکے۔ ماضی بعید میں انگلستان کی تہذیب قبائلی طرز کی تھی۔ وہاں کے لوگ بھیڑیں پالنے کا کاروبار کرتے تھے اور بھیڑوں کی اون بیچ کر زندگی کی گزر بسر کرتے۔ لندن کے اطراف میں دور دور تک پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہات تھے۔ برطانیہ کے نامور مفکر "ہابس" کا دعویٰ ہے کہ "ابتداء میں ہمارا معاشرہ فطری حالت میں تھا۔ حکومت جیسی کوئی شے موجود نہ تھی، نہ انصاف کا تصور تھا، نہ ناانصافی کا۔ جنگل کا قانون رائج تھا۔ ہر شخص کی جان خطرے میں رہتی اور کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔" "ہابس" نے اگرچہ یہ بات عام انسانی معاشرے کے لیے کہی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے ہی

معاشرے کا نقشہ کھینچتا ہے۔ کیونکہ بریفولٹ نے لندن کی سابقہ تہذیب پر مکمل کتاب لکھی۔ جس میں یہی کچھ درج ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک انگلینڈ میں یہ حال تھا کہ انتہا پسند پادری اعصاب تنفس کے خلل میں مبتلا دکھی اور پریشان عورتوں کو جادوگرنیاں کہہ دیتے اور انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے فتوے دے دیتے۔

لندن کے قریب "نیولنارک" (مانچسٹر کی ایک بستی) جو اپنی غیر انسانی حرکات کی وجہ سے مشہور تھی۔ ایک دو صدیاں پہلے تک رسوائے زمانہ رہی۔ جہاں افلاس، جہالت، توہم پرستی، بیماری اور زنا عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ عیسائیت قبول کرنے سے قبل انگلستان اور اس کے گرد و نواح کے ممالک کا باقاعدہ کوئی مذہب نہ تھا۔ سورج، چاند، ستارے، بجلیاں، بارشیں، زلزلے، پہاڑ، سمندر، دریا، جنگلی درندے، حشرات الارض وغیرہ وسطی یورپ کے دیوی دیوتا تھے اور ان کے یہ دیوی دیوتا اس زمانے کے دوسرے ممالک کے دیوی دیوتاؤں کی طرح غیر فطری جنسی رجحانات کے مالک تھے۔ جرمن قوم اس زمانہ میں وحشی قوم شمار ہوتی۔ جو آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے خون خرابہ اور فساد کرتی رہتی۔ جرمنوں میں اکیلی عورتوں کو پکڑ کر آبرو ریزی کرنے کا رواج پایا جاتا تھا۔ سپین کے لوگ بھی عیسائیت سے پہلے عجیب و غریب جنسی عقائد کے مالک تھے اور جانوروں کے جنسی ملاپ کی تصویریں اپنے گھروں کے در و دیوار پر سجا کر رکھتے۔ سپین کے شہر التامیرا کی غاروں سے ایسی مصوری دریافت ہوئی ہے جس میں مردوں اور عورتوں کی انتہائی فحش تصاویر ملی ہیں۔ غرض یورپ بھی اس زمانے کی دوسری اقوام کی طرح اسی ذہنیت کا شکار تھا۔ جسے ہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قدیم امریکہ

مغربی ممالک میں امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ملک ہے۔ امریکہ کا اقتدار دنیا پر ۱۹۴۵ء کے بعد شروع ہوا اور امریکہ نے نصف صدی میں یہ ثابت کیا کہ وہ دنیا کی ذہین ترین اور طاقتور قوم ہے۔ امریکہ کی اس بے پناہ طاقت کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ اس جدید ٹیکنالوجی کا ہے جس کے سامنے فی الحال پوری دنیا معذور ہے اور جو ان کے ذہین ترین

سائنس دانوں اور مفکرین کی مرہون منت ہے۔ امریکی تہذیب ایک نومولود تہذیب تصور کی جاتی ہے۔ کیونکہ امریکہ جسے ایک ہسپانوی سیاح کولمبس نے پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں دریافت کیا۔ اس سے پہلے مہذب دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ایک قبائلی طرز کی سرزمین تھی۔ دراصل امریکہ باقی براعظموں سے ہٹ کے ایک الگ براعظم ہے۔ جو خود بھی ایک بہت بڑا جزیرہ ہے اور اس کی ریاستیں بھی مختلف جزائر کا مجموعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دور کے براعظموں پر بسنے والے انسانوں کی امریکہ تک رسائی آسانی سے نہ ہو سکی۔ امریکہ کی یہ حیثیت کہ وہ جنگلوں کی قبائلی زندگی سے نکل کر مہذب زندگی میں چند سو سال قبل گویا حال ہی میں آیا ہے۔ ماہرین عمرانیات، ماہرین انسانیات اور ماہرین ارضیات کے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ براعظم امریکہ پر پہلا انسان ہزاروں سال پہلے ایشیا سے ہجرت کر کے پہنچا ہوگا۔ لیکن یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ براعظم امریکہ پر الگ سے انسانی زندگی کا ارتقاء ہوا ہے۔ ابتدائی پلیوسٹین دور میں یعنی چھ لاکھ سال پہلے سمندر میں خشکی کے ٹکڑوں کا محل وقوع کچھ اور تھا۔ ہو سکتا ہے ان زمانوں میں ابتدائی انسانوں نے براعظم امریکہ پر قدم رکھا ہو۔ بہر حال امریکہ میں جس طرح سے بھی انسان پہنچے مہذب دنیا کا پہلا انسان کولمبس ہی تھا۔ جس نے اہل یورپ کو بتایا کہ سمندر میں خشکی کا ایک اور ٹکڑا بھی ہے جہاں ابھی تک وحشی قبائل آباد ہیں اور جو سرسبز و شاداب جنت نظیر قطعہ اراضی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ کولمبس سے پہلے بعض عرب مسلمان امریکہ میں پہنچ چکے تھے۔ کولمبس کے زمانے میں جو قبائل باقی دنیا سے کٹ کر براعظم امریکہ پر آباد تھے ان کی بہت سی نسلیں اور قبیلے آج بھی امریکہ میں موجود ہیں۔ کیونکہ صرف پانچ سو سال کا عرصہ گزرا ہے اور اتنے کم عرصہ میں ہزاروں کی تعداد میں آباد امریکی قبائل اپنی ہستی کو مکمل طور پر جدید امریکہ میں ضم نہیں کر سکے۔ ان قبائل کو ریڈ انڈین (Red Indian) کہا جاتا ہے۔ ریڈ انڈینز اپنی اپنی زبانیں بولتے تھے جو انگلش نہ تھی اور جو اب بھی ان امریکی قبائل میں بولی جاتی ہیں۔ دنیا کے باقی براعظم چونکہ ہزاروں سال سے تہذیبی جھمیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کو ان کا مطالعہ، انسانی مزاج اور خصلتوں کی تحقیق کے لیے پیچیدہ ہے۔ ان کے برعکس امریکہ جو کچھ ہی عرصہ قبل دنیا کے سامنے نمودار ہوا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ امریکی قبائل ہزاروں سال سے امریکہ میں آباد ہیں اور حال ہی میں جدید تمدن سے آشنا ہوئے ہیں۔ اپنی عادات، مزاج اور

خصلتوں کے حوالے سے ابھی مکمل طور پر تبدیل نہیں ہو سکے۔ گویا ان کی پشت پر ہزاروں سال کی تہذیب کا بوجھ نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ امریکہ ان ریڈ انڈینز کے زیر اختیار نہیں۔ جن کا وہ اصل وطن ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ امریکہ کو باہر سے آ کر آباد کرنے والوں میں یہودی تاجر، دنیا بھر کی مجرم تنظیموں کے سرکردہ افراد، دوسرے ممالک سے ملک بدر ہونے والے جرائم پیشہ لوگ یا پھر عیاشی کی خاطر پر فضا مقام میں سکونت اختیار کرنے کے شوقین دولت مند لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں نے امریکہ میں رہائش اختیار کی تو وہاں کے اصل باشندوں کو غلام بنا لیا۔ امریکہ کے باشندے جو زیادہ تر سیاہ فام یا سرخ و سفید چہرے کے مالک وحشی لوگ تھے۔ اپنی جہالت کی وجہ سے امریکہ پر قبضہ کرنے والے اجنبیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اگرچہ بعض قبائل جن میں ''اپاچی''، ''اوہامہ''، ''بتو'' اور خصوصاً ''چائنی'' شامل ہیں۔ امریکہ کی اجنبی حکومت سے سالہا سال تک آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ لیکن جدید ہتھیاروں سے لیس اس وقت کے اجنبی حکمران بالآخر امریکی قبائل پر غالب آئے۔ اس لحاظ سے امریکی تہذیب کی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ پہلا حصہ اصل امریکی باشندوں کی قدیم وحشیانہ تہذیب پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ امریکہ میں بھانت بھانت کے علاقوں سے آئے ہوئے مختلف المزاج نو وارد لوگوں کی مجموعی ذہنیت کے مطالعہ پر۔ ہمیں دوسرے حصے کی تہذیبی تاریخ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ہم قدیم امریکی قبائل کے مزاج، خصلتوں اور مذہبی عقائد پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے زیر بحث موضوع سے متعلق وافر مواد مل سکتا ہے۔

نیو میکسیکو کے پوئیبلو قبائل

جب ہسپانیہ کے مہم جو سونے کی تلاش میں امریکہ آئے تو اس وقت پوئیبلو تہذیب اپنے عروج کو پہنچ کر مٹ چکی تھی غالباً شمال سے آنے والے ''نواخو'' اور ''اپاچی قبائل'' نے ان کا پانی بند کر دیا تھا۔ ان قبائل نے اپنی رہائش کے لیے بے آب و گیاہ چٹانی علاقوں کا انتخاب کیوں کیا یہ تو کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ ان کے تیر کمان، سنگتراشی اور زراعت کے کارنامے آج بھی امریکہ میں موجود ہیں۔ چٹانوں میں بنے ہوئے ان کے مکانات اب بھی محفوظ ہیں جو وادی کے فرش سے

سینکڑوں فٹ اونچے چٹان کے آگے کو نکلے ہوئے حصے پر بنائے جاتے تھے- یہ انتہائی مذہب پرست لوگ تھے اور عجیب وغریب رسموں کے قائل تھے- ''پوئیبلو قبائل'' میں سے ایک قبیلہ جس کا نام زونی ہے اور جواب بھی ایک مختصر تعداد میں موجود ہے- مکمل طور پر مذہبی خیالات کا مالک تھا- یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کو مانتے تھے اور ان کا سب سے بڑا ہتھیار جادو تھا- ساحر قبیلے کے عقل مند لوگ سمجھے جاتے اور نئے نئے مذہبی عقائد وضع کرنے میں بااختیار ہوتے- ''زونی قبیلے'' میں ایک رواج تھا کہ وہ لوگ اپنے خاص خاص موقعوں پر نقاب پہن کر دیوی دیوتا کا روپ دھار لیتے اور یہ ظاہر کرتے کہ ان کے جسموں میں اصل دیوی دیوتاؤں کی روحیں داخل ہوگئی ہیں- قبیلے کے جنسی مراسم بڑے عجیب وغریب تھے- جنسی لحاظ سے وہ ماضی کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ بہتر حالت میں تھے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ فطری زندگی کے بہت زیادہ قریب تھے کیونکہ...... انہوں نے طرح طرح کے مذہب، تمدن اور تہذیبیں اختیار کرنے کا تجربہ نہیں کیا تھا اور یقیناً اس کی وجہ یہی ہوگی- زونی قبیلہ جنسی اختلاط برائے افزائش نسل کا قائل تھا- ان کی دعائیں اس طرح کی ہوتی تھیں-

''اور ہمیں ایسی عورت عطا کر
جس کی گود میں بچہ ہو اور دودھ پی رہا ہو
اور ایک بچہ اس کی کمر پر جھول رہا ہو
اور ایک پیٹ میں کلبلا رہا ہو
اور ایک پنگھوڑے میں پڑا انگوٹھا چوس رہا ہو
اور ایک انگلی پکڑ کر ساتھ چل رہا ہو
اور ایک اس کے آگے آگے جا رہا ہو (۸۰)-''

ان کے معاشرے میں جبراً نہیں بلکہ روایتی طور پر جنسی آزادی نہیں تھی- زیادہ سے زیادہ یوں ہوتا کہ جب شام کو لڑکیاں سروں پر مٹکے اٹھائے گاؤں سے پانی بھرنے کے لیے نکلتیں تو کوئی من چلا نوجوان راستے میں گھات لگا کر بیٹھ جاتا اور اپنی پسندیدہ لڑکی سے پانی کی فرمائش کرتا- اگر لڑکی بھی اسے چاہتی پانی پلا دیتی ورنہ نہیں- پانی پینے کے بعد لڑکا اپنی محبوبہ سے خرگوش کے شکار کے لیے چھری مانگتا اور جتنے بھی خرگوش مارتا لڑکی کو دے دیتا- زونی عورتوں کو اس ایک تجربے کے علاوہ کسی اور ایسے تجربے سے واسطہ نہیں پڑتا تھا- جسے ابتدائی جنسی تحریک کہا جا سکے اور یہ دستور آج بھی

زونی قبیلے کے بچے کھچے افراد میں رائج ہے- زونی قبیلے میں رشتہ طے کرنے کا مرحلہ بھی دلچسپ ہے- لڑکا خود لڑکی کے والدین کے گھر چلا جاتا ہے...... زونیوں کے دستور کے مطابق ہر آنے والے کو سب سے پہلے کھانا پیش کیا جاتا ہے...... چنانچہ جب لڑکا کھانا کھا چکتا ہے تو لڑکی کا باپ اس سے پوچھتا ہے- ''لگتا ہے آپ کسی کام سے تشریف لائے ہیں-'' لڑکا جواب دیتا ہے- جی ہاں! آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کے خیال سے آیا تھا- باپ اپنی بیٹی کو بلاتا ہے اور لڑکے سے کہتا ہے- ''میں اس کی طرف سے گفتگو نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اپنی مرضی کی مالک ہے- یہ خود ہی جواب دے گی- اگر لڑکی اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے تو اس کی ماں ساتھ والے کمرے میں پلنگ پر صاف ستھرے گدے بچھا دیتی ہے اور وہ دونوں اس کمرے میں چلے جاتے ہیں- اگلے دن لڑکی اپنے ہاتھوں سے لڑکے کا سر دھوتی ہے- چار دن بعد لڑکی اپنا بہترین جوڑا پہنتی ہے اور ایک بڑی ٹوکری میں گندم کا بہترین پیسا ہوا آٹا بطور تحفہ لڑکے کی ماں کے پاس لے جاتی ہے- بس یوں شادی مکمل ہو جاتی ہے- اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے ناخوش ہیں تو جب تک ان کی اولاد نہ ہو خود بخود ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں- عورت کسی دوسرے مرد کو پسند کر لیتی ہے اور مرد کسی دوسری عورت کو- زونی قبیلے میں جنسی بے راہ روی کے نام کی کوئی چیز نہیں-

زونی قبیلے میں جنسی رقابت کی آگ بھی نرم مزاجی اور میانہ روی سے ٹھنڈی کی جاتی ہے- زنا کی خبر سن کر وہ بھڑک نہیں اٹھتے- ان کے برعکس میدانی علاقے کے امریکی قبائل میں اگر بیوی زنا کی مرتکب ہو تو عام طور پر اس کی ناک کاٹ لی جاتی ہے- جنوب مغربی امریکہ کے ''پوئیبلو قبائل'' مثلاً قبیلہ ''اپاچی'' میں بھی زانیہ کی یہی سزا ہے- لیکن زونیوں میں بیوی کی بے وفائی پر معمولی سی سزا بھی نہیں دی جاتی- شوہر کبھی ظلم وتشدد پر نہیں اترتا- اس لیے کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس کی بیوی نے کسی کے ساتھ منہ کالا کیا ہے تو اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسرا شوہر کرنا چاہتی ہے- ان کے معاشرے میں دوسرا شوہر کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں- مغربی علاقے کے امریکی قبائل میں سوگ منانے کی رسم بے اعتدالی کی حد تک بڑھی ہوئی ہے- عورتیں مرنے والوں کے پاس آمنے سامنے قطاروں میں کھڑی ہو جاتی ہیں- اپنی چھاتیاں ننگی کر کے زخمی کر لیتی ہیں اور ان سے بہنے والے خون کو نہیں روکتیں اور دیر تک ماتم کرتی رہتی ہیں- ایک اور

امریکی قبیلہ ڈیکوٹا میں شدت غم کا اظہار کچھ اور بھی منفرد ہے- بچوں کی موت پر والدین ننگ دھڑنگ باہر نکل آتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں- ان کے برعکس پوبیلو قبائل سوگ منانے کے عادی نہیں- وہ مرنے والے کو جنت مکانی خیال کرنے کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے مرنے پر مطمئن ہوتے ہیں- پوبیلو قبائل کے نزدیک کوئی مرنے والا جہنمی نہیں ہوتا- کیونکہ ان کے ہاں گناہ کا تصور موجود نہیں- وہ اگر کوئی ایسے کام کرتے بھی ہیں جو اخلاقی لحاظ سے نامناسب ہیں- لیکن وہ کرتے بھلائی کے لیے ہیں- پوبیلو قبائل میں زیادتی اور شدت کو کسی صورت پسند نہیں کیا جاتا- ان کے مذہب کو "ڈیونیشائی مذہب" کہا جاتا ہے- ڈیونیش زرخیزی کا دیوتا ہے اور پوبیلو قبائل اس کی پوجا کرتے ہیں- پوبیلو کے زونی قبیلہ میں جنسی اشاریت موجود نہیں- البتہ پوبیلو کے "ہوپی قبیلہ" میں جنسی اشاریت انتہائی مثبت انداز میں پائی جاتی ہے اور وہ بھی محض اس حد تک کہ خاص خاص تہواروں میں لڑکے چھوٹے چھوٹے سیاہ "اسطوانے" جو مرد کے عضو تناسل کی علامت ہیں اور لڑکیاں نرسل کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھیرے (دائرے) جو عورت کی شرم گاہ کی علامت ہیں اٹھائے ہوئے ایک مقدس چشمے پر پہنچتے ہیں اور پہلے ان "اسطوانوں" اور گھیروں کو کیچڑ میں لت پت کرتے اور پھر مقدس چشمے سے دھو کر اکٹھے کر لیتے ہیں- بس اس سے زیادہ پوبیلو قبائل میں جنسی اشاریت کو فروغ حاصل نہ ہو سکا- ان کے برعکس امریکہ کے ایک اور قبیلہ "پیرو" میں کسی زمانے میں ایسے مقابلے ہوتے تھے کہ مرد بالکل برہنہ حالت میں عورتوں کی صف کی طرف دیوانہ وار دوڑتا تھا اور جو عورت اس کے ہاتھ لگ جاتی اس کے ساتھ جنسی اختلاط کر لیتا تھا- جبکہ قبیلہ زونی میں جنسی اشاریت مہذب اور شائستہ ہے- تاہم قبیلہ زونی کی بارآوری کی رسوم جنسی آزادی اور اشاریت سے یکسر خالی نہیں- دو موقعوں پر یعنی "خرگوش کے شکار کی رسم" اور "کھوپڑی ناچ" کے موقع پر ناجائز جنسی تعلقات کو اس حد تک روا رکھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اس رات جو حمل قرار پائے وہ بچہ غیر معمولی طاقت اور ذہانت کا مالک ہوگا- "زونی قبیلہ" میں اس کے علاوہ جنسی ہیجان اور کج روی کی کوئی مثال نہیں ملتی- ہم نے یہ تمام تفصیلات "رتھ بینی ڈکٹ" کی کتاب "پیٹرنز آف کلچرز" سے حاصل کی ہیں- رتھ بینی ڈکٹ لکھتی ہیں کہ

"زونیوں کے نزدیک کائنات کی ابتداء جنسی عمل سے ہوئی- لیکن ان کے عام کردار پر اس کہانی نے منفی اثرات نہیں ڈالے- شاید وہ جنسی عمل کو صرف افزائش نسل کے

لیے مخصوص سمجھتے ہیں- امریکہ کا ایک قبیلہ "یومان" بھی اسی قسم کا عقیدہ رکھتا ہے- ان کا خیال ہے کہ سورج نے زمین سے مباشرت کی- زمین کے بطن سے زندگی پیدا ہوئی- زونیوں میں "تجرد" کی زندگی کو ناپسند کیا جاتا ہے- ان کے ہاں سب سے زیادہ نقطہ چینی ان مغرور لڑکیوں پر کی جاتی ہے جو جوانی میں شادی سے انکار کر دیتی ہیں-"

امریکہ کے قدیم پوبیلو قبائل اور خصوصاً زونی قبیلہ کا مطالعہ کر کے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس وقت تک ان کی بہشت میں ابھی ابلیس داخل نہیں ہوا تھا- یہ کولمبس ہی تھا جس نے سب سے پہلے امریکہ میں قدم رکھا- البتہ پوبیلو قبائل کے مقابلہ میں دوسرے امریکی ریڈ انڈینز اس قدر مثبت خیالات کے مالک نہیں تھے- ان میں "جزیرہ ڈوبو" کے قدیم قبائل خصوصاً قابل ذکر ہیں-

جزیرہ ڈوبو کے قدیم قبائل

جزیرہ ڈوبو ان جزیروں میں سے ایک ہے- جو نیوگنی کے جنوب مشرق میں واقع ہیں- ان قبائل کے معاشرتی کوائف ڈاکٹر برونسلو کی تصانیف میں ملتے ہیں- یہ قبائل اب بھی امریکہ میں موجود ہیں- ڈوبو کے باشندے صبح کاروبار کے لیے جزیرہ "ٹروبرینڈ" چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آ جاتے ہیں- "جزیرہ ٹروبرینڈ" نشیب میں واقع ہے اسی لیے زرخیز ہے- جزیرہ ڈوبو میں آتش فشاں پہاڑ ہے اس لیے زرخیزی اور مچھلیاں کم ہیں- تاہم اردگرد کے جزائر میں ڈوبو کے باشندوں کی شہرت ان کی غربت کی وجہ سے نہیں- ان کی سفاکی' جادوگری اور وحشی پن کی وجہ سے ہے- جزیرہ ڈوبو پر کئی گاؤں آباد ہیں- جن میں تیس تیس چالیس چالیس گھر ہیں- بیرونی لوگوں کی آمد سے پہلے تک یہ آدم خور تھے اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں یہ آباد ہیں وہاں گردونواح کے باشندے انسان کا گوشت کھانے کے تصور سے بھی کانپ اٹھتے ہیں- اردگرد کے باشندے ان سے خوف کھاتے ہیں اور انہیں جنگلی اور وحشی مخلوق سمجھ کر بھاگ اٹھتے ہیں- "ڈوبو" میں کوئی رہبر نہیں- کوئی قائد نہیں' کوئی سردار نہیں' کوئی تنظیم نہیں- ان کے معاشرے میں بدنیتی اور فریب کاری کو اخلاقی وصف کا درجہ حاصل ہے- زونی قبائل کے مقابلے میں ڈوبو یوں لگتے ہیں جیسے انسانوں

کے مقابلے میں ''جنات''- کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ جنات کی خوراک ہڈیاں اور گوشت ہے- ان کے ہاں شادی عجیب وغریب طریقے سے ہوتی ہے- شادی گویا دو خاندانوں کی دشمنی کا آغاز ہے- منگنی کی رسم کے موقع پر ہی دونوں خاندان ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور مرنے مارنے کی قسمیں کھاتے ہیں اور شادی کے بعد بھی دیر تک ان میں دشمنی چلتی رہتی ہے- ظاہر ہے اس قسم کے مخاصمانہ معاشرے میں شرافت سے رشتہ مانگنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا- لہٰذا ان کے ہاں منگنی کا انوکھا طریقہ رائج ہے- کوئی عورت رات کو اپنے مکان میں کسی نوجوان کو اپنی بیٹی کے ساتھ سوتا دیکھ لیتی ہے اور پھر فوراً اپنا دروازہ بند کر دیتی ہے- گویا اس نے نوجوان کو اپنے جال میں پھانس لیا اور اب اسے عوام کے سامنے منگنی کی رسم ادا کرنی پڑے گی- اس مکان میں آنے سے پہلے وہ نوجوان آغاز شباب سے لے کر اب تک ہر رات کنواری لڑکیوں کے ساتھ ان کے مکانوں میں سوتا رہا تھا-

قبائل ڈوبو کی روایت کے مطابق نوجوانوں کے لیے بالغ ہونے کے فوراً بعد اپنے گھر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے- چنانچہ وہ کئی سال تک مشکلات ومصائب سے یوں بچا رہتا ہے کہ آئی رات کسی محبوبہ کے پاس گزارتا ہے اور صبح پو پھٹنے سے پہلے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے اور اگر وہ اپنے لیے لڑکی پسند کر لیتا ہے تو صبح تک فرار نہیں ہوتا بلکہ دیدہ دانستہ لڑکی کے بستر پر پڑا رہتا ہے اور یوں خود اپنے پکڑے جانے کا موقع فراہم کرتا ہے-

لڑکی کی ماں لڑکے کی اس حرکت سے برافروختہ ہو جاتی ہے- لیکن اسے مارنے پیٹنے یا وہاں سے بھگانے کی بجائے دستور کے مطابق گھر کا دروازہ بند کر لیتی ہے اور خود دروازے سے باہر محلے میں خاموش کھڑی ہو جاتی ہے- اسے وہاں کھڑا دیکھ کر قبیلے کے لوگ وہاں جمع ہو جاتے ہیں- اب لڑکی اور لڑکا نمودار ہوتے ہیں اور ایک چٹائی پر پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں- قبیلے کا ہر شخص انہیں کینہ توز نظروں سے کچھ دیر گھورتا ہے اور پھر سب لوگ خاموشی سے چلے جاتے ہیں- جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں تو لڑکی کی ماں ایک ''پھاوڑا'' اٹھا کر لاتی ہے اور لڑکے کو دے کر کہتی ہے کہ ''جاؤ! ہماری لڑکی کو پھانسا ہے تو ہمارے لیے محنت کر کے کما لاؤ'' اور یوں نفرت بھرے انداز میں منگنی کا عمل مکمل ہوتا ہے- ظاہر ہے لڑکے کو غیروں کے لیے کام کرتا دیکھ کر اس کے والدین آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یوں دونوں خاندانوں میں دشمنی کا آغاز ہو جاتا ہے- ڈوبو قبیلہ کے اس طرز عمل

سے انسانی تہذیب کے جنسی ارتقائی مراحل کی تصویر صاف دیکھی جا سکتی ہے- جس طرح بعض جانور مثلاً پرندے اور چوپائے وغیرہ زبردستی مادہ کو گھیر لیتے ہیں اور ان کو دیکھنے والے دوسرے نر مثلاً مرغا، کتا، گدھا وغیرہ اس جوڑے کے جنسی ملاپ سے خار کھاتے اور انہیں دوران اختلاط تنگ کرتے ہیں- اسی طرح ڈوبو قبائل کے افراد اپنی عورتوں کو حاصل کرنے والوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں- لگتا ہے جب انسان دو پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا اور ابتدائی خاندانی زندگی گزار رہا تھا- اس میں ابھی پچھلے ادوار کی جنسی رقابتیں کسی حد تک موجود تھیں- ڈوبو قبائل میں مردوں کا کوئی گھر نہیں وہ آوارہ ہیں اور چار دیواری صرف عورتوں کے لیے ہے- لڑکے کو بالغ ہوتے ہی گھر سے فارغ کر دیا جاتا ہے اور وہی لڑکا شادی کے بعد بھی بیوی کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتا- وہاں لڑکیوں کی رخصتی کا رواج نہیں- لڑکیاں اپنی ماں کے گھر میں زندگی بسر کرتی ہیں اور یوں ماں کے خاندان کی ساری عورتیں ایک گھر میں اکٹھی رہتی ہیں...... ان عورتوں کے شوہر رات کے اندھیرے میں چوری چوری آ کر ان سے جھاڑیوں میں ملتے ہیں...... ان کے شوہروں کی حیثیت مہمان یا ملاقاتی کی ہوتی ہے اور وہ اپنی بیویوں یا ان کے رشتہ داروں کی خود کفیل زندگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے- ان کے اس رواج اور روایت سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابھی جنسی اختلاط کے معاملے میں انہیں قبل از تاریخ کے جنگلوں میں رہنے والے انسانوں جیسے ہیں- جو بلیوں، لومڑیوں اور شیروں کی طرح باقی مخلوقات سے چھپ چھپ کر چوروں کے انداز میں جنسی ملاپ کرتے ہیں- لیکن ایک بات بہت عجیب ہے کہ اس طرح چھپ چھپ کر ہم بستری کی عادت نے انہیں زنا کا عادی کر دیا ہے- ضروری نہیں کہ جھاڑیوں میں ملنے والا جوڑا میاں بیوی ہی ہوں- یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کا مرد کسی کی عورت سے چپکے چپکے مل کر ناجائز جنسی تعلقات قائم کر لے- یہی وجہ ہے کہ ان کے مذہبی قصے اور گیت زنا کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں- ہر گاؤں میں زنا کا ارتکاب اتنا عام ہے کہ ہر شخص کو بچپن ہی سے زنا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے- بعض اوقات بیویاں اپنے شوہروں سے انتقام لینے کے لیے بھی زنا کا ارتکاب کرتی ہیں- ڈوبو قبائل میں اس قسم کے عقائد اور رواج زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں- ڈوبو قبائل کے باشندے جادوگری میں مہارت رکھتے ہیں- وہاں ہمارے ہاں کی طرح تعویذ گنڈوں کے ساتھ ساتھ دم دارو کرنے کا

بھی رواج ہے- مریض کا علاج عموماً ساحر ہی کرتے ہیں- عام طور پر مریض کا کوئی رشتہ دار ساحر کے پاس پانی کی بوتل لاتا ہے اور ساحر اس پر کچھ پڑھ کر پھونک مار دیتا ہے اور مریض اس پانی کو پی کر یا اس کے ساتھ نہا کر اپنا علاج کرتا ہے-

امریکہ کے قدیم ڈوبو قبائل کے عقائد' جنسی رجحانات اور طرز زندگی دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ لوگ عقل کی دولت ملنے کے بعد بھی دیر تک قبل از تاریخ کی عادات نہ چھوڑ سکے- بلکہ تا حال ان قبائل میں اس قسم کی بہت سی خصلتیں پائی جاتی ہیں-

یوں لگتا ہے جیسے ڈوبو قبائل جانوروں سے انسان بننے کے عمل سے گزر رہے تھے اور پوبلو قبائل انسان بننے کے بعد ابتدائی مذہبی تعلیمات جو شاید کسی برگزیدہ شخص کے ذریعے ان تک پہنچی ہوں' پر عمل پیرا تھے- کیونکہ انسانی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عقل و شعور کی دولت ملنے کے فوراً بعد ہی برگزیدہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے فلاح انسانیت کے لیے مقرر کرنا شروع کر دیا تھا-

شمال مغربی امریکہ کے قدیم قبائل

وہ ریڈ انڈین (Red Indian) قبائل جو بحر الکاہل کے ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں "الاسکا" سے لے کر جنوب میں "پیوگٹ ساؤنڈ" تک آباد تھے- بہت ہٹے کٹے' طاقتور اور جنگجو تھے- ان میں زندگی کی حرارت دوسرے قبائل سے زیادہ تھی اور وہ جوش و خروش کے ساتھ جینے کے عادی تھے- وہ قیمتی مچھلیوں کو پکڑ کر ذخیرہ کرتے اور خشک مچھلیوں سے تیل نکالتے تھے- ان قبائل کی ثقافت ۱۸۵۰ء کے قریب قریب ختم ہوئی- صرف ایک قبیلہ "جزیرہ ونکورر" کا ہے جو ابھی تک موجود ہے اور ان کی ثقافت بھی کسی حد تک باقی ہے- یہ مذہبی لوگ تھے- ان میں ایک قبیلہ کواکل تھا جس کا تذکرہ ضروری ہے...... یہ مذہبی لوگ تھے...... مذہبی رسوم کا منتہائے مقصود وجد یا جنون حاصل کرنا حاصل ہوتا تھا- وہ مستی کے عالم میں "حال" کھیلتے اور جذبات میں آ کر آس پاس موجود لوگوں کو گزند تک پہنچا دیتے- اگرچہ امریکہ کے یہ قبائل بھی آدم خور تھے- لیکن ان میں آدم خوری کا عمل ایک مذہبی رسم کے طور پر باقی تھا- خاص خاص تہواروں میں یہ کسی لاش کو جو کئی دن تک درخت کے ساتھ لٹکے رہنے کی وجہ سے خشک ہو چکی ہوتی تھی- مسالے لگا کر درمیان میں رکھ لیتے اور ان کے

مذہبی پیشواء حالت رقص میں اس لاش کی بوٹیاں نوچ نوچ کھاتے- ان کے ہاں اس رسم کی ادائیگی کے لیے کسی بد بخت غلام کو ذبح کر دیا جاتا تھا- یہ انتہائی خونخوار حد تک جوشیلے تھے- گوشت خوری کے رقص کے دوران آس پاس کھڑے ہوئے زندہ لوگ بھی مذہبی پیشواؤں کے کاٹے کا شکار ہوتے- ناچنے والے تماشائیوں کے بازوؤں کی بوٹیاں نوچ لیتے اور ان بوٹیوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا کہ کس رقاص نے کتنے آدمیوں کی کتنی بوٹیاں نوچی ہیں- زیادہ تر ناچنے والے آدم خوروں کے سامنے اس خشک لاش کو ایک برہنہ عورت اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر کھڑی ہوتی- اگلے روز وہ آدم خور دیوتا کی ایک تصویر جس میں اسے عالم مستی میں دکھایا جاتا- صنوبر کی لکڑی میں کھودتے اور پھر اسے آگ میں جلا دیتے- یہ عورتوں کی ماہواری کے خون سے قسم قسم کے منتر اور ٹونے کرتے- ان کے ہاں عورتوں کا خون حیض اتنا ناپاک اور نجس سمجھا جاتا تھا کہ ایام ماہواری میں عورت کو گوشہء تنہائی میں رہنا پڑتا- ان کی محض موجودگی سے ہی ان کا ہر فعل بیکار سمجھا جاتا- ایام ماہواری میں عورتیں نہ ندی پھلانگ سکتی تھیں' نہ سمندر کے قریب جا سکتی تھیں- ان کا خیال تھا کہ حائضہ عورت کو دیکھ کر مچھلیاں غیض و غضب پر اتر آئیں گی- روحانی طبیبوں کے علاج معالجے کے باوجود اگر کوئی موت واقع ہو جاتی تو سمجھتے کہ ضرور کوئی حائضہ عورت مریض کے مکان کے قریب آئی ہو گی- گوشت خوری والے تہوار میں بڑا کاہن صنوبر کی ایک شاخ پر چار معزز عورتوں کا خون حیض لگاتا اور گوشت خور رقاصوں کے چہرے کو اس شاخ سے چھوتا- ان لوگوں میں بھی جناتی خصلتیں زیادہ پائی جاتی تھیں- ان میں انجمنیں بنانے کا رواج بھی تھا- مثلاً آدم خوروں کی انجمن' ریچھ دیوتا کی انجمن' احمقوں کی انجمن' ان کے ہاں غلاموں کو ذبح کر دینا معمولی بات تھی- ان کے ہاں ایک عجیب و غریب رواج یہ تھا کہ جب ان میں دو افراد کوئی معاہدہ کرتے تو اپنے جسموں کے اعضاء کی آپس میں شادی کروا دیتے- مثلاً لین دین کے دوران ایک کی ٹانگ سے دوسرے کے بازو کی شادی- ایک اور دنیا بھر سے منفرد دستور ان میں یہ تھا کہ جب ان پر کوئی قدرتی آفت پڑتی تو یہ اپنے خدا کے ساتھ سخت مشتعل ہو جاتے اور اپنے غصے کا اظہار یوں کرتے کہ غصیلی آنکھیں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر وحشیانہ انداز میں نعرے لگاتے' فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے اور دیوتا کو طعنے دیتے کہ تو غلام ہے' تو غلام ہے-

اب تک ہم نے جن امریکی قبائل کا جائزہ پیش کیا ہے ان کے طرز زندگی سے مجموعی طور پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کولمبس کی دریافت سے پہلے امریکی باشندے جو جدید تہذیب و تمدن سے بالکل ناآشنا تھے جنسی ہوس کے معاملے میں ترقی یافتہ تہذیبوں کی نسبت کم برے تھے۔ گویا ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انتہائی وحشی حتیٰ کہ آدم خور حد تک درندہ صفت ہونے کے باوجود یہ لوگ جنسی طور پر اتنے وحشی نہیں تھے جتنے کہ بابل، مصر یا ہندوستان وغیرہ کے لوگ مہذب ہونے کے باوجود تھے اور اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ماضی بعید میں انسان کے آباؤ اجداد نے فاجرانہ شہوت انگیزی متمدن ہونے کے بعد اختیار کی اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے کے تمدن وضع کرنے کا اختیار اہل مذہب کے ہاتھ میں تھا۔ امریکی قبائل میں مذہبی شدت کم تھی۔ لہٰذا ان میں جنسی برائی بھی کم تھی۔

انسانی نفسیات پر ابلیسی مذاہب کے اثرات

ہم نے اب تک ماضی میں بسنے والی جتنی قوموں کا تجزیہ پیش کیا ہے یہ قومیں موجودہ دور کے انسانوں کے آباؤ اجداد تھیں۔ ان کی خصلتیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہوئی زمانہ ءحال کے انسانوں تک پہنچیں۔ اگرچہ اس دوران ایک بڑا واقعہ یہ پیش آیا کہ صحرائے عرب کی ایک بے آب و گیاہ بستی سے ایک امی لقب شخص نے اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ کی حیثیت سے ظہور فرمایا اور انسانوں کی چھید چھید ناؤ کو غیر فطری طوفانوں سے نکال کر ساحل تک لانے کی ترکیب بتائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطہ ءزمین پر اس دور میں آنکھ کھولی جب پوری دنیا کا معاشرہ شرم ناک حد تک بگڑ چکا تھا اور انسان کے بگاڑ میں سب سے زیادہ ہاتھ ذہانت کا تھا۔ جوں جوں انسانی معاشرے میں ذہانت اور ذہین لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور انسانوں کو غلام بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سامنے آتی گئیں۔ جیسا کہ ہم نے اب تک کے مضامین سے ثابت کیا ہے۔ کہ کاہن، جادوگر اور پروہت وغیرہ جو ذہین لوگ ہوتے تھے۔ انسانوں کے لیے نت نئے جھوٹے مذہبی عقائد وضع کرتے رہے۔ دراصل یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے ایسا کرتے تھے۔ مثلاً ہندوستانی پروہتوں کا وضع کردہ یہ مذہب کہ ”چاند دیوتا“ (سوم دیوتا) جن لڑکیوں کے جسموں پر گرہن کا نشان اگا دیتا ہے۔ ان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ان کی بقاء کا یہی طریقہ ہے کہ وہ

عمر بھر شادی نہ کرنے کا تہیہ کر کے پروہتوں کے پاس مندروں میں چلی آئیں اور بھگوان کی ”نرتکیاں“ بن جائیں۔ ظاہر ہے جن لوگوں نے بھی یہ عقیدہ وضع کیا وہ ”اس نوجوان لڑکی“ میں ذاتی طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

اسی طرح عیسائیوں اور یہودیوں کے مذاہب میں راہبہ کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ بھی چاند دیوتا کی نشان زدہ نرتکیوں سے مختلف نہیں۔ کلیساؤں کی راہبائیں بھی ساری عمر شادیاں نہیں کرتیں اور مریم علیہ السلام کی کنواریاں بن کر رہتی ہیں۔ لیکن کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہ نوجوان راہبائیں جنھوں نے ساری عمر کسی غیر مرد کو نہ چھونے کا عہد کر رکھا ہے کہاں تک اپنے عہد پر قائم رہتی ہیں۔ تاریخ بھری پڑی ہے ان واقعات سے جن میں بڑے بڑے نامور کلیساؤں کے بالا خانوں میں مریم علیہ السلام کی کنواریاں جو ہر وقت سفید لباس زیب تن کیے رہتی ہیں۔ نہ جانے رات کے کون سے پہر اپنے لباس کو ”سرخ“ کر لیتی ہیں۔ دراصل نوجوان مرد یا عورت کے لیے اس طرح کا وعدہ کہ وہ کبھی جنسی لذت سے آلودہ نہیں ہوں گے۔ ایک جھوٹا وعدہ ہوتا ہے۔ جنسی جذبے کی تسکین انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس قسم کے مذہبی عقائد کو باطل قرار دیا ہے۔ ایک عیسائی راہب ”فادر مختار عالم“ کی شاعری کی کتاب ”بول فقیرا“ میں ایک راہبہ کی زبانی اس فطری حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

میرے نال دیاں ٹیاراں — آپڑیں آپڑیں گھر نو گئیاں
سڑکاں اتے میں نمانڑیں — واہ ورولے پھڑدی رہیاں
سکا ڈھنگر ہوونڑ نالوں — میں مٹی دی ڈھیری ہوندی
لوکی مینوں وٹے مار دے — ربا میں کوئی بیری ہوندی
نئیں ربا میں تیرے جوگی

ان اشعار میں راہبہ اپنے کنوارے پن پر پشیمان اور افسردہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو ”سکا ڈھنگر“ یعنی ایک خشک اور جلی ہوئی جھاڑی سے تشبیہ دیتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کاش! وہ پھل دار درخت ہوتی، چاہے وہ درخت بیری کا ہی ہوتا اور لوگ اس کے پھل سے لطف اندوز اور خوش ہوتے۔

اسلام میں اس قسم کی غیر عقلی اور غیر فطری باتوں کی گنجائش نہیں- اسلام انسان کے جذبہ جنس کا احترام کرتا اور اسے اس جذبے کی تسکین کے لیے مثبت مواقع فراہم کرتا ہے- ہم نے تاریخی شواہد سے ملاحظہ کیا ہے کہ ماضی کی قومیں اسی قسم کے غیر عقلی اور غیر فطری عقائد کا شکار رہیں- نتیجتاً اس زمانے کے تمدن انتہائی خوفناک حد تک بگڑ گئے- ان بگڑے ہوئے تمدنوں نے اپنی آنے والی نسلوں پر منفی اثرات ڈالے جو کہ قدرتی امر تھا- ظاہر ہے کہ آباؤ اجداد کی وراثت اولاد ہی کے لیے ہوتی ہے اور یوں اب تک آنے والے انسانوں کی فطرت خصوصاً جنسی حوالے سے غیر متوازن ہے- ماہرین ارتقاء، ماہرین حیاتیات اور ماہرین نفسیات اس بات سے متفق ہیں کہ وہ عادت جو انسانوں میں سینکڑوں ہزاروں سال تک رائج رہے- دھیرے دھیرے ایک مستقل عادت بن جاتی ہے- ماہرین نفسیات اسے فطرت ثانیہ بھی کہتے ہیں- ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ ایسی عادت اپنی طویل العمری کی وجہ سے انسان کے مورثوں یعنی جینز میں داخل ہو جاتی ہے......اور پھر جنسی خلیے کے ذریعے اگلی نسلوں میں بھی منتقل ہوتی رہتی ہے- انسانوں نے بے ہودہ قسم کی جو شہوت انگیزی اپنائی اس کی تاریخ بھی ہزاروں سال پر مشتمل ہے اور یوں یہ عادت بھی اب تک انسانی جینز (Genes) میں جبلت کے طور پر شامل ہو چکی ہے اور جنسی بے راہ روی کا یہی عالم رہا تو انسان کی ایک غیر متوازن عادت مزید پختہ ہو جائے گی-

اسلام کا متوازن نظام

قرآن حکیم نے انسانی فطرت کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا ہے اس میں سرفہرست ان غیر متوازن جنسی خواہشات کی اصلاح کا کام ہے- قرآن حکیم نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ افزائش نسل کا عمل ان کھیتیوں کی طرح سرانجام دیں جو انتہائی پاکیزہ طریقے سے فصل اور بارآوری کا عمل مکمل کرتی ہیں- قرآن کے الفاظ یوں ہیں-

"نساؤ کم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم"

"تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم انہیں جب (استعمال کرنا) چاہو کھیتیاں (سمجھ کر) استعمال کرو-"

یہی نہیں اس سلسلے میں قرآن نے انتہائی سنجیدگی سے عورتوں کو مردوں کا لباس اور مردوں کو عورتوں کا لباس کہا ہے(۸۱)- قرآن نے مردوں اور عورتوں کی الگ الگ ذمہ داریاں مقرر کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"الرجال قوامون علی النساء"

"مرد عورتوں پر قوام مقرر کیے گئے ہیں-"

چنانچہ مردوں کا ذمہ ہے کہ وہ ننھے سے معاشرے یعنی "گھر" کی تعمیر و ترقی کی ذمہ دار عورتوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کریں- اسلام نے انسانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے گھروں کو ایک "چھوٹا سا تمدن" تصور کرتے ہوئے ہر لحاظ سے متوازن کریں- تاکہ چھوٹے چھوٹے ان تمدنوں کا مجموعہ یعنی قوم، آدمیت کے راستے پر تیزی سے درست سفر کر سکے- لیکن سادہ لوح انسانوں کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ قرآن کا یہ لازوال نظام حیات چند تاریخی حادثات کی وجہ سے پھر ان لوگوں کے قبضے میں آ گیا جو صدیوں سے کاہنوں، پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کے روپ میں اپنے حجروں میں بیٹھ کر انسانی فطرت کا استعمال کرتے آئے تھے- دراصل عقل استعمال کر کے غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو ایک جدید اور اچھوتا نظام حیات پیش کرنے کا اعلان کیا تو اس وقت قریش مکہ جو سارے کے سارے انتہائی مذہبی تھے حتیٰ کہ پورے حجاز کے مذاہب کے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے اور بنو ہاشم جو مرکزی عبادت گاہ یعنی خانہ کعبہ کے متولی اور وارث تھے......ہی آپ کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے- گویا حجرے میں بیٹھے ہوئے پروہتوں اور کاہنوں کو انسان کا اپنی فطرت اصلیہ کی طرف لوٹنے کا خیال پسند نہ آیا اور اس میں انہیں اپنی عیاشی، ہوس اور مال و دولت کا نقصان نظر آیا تو انہوں نے اس جدید اور متوازن نظام کی مخالفت شروع کر دی اور کم ذہین عوام تو ہمیشہ سے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب یا "جمہور مذہبی پیشواؤں" کا ساتھ چھوڑنے سے ڈرتی آئی ہے- لہٰذا ان کے لیے فی الفور سچائی کا ساتھ دینا مشکل تھا اور یوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر تک آتش نمرود کی حرارت کا ذائقہ چکھنا تھا- ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مذہبی پیشواؤں کے جھوٹے عقائد کے خلاف آدمیت کی ایک متوازن تحریک اٹھائی تھی- انہوں نے بگڑی ہوئی قوم کے بتوں کو توڑ کر گویا یہ ظاہر کیا کہ یہ دیوی،

دیوتا جو کائنات کی قوتیں ہیں، انسان کے مسجود نہیں- بلکہ انسان کے حضور سجدہ ریز ہیں- ظاہر ہے اُس وقت کے مفاد پرست ذہین پیشواؤں اور رہنماؤں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ تھی- لہٰذا انہوں نے اس اچھوتے اور جدید نظام کے علمبردار کو عذاب مسلسل اور اذیتوں کی زندگی میں مبتلا کر دیا- یہی کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوا-

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آتش نمرود میں پھینکا گیا- آپ نے ہر طرح کی دنیاوی تکلیفیں جھیلیں- لیکن اس آفاقی اور لازوال نظام کی تبلیغ سے باز نہ آئے جو اہل مذہب...... کے لیے ایک خطرناک چیلنج تھا- نبی کریمؐ نے قران کی صورت میں جو نظام پیش کیا وہ مذہب......نہیں تھا بلکہ بگڑے ہوئے انسانوں کے لیے ایک مکمل اور نیا ضابطہ حیات تھا- آپؐ نے قرآن کے ذریعے انسانوں کو حسن بسیط کا یہ پیغام پہنچایا کہ ان کی غیر فطری روش اور غیر متوازن طرز زندگی درست نہیں بلکہ انسانیت کی تباہی اور بربادی کا باعث ہے-

سیکس اور فطرت اصلیہ

"سیکس (Sex) جو انسان کی نسلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا تحفہ ہے- کس طرح جبلت کے دائرے سے نکل کر ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت غیر انسانی دائرے میں داخل ہوا اور کیونکہ ماضی میں انسانوں نے ہر طرح کی جنسی بے راہ روی کو مذہبی احکام کے زیر اثر اپنایا- اس کی کسی حد تک تصویر ہم اس باب میں پیش کر چکے ہیں اور آخر میں قدیم امریکی قبائل کی ابتدائی قسم کی انسانی زندگی کا نقشہ پیش کر کے یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ انسان بھانت بھانت کے مذہبی عقائد کی بدولت اپنا تمدن بگاڑ بیٹھا- وہ تمدن جس کا ہر راستہ "منزل شہوانیت" پر ختم ہوتا ہے- کیونکہ قدیم امریکی قبائل کے مطالعہ میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ کسی حد تک غیر مذہبی ہونے کی بدولت قدیم امریکہ کے یہ قبائل غیر فطری حد تک پھیلی ہوئی جنسیت کا شکار ہونے سے بچے رہے- اگر ڈوبو قبائل کے مرد رات کے وقت جھاڑیوں میں چھپ کر اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے ہیں تو یہ بالکل فطری طریقہ کار ہے- اگر زونی قبائل کے لڑکے پانی بھرنے کے لیے آنے والی لڑکیوں کو ایک صاف ستھرے طریقے سے پسند کرتے ہیں تو یہ خالص انسانی بات ہے یا اگر ڈوبو اور کواکل قبیلے انسانی

گوشت کھاتے تھے تو ان کی یہ جہالت یقیناً اس دور کی یادگار تھی- جب زمین پر لاکھوں سال پہلے کے خونخوار اور گوشت خور انسان آپس میں لڑتے تو ایک دوسرے کو کاٹ کر کھا جاتے- جیسا کہ ماہرین ارتقاء کے مطابق "کرومیگنان" نسلوں کا خاتمہ گوشت خور قسم کی نینڈرتھل نسلوں کے ہاتھوں سے ہوا- ظاہر ہے جب اس دور کا غاروں میں رہنے والا اور شکار کرنے والا ابتدائی قسم کا انسان جانوروں کا شکار کرنے کے بعد ان کا گوشت کھا جاتا تھا تو اس بے شعور اور جانور صفت انسان کے لیے اپنے ہاتھوں قتل ہونے والے دوسرے انسانوں کا گوشت کھانا کیونکر عجیب ہوتا ہوگا اور ان کی یہی فطرت غیر مذہبی امریکی قبائل تک مختلف شکلیں تبدیل کرتے ہوئے پہنچ آئی - اور کواکل قبائل میں محض آدم خوری کی ایک رسم کی حد تک باقی رہ گئی- ورنہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کواکل قبیلے کے باشندے انسانی گوشت کو اپنے طویل ارتقائی مراحل کے بعد ناپسند کرنا شروع کر چکے تھے- رتھ بنی ڈکٹ نے لکھا ہے کہ جب آدم خور رقاص اس لاش کے سامنے ڈرتا کانپتا ہوا ناچتا تھا جو اسے رقص کے بعد کھانی ہوتی تھی تو اس کے گیت کے بول یہ ہوتے تھے-

"اب مجھے گوشت کھانا پڑے گا
میرا چہرہ پیلا ہوا جا رہا ہے
اب مجھے گوشت کھانا پڑے گا
جو دنیا کے شمالی سرے پر رہنے والے
آدم خور دیوتا نے مجھے بھیجا ہے"

یہ لوگ یقیناً ماضی بعید کے گوشت خور انسانوں کی یادگار رہتے- افریقہ کے کچھ قبائل پچھلی صدی تک انسانی گوشت کھانے کے عادی تھے- انسانی گوشت کھانا اگرچہ انتہائی غیر انسانی حرکت ہے لیکن غیر حیوانی حرکت نہیں......لیکن اس کے برعکس جنسی بے راہ روی **غیر انسانی حرکت بھی ہے اور** غیر حیوانی حرکت بھی- کیونکہ کوئی بھی حیوان اپنی جنسی ضرورتوں کو **اس طرح پورا نہیں کرتا اس طرح** کہ انسان-

لہٰذا انسانوں کی مذہبی تمدنی اور معاشرتی تاریخ سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے **کہ انسان کو** اس قدر غیر فطری جنسی رجحان کا مالک مذہب نے بنایا- اب ہم اگلے باب میں **ان آسمانی مذاہب**

کی تبلیغی حالت زار کا مطالعہ کرتے ہیں جو اپنے وقتوں میں تو ایک جدید متوازن تحریک کے طور پر سامنے آئے تھے۔لیکن ان کے بعد آنے والے بعض مفاد پرست لوگوں نے پھر وہی کردار ادا کر کے جو ابلیسی مذاہب کے کاہن اور پروہت کیا کرتے تھے ان کی تعلیمات کو بدل ڈالا۔ البتہ قرآن جس کی حفاظت کا ذمہ خالق کائنات نے خود لیا تھا۔ اب تک بحالت اصلی موجود ہے۔لیکن مسلمانوں کے مذہب میں ایک افسوس کی بات یہ ہوئی کہ یہاں بھی بعض مفاد پرست ذہن لوگوں نے پرانے قصے کہانیوں کو پھر اسی جنسی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جو دیوی دیوتاؤں کے ماننے والے کرتے تھے۔لیکن قرآن کے حروف بحالت اصلی سلامت رہنے کی بدولت یہ خوش آئند بات بھی ہوتی رہی کہ بعض مثبت خیالات کے مالک علمائے دین اور مفکرین ایسی مفاد پرستی کا شکار نہ ہو سکے اور ساتھ کے ساتھ انسان کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہے۔ہم اگلے باب کے آخر میں ان جنسی خیالات کا اجمالی جائزہ پیش کریں گے جو مسلمانوں کے مذہب میں چور دروازوں سے داخل ہوئے اور جنہوں نے اسلام کی تعلیمات کو جنسی طور پر آلودہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

باب ۳

آسمانی مذاہب میں شہوانیت کا نفوذ

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں انسان کے لیے وہ ضابطہ ہائے حیات جو اللہ کے برگزیدہ بندے فلاح انسانیت کی غرض سے لائے، بعد والوں نے اپنی ہوس اور مفاد عاجلہ کی ماری ہوئی فطرت کی بدولت بدل ڈالا۔قرآن حکیم میں ہے کہ

"عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنے صحائف میں تحریف کر لی (۸۲)۔"

ایک اور جگہ قرآن حکیم میں ہے:

"اور وہ اپنے دین میں افتراء پردازیاں کرتے ہیں (۸۳)۔"

قرآن نے ان لوگوں کو ناپسندیدہ قرار دیا اور اسی خدشے کے پیش نظر اپنے ہمیشہ محفوظ رہنے کی قسم کھائی۔ بائبل مقدس جو عیسائیوں کی آسمانی کتاب ہے اور جس میں توریت، زبور اور انجیل کے علاوہ باقی اسرائیلی انبیاءؑ کے صحائف اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے خطوط شامل ہیں۔قرآنی فیصلے کی رو سے تحریف شدہ ہے۔قرآنی فیصلے کو عقلی ترازو پر تولا جائے تو بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ توریت اور انجیل میں تبدیلیاں کی گئیں۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے بائبل مقدس میں موجود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات زندگی مسخ ہو کر رہ گئے اور اللہ تعالیٰ...... کے ان برگزیدہ انسانوں کا عظیم کردار مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔ بائبل میں انبیاءؑ...... کی کہانیاں خصوصاً جنسی حوالے سے انتہائی شرمناک حد تک بے ہودہ ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی بیوی کو بہن کہنا۔لوط علیہ السلام کا (معاذ اللہ) اپنی بیٹیوں کے ساتھ ہم بستر ہونا اور داؤد علیہ السلام کا (معاذ اللہ) غیر مرد کی بیوی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر کے اسے حاملہ کر دینا، بائبل کے ایسے واقعات ہیں جنہیں پڑھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور انبیاءؑ کا کردار بابل اور ہندوستان کے کاہنوں سے مختلف نہیں رہ جاتا۔ حالانکہ ان انبیاءؑ کے قصے قرآن حکیم نے بھی بیان کیے ہیں۔لیکن قرآن میں کہیں بھی انبیاء کی کردار کشی نہیں کی گئی۔ ہاں البتہ قرآن سے باہر بعض غیر

مخلص مسلمان مذہبی پیشواؤں نے اس طرح کی افسوس ناک جسارتیں کی ہیں-

حتیٰ کہ بعض لوگ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مطہر ذات پر بھی کیچڑ اچھالنے سے باز نہیں آئے- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ سے نکاح کرنے کا واقعہ اسی انداز میں بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے-قرآن محفوظ رہا تو اس میں انسانیت کے لیے یہ فائدہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انسانیت کی ڈولتی ہوئی ناؤ اس خیر کثیر سے ضرور مستفید ہوگی اور روئے زمین پر ضرور ایک متوازن انسانی معاشرہ قائم ہوگا- اس باب میں ہم نے ''عہد نامہ قدیم'' اور ''عہد نامہ جدید'' میں موجود جنسی تحریک دلانے والے ان بے بنیاد واقعات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے- جو انسانی نفسیات پر منفی انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں-

عہد نامہ قدیم

عہد نامہ قدیم' جو توریت اور زبور کے ساتھ ساتھ دیگر انبیاء کے واقعات پر مشتمل ہے- کتاب مقدس کے نام سے عام دستیاب ہے-عہد نامہ قدیم میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تک آنے والے انبیاءؑ کے حالات زندگی' پیغامات اور روایات درج ہیں- ان قصوں اور روایات کو پڑھ کر کوئی بھی صاحب شعور شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ فلاح کی تبلیغ ہے- سادہ سی بات ہے کہ جب ایک آسمانی کتاب میں درج انبیاءؑ کے کردار سے جنسی بے اعتدالی ٹپکے گی تو اس کتاب کے ماننے والے کس طرح جنسی بے راہ روی کا وطیرہ نہ اپنائیں گے- بائبل نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی-

توریت

حضرت آدم علیہ السلام کی کہانی میں اگرچہ جنسی رغبت تو نہیں پائی جاتی لیکن آدم علیہ السلام کی اپنی بیوی کے ساتھ شوہرانہ رغبت اور بیوی کی تابع داری ایک نبی کے کردار کو مشکوک بنا دیتی ہے- مثلاً بائبل میں ہے کہ

''اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت

بنائی- اسے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہے اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے- اس لیے وہ ''ناری'' کہلائے گی- کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی اس کے لیے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے-''

اور آگے چل کے بائبل نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے جہاں سانپ کے ورغلانے پر حوا جنت کا پھل کھانے پر آمادہ ہوئی- بائبل نے لکھا ہے

''عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے اس کا پھل لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا- تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں-''

سوچنے کی بات یہ ہے کہ بائبل نے شیطان کے ورغلانے کا شکار عورت کو ظاہر کیا ہے- یہ سراسر اللہ تعالیٰ کے تقاضائے انصاف کے خلاف ہے- بائبل کا عورت کو قصوروار ٹھہرانا عورت کو انسان کے اولین جرم کا مرتکب قرار دینا ہے- حالانکہ قرآن حکیم نے ''فازلھما الشیطان عنھا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں- ''ازلھما'' تثنیہ کا صیغہ ہے- جس کا مطلب ہے شیطان نے دونوں کو ورغلایا- دراصل بائبل میں تحریف کے بعد آدم و حوا کے واقعہ کا تمثیلی رنگ بدل کر ایک ایسا واقعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جو آج سے چند ہزار سال پہلے واقعتاً ایک دن اچانک رونما ہوا- حالانکہ بائبل کے اسی واقعہ سے آج بھی وہ تمثیلی مفہوم آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے جو آسمانی کتابوں میں قصص بیان کرنے کا خصوصی انداز ہے- آسمانی کتابیں حقیقت میں اپنے اندر آفاقی تبلیغ سموئے ہوتی ہیں- یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر واقعات کو تمثیلی انداز میں بیان کرتی ہیں- تا کہ ہر طرح کے افراد اور زمانے میں ان کا صحیح مفہوم اور بنیادی سبق سمجھا جا سکے- مثلاً اسی واقعہ کو لے لیجیے- اس میں بائبل نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو جب تک شعور نہیں ملا تھا وہ ننگا تھا اور شرماتا نہیں تھا- پھر شعور ملا تو انسان کو نیک و بد کی پہچان ہوئی- بائبل نے شعور کو نیک و بد کے درخت سے تشبیہ دی ہے- یعنی شیطان کے کہنے پر انسان نے شعور کا جو پھل کھایا وہ دراصل حیوانی فطرت کی خواہش ارتقاء تھی- ننگا انسان جسے

ہم پچھلے باب میں "نینڈرتھل" کے نام سے بیان کر آئے ہیں دراصل ابھی تک حیوانی بلکہ "جناتی" خصلتوں کا مالک تھا- جناتی اس لیے کہ بعض احادیث میں ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے زمین پر جنات کی حکومت تھی- دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ جنات کی خوراک ہڈیاں اور گوشت تھی اور پھر سب سے اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے شیطان کو جنات میں سے کہا ہے- جیسا کہ قرآن میں ہے- "و کان من الجن" اور وہ جنات میں سے تھا-

اب ذرا تصویر ملاحظہ کیجیے- شعور سے پہلے کا انسان جو ننگا تھا، شرماتا نہیں تھا، خونخوار تھا، شکاری تھا، گوشت خور تھا، کچا گوشت اور ہڈیاں چباتا تھا، ایک دوسرے سے لڑتا تو ایک دوسرے کو قتل کرنے کے بعد مقتول کا گوشت بھی کھا جاتا تھا- دوسرے جانوروں کے مقابلے میں انتہائی خوفناک، تیز طرار اور خونخوار تھا- گویا اس کی حیوانی فطرت باقی حیوانات کی فطرت سے کئی گنا زیادہ ظالمانہ اور بڑی تھی- یہی وہ فطرت ہے یا جبلت جو اس وقت کے جانور نما انسان کو شعور حاصل کرنے کے لیے مجبور کرتی تھی- گویا زمانہء قبل کا حیوان مثل انسان شعور کا حصول چاہتا تھا- یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دو پاؤں پر چلنے والے انتہائی متوازن اور خوبصورت شکل و صورت کے مالک انسان کو شعور کا پھل کھانے پر اس کی حیوانی یا پھر جناتی بلکہ شیطانی فطرت نے آمادہ کیا-

بائبل نے اپنے دور میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہوگا جو بعد میں انسان کی اجتماعی تعلیم کی بجائے کسی داستان گو کی بیان کی ہوئی ایک عجیب داستان بن گئی- اس کے برعکس قرآن حکیم نے تخلیق آدم کے اس تمثیلی واقعہ کو ابھی تک اپنی اصلی حالت میں پیش کیا ہوا ہے- اس سے آگے چلیے تو بائبل نے مزید واقعہ کی صورت بدل دی ہے- بائبل میں ہے کہ

"تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت میں باغ میں پھرتا تھا، سنی- اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا- تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا "میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا-"

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بائبل میں آدم اور اس کی بیوی کے ننگا ہونے اور پھر لنگیاں بنا کر

پہننے کا ذکر کرنے کے بعد خدا کا باغ میں آنے کا واقعہ مذکور ہے- خدا کی آواز سن کر باوجود لنگیاں پہنے ہوئے ہونے کے آدم اور اس کی بیوی پھر بھی درختوں میں چھپ گئے اور خدا سے کہا کہ "ہم ننگے ہیں لہٰذا تجھ سے شرماتے ہیں" حالانکہ لنگیاں پہننے کے بعد انہیں خدا سے اپنے ننگے ہونے کی وجہ سے نہیں شرمانا چاہیے تھا- کیونکہ اب وہ ننگے نہیں تھے- پھر بائبل نے یوں بیان کیا ہے کہ

"اس نے کہا تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے- کیا تو نے اس درخت کا پھل کھا لیا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ نہ کھانا- آدم نے کہا جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا- تب خداوند نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا- عورت نے کہا سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپائیوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا- وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا- پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور آدم سے اس نے کہا کہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا- اس لیے زمین تیرے سبب لعنتی ہوئی-"

صاف ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ بائبل کے نزدیک انسانوں کی تمام بداعمالیوں کی جڑ عورت ہے جس کے سبب ساری زمین لعنتی قرار دی گئی- اس سے پہلے بائبل نے سانپ کو ملعون کہا- حالانکہ حکماء سے پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ طب میں سب سے قیمتی ادویات سانپ سے تیار کی جاتی ہیں-" دوسری بات عورت کے سبب زمین گناہوں کا گہوارہ ہوئی اور یوں عورت پر مرد کی حکومت طاری کر دی گئی-

بائبل میں آدم و حوا کا یہ قصہ عام سادہ لوح انسانوں کو سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ مرد و عورت کی آپس میں جنسی رغبت ازل سے شیطانی تبلیغ کا نتیجہ ہے اور چونکہ یہ ازل سے ہے اس کے

سبب زمین بھی لعنتی ہوئی لہٰذا یہ ابد تک رہے گی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں بائبل میں یوں لکھا ہے کہ

"اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا اور کنعان کے باپ حاپ نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو آ کر خبر دی۔ تب "سم" اور "یافت" نے ایک کپڑا لیا اور اسے اپنے کندھوں پر دھرا اور پیچھے کو الٹے چل کر گئے اور اپنے باپ کی برہنگی ڈھانکی۔ سو منہ ان کے الٹی طرف تھے اور انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی نہ دیکھی۔ جب نوح اپنے مے کے نشے سے ہوش میں آیا تو اس کے چھوٹے بیٹے نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا اسے معلوم ہوا اور اس نے کہا کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہو گا۔"

جس مذہب کے پیروکار جانتے ہوں کہ ان کے نبی نے شراب بھی پی اور نشے میں برہنہ ہو گیا۔ اس مذہب کے ماننے والے اگر زندگی میں اس قسم کی غلطی کر بیٹھیں تو انہیں ملال یا افسوس کیوں کر ہو گا۔ وہ جانتے ہیں کہ خدا کا اتنا برگزیدہ پیغمبر نشے میں بہک کر کپڑے اتار سکتا ہے تو عام انسان کے لیے اس طرح کی غلطی یا خطا کیونکر مشکل ہے۔ جب کہ قرآن حکیم اور اسلام انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ آیئے ذرا ہم اب عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل میں موجود ابراہیم علیہ السلام کا کردار ملاحظہ کرتے ہیں۔

"اور ابراہیم مصر کو گیا کہ وہاں ٹکا رہے۔ کیونکہ ملک میں سخت کال تھا۔ ایسا ہوا کہ جب وہ مصر میں داخل ہونے کو تھا۔ اس نے اپنی بیوی "ساری" سے کہا تو دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے اور یوں ہو گا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے۔ سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے۔ سو تو یہ کہہ دینا کہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیری بدولت بچی رہے۔ اور یوں ہوا کہ جب ابراہیم مصر میں آیا تو مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے۔ فرعون کے امراء نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی اور اس

(فرعون) نے اس کی خاطر ابراہیم پر احسان کیا اور بھیڑ بکریوں اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیوں اور گدھیاں اور اونٹ اس کے پاس ہو گئے۔"

اسلام انبیاءؑ کو معصوم کہتا ہے جبکہ بائبل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتہائی افسوس ناک کردار پیش کیا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت پر تبصرہ کرنے کی چنداں گنجائش نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا (معاذ اللہ) اپنی بیوی کو بہن کہنا، پھر اپنی بیوی کو فرعون کے گھر بھیجنا اور اس کے بدلے بھیڑ بکریاں، گائے، بیل اور غلام وغیرہ حاصل کرنا ایسی قابل مذمت باتیں ہیں جو ایک نبی تو کیا گھٹیا سے گھٹیا انسان کو بھی زیب نہیں دیتیں اور نہ ہی کوئی گھٹیا سے گھٹیا انسان ایسا کرنا پسند کرتا ہے۔ ماسوائے ان بدبخت لوگوں کے جو اپنی عزت و آبرو یعنی بیویاں، بیٹیاں پیسوں کے عوض فروخت کرتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے سے جو بائبل کے باب پیدائش ب۱۲، نشان ۱۵ میں دیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی توہین کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر عیسائیوں کی اپنی ذاتی زندگیوں اور کردار پر بھی ہو گا۔ اس کے بعد بائبل میں حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور اس قصے میں جو قرآن حکیم میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ بائبل میں یہ تحریف کی گئی ہے کہ جب عذاب کے فرشتے "شہر سدوم" میں لوط علیہ السلام کی قوم کے پاس پہنچے اور سدوم کے مردوں نے ان خوبصورت فرشتوں کو ہم جنس پرستی کے لیے لوط علیہ السلام سے چھیننا چاہا تو بائبل کے بقول لوط علیہ السلام نے یوں کہا۔

"اے بھائیو! ایسی بدی تو نہ کرو۔ دیکھو! میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں۔ مرضی ہو تو میں ان کو تمہارے پاس لے آؤں اور جو تم کو بھلا معلوم ہو ان سے کرو۔"

اس کے بعد بائبل نے ایک دو پیرے آگے چل کر ایسا دردناک بہتان حضرت لوط علیہ السلام جیسے اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ، مطہر، معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کے سر تھوپا کہ جسے پڑھ کر جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ "کتاب مقدس" ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور دل خوف سے لرزنے لگتا ہے۔

"اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ چونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے

لگے- تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا- ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے- آؤ! ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تا کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں- سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی- پر اس نے (باپ) نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھو کل رات میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی- آؤ! آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم آغوش ہو- تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں- سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی- چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی- پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی- سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام ''موآب'' رکھا- وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا- وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں-''

حضرت اسحاق کے بارے میں بائبل میں لکھا ہے کہ

''پس اسحاق جرار میں رہنے لگا اور وہاں کے باشندوں نے اس سے اس کی بیوی کے بابت پوچھا تو اس نے کہا وہ میری بہن ہے کیونکہ وہ اسے اپنی بیوی بتاتے ڈرا-''

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بائبل کے الفاظ یہ ہیں-

''چنانچہ یعقوب سات برس تک ''راخل'' کی خاطر خدمت کرتا رہا- پر وہ اسے راخل کی محبت کے سبب چند دنوں کے برابر معلوم ہوئے اور یعقوب نے ''لابن'' سے کہا میری مدت پوری ہوئی- سو میری بیوی مجھے دے تا کہ میں اس کے پاس جاؤں- اب لابن نے اس جگہ کے سارے لوگوں کو بلا کر جمع کیا اور ان کی ضیافت کی اور جب شام ہوئی تو اپنی بیٹی ''لیاہ'' کو اس کے پاس لے آیا- یعقوب اس سے ہم آغوش ہوا اور لابن نے اپنی لونڈی زلفہ اپنی بیٹی لیاہ کے ساتھ کر دی کہ اس کی لونڈی ہو- جب صبح کو معلوم ہوا کہ یہ تو لیاہ ہے تب اس نے لابن سے کہا تو نے مجھ سے کیا کیا- کیا میں نے

جو تیری خدمت کی وہ راخل کی خاطر نہ تھی- پھر تو نے مجھے دھوکہ کیوں دیا-''

اس سے کچھ آگے چل کر کتاب مقدس مزید لکھتی ہے-

''اور لیاہ کی بیٹی دینا جو اس کے ہاں یعقوب سے پیدا ہوئی تھی اس ملک کی لڑکیوں کو دیکھنے باہر گئی- تب اس ملک کے امیر ''حوی حمور'' کے بیٹے ''سکم'' نے اسے دیکھا اور اسے لے جا کر اس کے ساتھ مباشرت کی اور اسے ذلیل کیا اور اس کا دل یعقوب کی بیٹی دینا سے لگ گیا اور اس نے اس لڑکی سے عشق میں میٹھی میٹھی باتیں کیں-''

کتاب مقدس میں ایک اور جگہ یہ تکلیف دہ بات لکھی ہے-

''روبن نے جا کر اپنے باپ کے حرم (بیوی) ''بلہا'' سے مباشرت کی اور اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا روبن یعقوب کا بیٹا تھا-''

یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس آسمانی کتاب میں اس قسم کے عجیب وغریب واقعات ہر صفحے پر بکھرے پڑے ہیں- روبن حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کی بیوی گویا ماں کے ساتھ مباشرت کی (معاذ اللہ)- اس قدر غلیظ بہتان انبیاء کے بہو بیٹیوں پر یقیناً ایک تحریف شدہ آسمانی کتاب میں تو ہو سکتے ہیں- محفوظ کلام الٰہی میں نہیں ہو سکتے- یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے لاریب فیہ یعنی اس میں کوئی شک (ریب) نہیں' کی مہر لگا کر یہی دعویٰ کیا ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے غیر مشکوک ہے اور واقعی قرآن کے قصے بائبل سے یکسر مختلف ہیں- قرآن حکیم میں انبیاء کی عصمت اور پاکیزگی کا خصوصی ذکر ہے- لیکن اس کے برعکس بائبل کا یہ حال ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ''یہودہ'' کا ذکر کرتے ہوئے بائبل نے بتایا ہے-

''اور تمر کو یہ خبر ملی کہ تیرا خسر اپنی بھیڑوں کی پشم کرنے کے لیے ''تمنت'' کو جا رہا ہے- تب اس نے اپنے رنڈاپے کے کپڑوں کو اتار پھینکا اور برقعہ اوڑھا اور اپنے کو ڈھانکا اور ''عینیم'' کے پھاٹک پر جو تمنت کی راہ پہ ہے جا بیٹھی- کیونکہ اس نے دیکھا کہ ''سیلا'' بالغ ہو گیا مگر یہ اس سے بیاہی نہیں گئی- یہودہ اسے دیکھ کر سمجھا کہ کوئی کسبی ہے- کیونکہ اس نے اپنا منہ ڈھانپ [۸۴] رکھا تھا- سو وہ راستے سے اسی کی طرف پھرا اور اسے کہنے لگا ذرا مجھے اپنے ساتھ مباشرت کر لینے دے- کیونکہ اسے

بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی بہو ہے- اس نے کہا تو مجھے کیا دے گا تا کہ میرے ساتھ مباشرت کرے- اس نے کہا میں ریوڑ میں سے بکری کا ایک بچہ تجھے بھیج دوں گا- اس نے کہا کہ اس کے بھیجنے تک تو میرے پاس کچھ رہن کر دے- اس نے کہا تجھے رہن کیا دوں- اس نے کہا اپنی مہر' اپنا بازوبند اور اپنی لاٹھی جو تیرے پاس موجود ہے- اس نے یہ چیزیں اسے دیں اور اس کے ساتھ مباشرت کی اور وہ حاملہ ہو گئی- پھر وہ اٹھ کر چلی گئی اور برقعہ اتار کر رنڈاپے کا جوڑا پہن لیا اور ''یہودہ'' نے اپنے عدلامی دوست کے ہاتھ بکری کا بچہ بھیجا- تا کہ اس عورت کے پاس سے اپنا رہن واپس منگائے- پر وہ عورت اسے نہ ملی- تب اس نے اس جگہ کے لوگوں سے پوچھا کہ وہ ''کسبی'' جو ''عینم'' کے راستے کے برابر بیٹھی تھی کہاں ہے؟ انہوں نے کہا یہاں کوئی ''کسبی'' نہ تھی- تب اس نے یہودہ کے پاس لوٹ کر اسے بتایا کہ وہ مجھے نہیں ملی اور وہاں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ یہاں کوئی کسبی نہیں تھی- یہودہ نے کہا خیر اس رہن کو وہی رکھے ہم تو بدنام نہ ہوں- میں نے تو بکری کا بچہ بھیجا پر وہ تجھے نہیں ملی اور تقریباً تین مہینے کے بعد یہودہ کو یہ خبر ملی کہ تیری بہو ''تمر'' نے زنا کیا اور اسے چھنالے کا حمل ہے- یہودہ نے کہا اسے باہر لاؤ کہ جلائی جائے- جب اسے باہر نکالا تو اس نے اپنے خسر کو کہلا بھیجا کہ میرے اسی شخص کا حمل ہے جس کی یہ چیزیں ہیں- سو تو پہچان تو سہی کہ یہ مہر' بازوبند اور لاٹھی کس کی ہے- تب یہودہ نے اقرار کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ صادق ہے- کیونکہ میں نے اسے اپنے بیٹے ''سیلا'' سے نہیں بیاہا اور پھر وہ کبھی اس کے پاس نہ گیا اور اس کے وضع حمل کے وقت معلوم ہوا کہ اس کے پیٹ میں ''توام'' ہیں اور جب وہ جننے لگی تو ایک بچے کا ہاتھ باہر آیا اور دائی نے پکڑ کر اس کے ہاتھ میں لال ڈورہ باندھ دیا اور کہنے لگی کہ یہ پہلے پیدا ہوا اور یوں ہوا کہ اس (بچے) نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا- اتنے میں اس کا بھائی پیدا ہو گیا- تب دائی بول اٹھی تو کیسے زبردستی نکل پڑا-''

یہ ہے کتاب مقدس جو عیسائیوں اور یہودیوں کی آسمانی کتاب ہے- اسی کو بائبل کہتے ہیں اسی کو توریت' زبور اور انجیل کہتے ہیں- اس کتاب میں انبیاء کا جو کردار پیش کیا گیا ہے- جنسی

حوالے سے اہل بابل کے کاہنوں' ہندوستان کے پروہتوں یا کسی بھی ابلیسی مذہب کے مفاد پرست ذہین لوگوں سے مختلف نہیں- یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار انبیاءؑ کے کردار اور ان کی نیک فطرت کا ذکر کرتا ہے- تا کہ بائبل کے اثرات جو انسانی ذہن پر چھا چکے ہیں' مٹائے جا سکیں- افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض متعصب مستشرقین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو نشانہ بنایا- حتیٰ کہ بعض نے تو اسلام کو ''شہوانی مذہب'' قرار دیا- راج پال کی کتاب ''رنگیلا رسول'' اور سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' بھی اسی طرز پر لکھی گئیں- حالانکہ اسلام میں انبیاءؑ کے کردار کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے...... اور اسلام ایک متوازن اور صاف ستھرے دین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرواتا ہے- جبکہ گزشتہ پیراجات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بائبل میں انبیاءؑ کو اس قدر ہوس پسند دکھایا گیا ہے...... کہ وہ اپنی بہو بیٹیوں کے ساتھ بھی مباشرت سے باز نہیں آئے- دوسری طرف بائبل ہی میں یہ قانون تحریر ہے-

''اور جو شخص اپنی سوتیلی ماں سے صحبت کرے اس نے اپنے باپ کے بدن کو بے پردہ کیا- وہ دونوں ضرور جان سے مارے جائیں- ان کا خون انہیں کی گردن پر ہو گا اور اگر کوئی شخص اپنی بہو سے صحبت کرے وہ دونوں ضرور جان سے مارے جائیں- انہوں نے اوندھی بات کی ہے اور اگر کوئی مرد سے صحبت کرے جیسے عورت سے کرتے ہیں تو ان دونوں نے نہایت مکروہ کام کیا ہے سو وہ دونوں ضرور جان سے مارے جائیں- ان کا خون انہیں کی گردن پر ہو گا اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی اور ساس دونوں رکھے تو یہ بڑی خباثت ہے- سو وہ آدمی اور وہ عورتیں تینوں کے تینوں جلا دیئے جائیں- تا کہ تمہارے درمیان خباثت نہ رہے اور اگر کوئی مرد کسی جانور سے جماع کرے تو وہ ضرور جان سے مارا جائے اور تم اس جانور کو بھی مار ڈالنا اور اگر کوئی عورت کسی جانور کے پاس جائے اور اس سے ہم صحبت ہو تو اس عورت اور جانور دونوں کو مار ڈالنا وہ ضرور جان سے مارے جائیں- ان کا خون انہیں کی گردن پر ہو گا اور اگر کوئی مرد اپنی بہن کو جو اس کے باپ کی یا اس کی ماں کی بیٹی ہو لے کر اس کا بدن دیکھے اور اس کی بہن اس کا بدن دیکھے تو یہ شرم کی بات ہے وہ دونوں اپنی قوم کے

لوگوں کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے جائیں- اس نے اپنی بہن کے بدن کو بے پردہ کیا اس کا گناہ اس کے سر لگے گا-"

ان قوانین کے ہوتے ہوئے بائبل مقدس کے ماننے والوں کے برگزیدہ اکابر کیونکر ان سزاؤں سے بچ سکتے ہیں اور اگر وہ بچ گئے ہیں تو اس کا اثر یہ ہوا کہ آج بھی عیسائی اور یہودی جو یورپ کے باشندے ہیں اپنے آپ کو ان اخلاقی جرائم کا مجرم نہیں سمجھتے- حقیقت میں عیسائیت اور یہودیت کی کوئی اخلاقیات نہیں- ان مذاہب کی اخلاقیات کا کیا فائدہ ہے جب یہ اخلاقیات مرتب کرنے والے خود جنس پرست سمجھے جائیں- یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے سگریٹ کے پیکٹ پہ لکھ دیا جاتا ہے "تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے-" اور پھر شاید آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ایک شخص بھی سگریٹ کے پیکٹ پہ لکھی ہوئی تحریر سے فائدہ اٹھا چکا ہو- جب بائبل میں اپنے وقت کی مہذب ترین اقوام اور ان کے قانون دانوں کا یہ حال ہے تو پھر کس طرح بائبل مقدس کو ماننے والا کوئی شخص اپنے اکابر کے قوانین پر عمل پیرا رہ سکتا ہے- بائبل نے حضرت داؤد علیہ السلام کے کردار کو یوں ٹھیس پہنچائی کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے- حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے- قرآن حکیم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاکیزہ کردار کا ذکر کیا گیا ہے- لیکن عیسائیوں کی کتاب مقدس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے کہ

"اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا وہ "العام" کی بیٹی "بت سبا" ہے جو "حتی اوریاہ" کی بیوی ہے اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا اور وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوئی سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں اور داؤد نے "یوآب" کو کہلا بھیجا کہ حتی اوریاہ کو میرے پاس بھیج دے- پھر داؤد نے "اوریاہ" سے کہا کہ اپنے گھر جا اور اپنے پاؤں دھو- پر اوریاہ اپنے گھر نہ گیا اور جب داؤد کو انہوں نے یہ بتایا کہ اوریاہ اپنے گھر نہیں گیا تو صبح کو داؤد نے یوآب کے لیے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ

بھیجا اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے اور جاں بحق ہو- جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو اپنے شوہر کے لیے ماتم کرنے لگی اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کا ایک لڑکا ہوا- پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا-"

تھوڑا سا آگے چل کر بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے اور بیٹی کا قصہ یوں درج ہے

"اور اس کے بعد ایسا ہوا کہ داؤد کے بیٹے "ابی سلوم" کی ایک خوبصورت بہن تھی جس کا نام "تمر" تھا- اس پر داؤد کا بیٹا "امنون" عاشق ہو گیا اور امنون ایسا کڑھنے لگا کہ وہ اپنی بہن تمر کے سبب سے بیمار پڑ گیا کیونکہ وہ کنواری تھی- سو امنون کو اس کے ساتھ کچھ کرنا دشوار معلوم ہوا اور داؤد کے بھائی "سمع" کا بیٹا "یوندب" امنون کا دوست تھا اور یوندب بڑا چالاک آدمی تھا- سو اس نے اس سے کہا اے بادشاہ زادے! تو کیوں دن بدن دبلا ہوا جاتا ہے- کیا تو مجھے نہیں بتائے گا- تب امنون نے اسے بتایا کہ میں اپنے بھائی "ابی سلون" کی بہن تمر پر عاشق ہوں- یوندب نے اسے کہا کہ تو اپنے بستر پر لیٹ جا اور بیماری کا بہانہ کر جب تیرا باپ تجھے دیکھنے آئے تو اس سے کہنا کہ میری بہن تمر کو ذرا آنے دے کہ وہ مجھے کھانا دے اور میرے سامنے کھانا پکائے- تاکہ میں دیکھوں اور اس کے ہاتھ سے کھاؤں- سو "امنون" پڑ گیا اور اس نے بیماری کا بہانہ کیا اور جب بادشاہ اس کو دیکھنے آیا تو امنون نے بادشاہ سے کہا میری بہن تمر کو آنے دے- سو تمر وہ پوریاں جو اس نے پکائی تھیں اٹھا کر ان کو کوٹھڑی میں اپنے بھائی امنون کے پاس لائی اور جب وہ ان کو اس کے نزدیک لے گئی تو اس نے اسے پکڑ لیا اور کہا اے میری بہن! مجھ سے وصل کر- اس نے کہا نہیں میرے بھائی! میرے ساتھ جبر نہ کر- لیکن اس نے اس کی بات نہ مانی اور چونکہ وہ اس سے زور آور تھا اس لیے اس نے اس کے ساتھ جبر کیا اور اس کے ساتھ صحبت

کی- پھر امنون کو اس سے بڑی سخت نفرت ہوگئی- چونکہ اس کی نفرت اس کے جذبۂ عشق سے بڑھ کر تھی- سو امنون نے اس سے کہا اٹھ اور چلی جا- وہ کہنے لگی ایسا نہ ہوگا کیونکہ یہ ظلم کہ تو مجھے نکالتا ہے اس کام سے جو تو نے مجھ سے کیا بدتر ہے- پر اس نے اس کی ایک نہ سنی- تب اس نے ایک ملازم کو جو اس کی خدمت کرتا تھا بلا کر کہا اس عورت کو میرے پاس سے باہر نکال دے اور پیچھے دروازے کی چٹخنی لگا دے اور وہ رنگ برنگ کا جوڑا پہنے ہوئی تھی- کیونکہ بادشاہوں کی کنواری بیٹیاں ایسی ہی پوشاک پہنتی تھیں- غرض اس کے خادم نے اس کو باہر کر دیا اور اس کے پیچھے چٹخنی لگا دی- اور تمر نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور اپنے رنگ برنگ کے جوڑے کو جو پہنے ہوئے تھی چاک کیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر روتی ہوئی چلی گئی- اس کے بھائی ابی سلوم نے اس سے کہا- تیرا بھائی امنون تیرے ساتھ رہا ہے- خیر اے میری بہن! اب چپکی ہو رہ کیونکہ وہ تیرا بھائی ہے اور اس بات کا غم نہ کر-“

یہ ہے ایک مقدس اور برگزیدہ پیغمبر جو اپنے وقت کا بادشاہ تھا‘ کے گھر کا حال- کیا اسلام نے کبھی ایسا کیا- یہیں پر بس نہیں آگے چلیے اور داؤد علیہ السلام کی آخری عمر کا حال بائبل کی زبانی سنیے-

”داؤد بادشاہ اور کہن سال ہوا اور وہ اسے کپڑے اوڑھاتے پر وہ گرم نہ ہوا سو اس کے خادموں نے اس سے کہا ہمارے ملک کے بادشاہ کے لیے ایک جوان کنواری ڈھونڈی جائے- جو بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اس کی خبرگیری کرے اور تیرے پہلو میں لیٹ رہا کرے- تاکہ ہمارے مالک بادشاہ کو گرمی پہنچے- چنانچہ انہوں نے اسرائیل کی ساری مملکت میں ایک خوبصورت لڑکی تلاش کی- ”شون میت“ ابی شاگ کو پایا اور اسے بادشاہ کے پاس لائے اور وہ لڑکی بہت شکیل تھی سو وہ بادشاہ کی خبرگیری کرنے لگی- لیکن بادشاہ اس سے واقف نہ ہوا-“

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں بلکہ بار بار ذکر کر چکے ہیں کہ آسمانی مذاہب میں تحریف ہوتی رہی اور افترا پردازوں نے اپنے مذہب میں شہوانیت کو فروغ دیا- اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام پر جان بوجھ کر جنسی بہتان باندھے تاکہ وہ مفاد پرست لوگ اپنی ذاتی ہوس کے لیے سامان تعیش

ل کر سکیں- حضرت سلیمان علیہ السلام جو حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند تھے اور اپنے نبی ی طرح بادشاہ تھے- بائبل کی نظر میں سب سے زیادہ جنسیت کے شوقین تھے (معاذ اللہ) بائبل ہے-

”اور سلیمان نے فرعون کی بیٹی کے لیے جسے اس نے بیاہا تھا- اس برآمدہ کے ڈھب کا ایک محل بنایا- یہ سب اندر اور باہر بنیاد سے منڈیر تک بیش قیمت پتھروں سے بنا ہوا تھا-“

ذرا آگے چل کر لکھا ہے-

”اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں یعنی ”موآبی“، ”عمونی“، ”ادومی“، ”صیدانی“ اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا- یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تو ان کے بیچ مت جانا اور نہ وہ تمہارے بیچ آئیں- کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گی- سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا اور اس کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا- کیونکہ جب سلیمان گمراہ ہوگیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر محبوبوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند کے ساتھ کامل نہ رہا- اس نے ایسا سب اپنی اجنبی بیویوں کے لیے کیا-“

ہم آسمانی صحائف میں تحریف کے بعد شہوانیت کے نفوذ کا ذکر کر رہے ہیں- اس وقت ہمارے پیش نظر توریت کے اقتباسات ہیں- توریت میں پیدائش سے لے کر ایوب تک اٹھارہ بابوں میں ہر دوسرے تیسرے صفحے پر جنسی قصے بکھرے پڑے ہیں- جبکہ اس سے قبل ہم ماضی قدیم میں کرۂ زمین پر موجود باقی تہذیبوں کا جنسی جائزہ پیش کر چکے ہیں- توریت کے بعد بائبل میں زبور شروع ہوتی ہے- توریت کا آخری باب ایوب ہے- قرآن حکیم میں حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی ایک پاک طینت نبی کہا گیا ہے- جبکہ توریت میں لکھا ہے کہ

”جب شیطان نے ایوب کو بہکایا تو ایوب نے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور ننگا

ہو گیا-"

قرآن نے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کا خصوصی تذکرہ کیا ہے- جبکہ بائبل میں ج
ایوب پر مصیبت پڑی تو اس نے اپنا منہ کھول کر اپنے جنم دن پر لعنت کی اور کہا-

"نابود ہو وہ دن جب میں پیدا ہوا اور وہ رات بھی جب کہا گیا کہ دیکھو بیٹا پیدا ہوا- وہ رات بانجھ ہو جائے اور وہ صبح کی پلکوں کو نہ دیکھے کیونکہ اس نے میری ماں کے رحم کے دروازوں کو بند نہ کیا- میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا- میں نے پیٹ سے نکلتے ہی جان کیوں نہ دے دی- مجھے قبول کرنے کو گھٹنے کیوں تھے اور چھاتیاں کہ میں ان سے دودھ پیوں-"

ہمارے ہاں مسلمانوں میں صبر ایوب ضرب المثل ہے- لیکن یہاں حضرت ایوب علیہ السلا
کو کیسا بے صبرا اور معاذ اللہ لغو گو بتایا گیا ہے-

زبور

یہاں تک تو بائبل کی توریت کا ذکر تھا اب ہم زبور میں انبیاء کا کلام اور مزید حالات ملاحظ
کرتے ہیں- زبور کی دوسری کتاب میں میر مغنی کے لیے شوشنیم کے سر پر نبی کوراح کا یہ پیغام قا
ملاحظہ ہے-

"تیری معزز خواتین میں شہزادیاں ہیں- ملکہ تیرے داہنے ہاتھ "اومنیر" کے سونے سے آراستہ کھڑی ہے- اے بیٹی! سن غور کر اور کان لگا- اپنی قوم اور اپنے باپ کے گھر کو بھول جا اور بادشاہ تیرے حسن کا مشتاق ہوگا کیونکہ وہ تیرا خداوند ہے تو اسے سجدہ کر اور "صور" کی بیٹی ہدیہ لے کر حاضر ہوگی- قوم کے دولت مند تیری رضا جوئی کریں گے- بادشاہ کی بیٹی محل میں سرتاپا حسن افروز ہے- اس کا لباس "زربفت" کا ہے- وہ بیل بوٹے دار لباس میں بادشاہ کے حضور پہنچائی جائے گی- اس کی کنواری سہیلیاں جو اس کے پیچھے چلتی ہیں- تیرے سامنے حاضر کی جائیں گی-"

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی امثال میں درج ہے-

"اور تیرے لب علم کے نگہبان ہوں گے-
کیونکہ بے گانہ عورت کے لبوں سے شہد ٹپکتا ہے-
اور اس کا منہ تیل سے زیادہ چکنا ہے-
اور تو اپنی جوانی کی بیوی کے ساتھ شادرہ
پیاری ہرنی اور دلفریب غزال کی مانند اس کی چھاتیاں
تجھے ہر وقت آسودہ کریں-"

آگے چل کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی "غزل الغزلات" میں یوں تحریر ہے-

وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے
کیونکہ تیرا عشق مئے سے بہتر ہے
تیرے عطر کی خوشبو لطیف ہے-
تیرا نام عطر ریختہ ہے-
میرا محبوب میرے لیے دستہ مر ہے
جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے-
میرا محبوب میرے لیے عین جدی کے انگورستان سے مہندی کے پھولوں کا گچھا ہے
دیکھ تو خوبرو ہے اے میری پیاری!
دیکھ تو خوبصورت ہے-
تیری آنکھیں دو کبوتر ہیں
تمہارا پلنگ بھی سبز ہے
ویسی ہی میری محبوبہ کنواریوں میں ہے
جیسے سیب کے درخت بن کے درختوں میں
تیری دونوں چھاتیاں دو توام آہو بچے ہیں
اے دلہن! تو لبنان سے میرے ساتھ چلی آ
اے امیر زادی! تیرے پاؤں جوتیوں میں کیسے خوبصورت ہیں-

تیری رانوں کی گولائی ان زیوروں کی مانند ہے
جن کو کسی استاد کاریگر نے بنایا ہو۔
تیری ناف گول پیالہ ہے
جس میں ملائی ہوئی مے کی کمی نہیں
تیرا پیٹ گیہوں کا انبار ہے
جس کے گرداگرد سوسن ہوں
تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں
جو توام پیدا ہوئے
تیری گردن ہاتھی دانت کا برج ہے
تیری آنکھیں بیت ربیم کے پاس اصبون کے چشمے ہیں
تیری ناک لبنان کے برج کی مثال ہے
جو دمشق کے رخ پر بنا ہے
اے محبوبہ! عیش وعشرت کے لیے تو کیسی جمیلہ اور جانفزا ہے
تیری قامت کھجور کی مانند ہے
اور تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں
اور میں اس کی شاخوں کو پکڑوں گا
میں نے کہا میں اس کھجور پر چڑھوں گا
اور تیرے سانس کی خوشبو سیب کی سی ہو
اور تیرا منہ بہترین شراب کی مانند ہو
آ میرے محبوب! چل ہم کھیتوں میں سیر کریں
اور گاؤں میں رات کاٹیں
اے میرے محبوب! کاش کہ تو میرے بھائی کی مانند ہوتا
جس نے میری ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا
میں تجھے جب باہر پاتی تو تیری مچھلیاں لیتی

اور کوئی مجھے حقیر نہ جانتا۔
میں تجھے اپنی ماں کے گھر لے جاتی
وہ مجھے سکھاتی
میں اناروں کے رس سے تجھے ممزوج مے پلاتی
اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہوتا
اور داہنا مجھے گلے لگاتا
ہماری ایک چھوٹی بہن ہے
ابھی اس کی چھاتیاں نہیں اٹھیں
جس روز اس کی بات چلے
ہم اپنی بہن کے لیے کیا کریں
اگر وہ دیوار ہو تو ہم اس پر چاندی کا برج بنائیں گے
میں دیوار ہوں اور میری چھاتیاں برج ہیں۔"

یہ تھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی غزل الغزلات، یہ ایک ایسی کتاب میں موجود ہے جسے انسانی اخلاقیات میں بہت بڑا "درجہ" حاصل ہے۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں بلکہ اربوں انسان زمانہء قدیم سے اس پر عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ کیا حضرت سلیمان کی غزل الغزلات پڑھ کر بھی کوئی شخص ایسا ہے۔ جس کو جسمانی طور پر جنسی تحریک محسوس نہ ہو۔ یہ جملہ کہ تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں۔ یا میں اس کی شاخوں کو پکڑوں گا۔ کسی بھی مرد کے لیے حد سے زیادہ شہوت انگیز ہے۔ یہ مقدس کتاب پڑھتے ہوئے دل لامحالہ جنسی شوق کی جانب کھنچا جاتا ہے۔ ہاں! یہی وہ آسمانی کتاب ہے جسے سینکڑوں سال سے مہذب اقوام کی ایک بہت بڑی اخلاقی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ ان واقعات اور بائبل کی ان نظموں پر ہی کیا موقوف بائبل نے تو کسی بے جان کی بھی بات کی ہے تو اس میں سے جنسی تسکین کا پہلو نکالا اور پھر عیسائیوں کا یہ دعویٰ کیا معنی رکھتا ہے کہ وہ رہبانیت پسند ہیں یا یہ کہ وہ جنسی طرز عمل برا سمجھتے ہیں کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہم نے ابھی بے جان چیزوں کی بات کی ہے۔ بائبل میں شہر "یروشلم" پر تنقید یوں تحریر ہے۔

"لیکن تو نے اپنی خوبصورتی پر تکیہ کیا اور اپنی شہرت کے وسیلہ سے بدکاری کرنے لگی اور ہر ایک کے ساتھ جس کا تیری طرف گزر ہوا خوب فاحشہ بنی رہی اور اس کی ہو گئی۔ تو نے اپنے پوشاک سے اپنے اونچے مقام منقش اور آراستہ کیے۔ اپنے سونے چاندی کے نقش زیورات جو میں نے تجھے دیئے تھے۔ ان سے اپنے لیے مردوں کی مورتیں بنائیں اور ان سے بدکاری کی کہ نہ کبھی ہوئی اور نہ کبھی ہو گی۔ کیا تیری بدکاری کوئی چھوٹی بات تھی اور تو نے اپنی تمام مکروہات اور بدکاری میں اپنے بچپن کے دنوں کو جب تو ننگی اور برہنہ اپنے خون میں لوٹتی تھی۔ کبھی یاد نہ کیا اور اپنی خوبصورتی کو نفرت انگیز کیا اور ہر ایک راہ گزر کے لیے اپنے پاؤں پسارے اور تو "کسبی" کی مانند نہیں ہے۔ کیونکہ تو اجرت لینا حقیر جانتی ہے۔ بلکہ بدکار بیوی کی مانند جو اپنے شوہر کے عوض غیروں کو قبول کرتی ہے۔ لوگ سب کسبیوں کو ہدیہ دیتے ہیں پر تو اپنے یاروں کو ہدیے اور تحفے دیتی ہے۔ تاکہ وہ چاروں طرف سے تیرے پاس آئیں اور تیرے ساتھ بدکاری کریں اور میں تجھے ان کے حوالے کر دوں گا اور وہ تیرے گنبد اور اونچے مکانوں کو مسمار کریں گے اور کپڑے اتاریں گے اور تیرے خوشنما زیور چھین لیں گے اور تجھے ننگی اور برہنہ چھوڑ جائیں گے۔"

گویا شہر یروشلم نہ ہوا کوئی جیتی جاگتی پر کشش شہوت انگیز عورت ہو گئی۔ آگے چل کر یوں ہے کہ

"تیرے اندر وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی۔ تجھ میں انہوں نے اس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی مباشرت کی۔ کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی اور کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رسوا کیا۔"

بائبل نے ان جملوں میں اس زمانہ کے یہود کی حالت زار کو بیان کیا ہے۔ لیکن سادہ سی بات ہے ان جملوں میں یہود کی بدکاریوں کا جو ذکر ہے۔ وہ بدکاریاں کیوں نہ ہوتیں۔ جب ان کے بقول ان کے بڑے بڑے انبیاءؑ اسی طرح ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہیں رکھتے تھے۔ "توریت" اور "زبور" میں دی گئی جنسی ترغیبات اس کے ماننے والوں کا سابقہ یا موجودہ کردار دکھانے کے لیے کافی ہیں۔

انجیل

انجیل مقدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی ان کے ابدی پیغامات اور ان کے حواریوں کی زبانی ان کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ انجیل مقدس بائبل کا آخری اور مختصر حصہ ہے۔ یہودی انجیل کو نہیں مانتے البتہ عیسائی توریت اور زبور کو مانتے ہیں۔ اگرچہ انجیل میں توریت اور زبور کی نسبت بہت کم جنسی ترغیبات ہیں اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجیل میں توریت اور زبور کی نسبت بہت کم تحریف ہوئی۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی باتیں درج ہیں جنہیں جنسی ترغیب کہا جا سکتا ہے۔

بہتر تو یہ تھا کہ انجیل کو بائبل مقدس سے الگ کر کے پیش کیا جاتا تاکہ توریت اور زبور کی بوجہ تحریف آلودگی اس پر نہ پڑتی۔ انجیل کے کسی حد تک بچ جانے کی وجہ صاف نظر آتی ہے۔ اس کا زمانہ توریت اور زبور سے بہت بعد کا گویا جدید زمانہ ہے۔ انجیل کے پہلے صفحہ پر یسوع مسیح کا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے درج کیا گیا ہے کہ

"داؤد سے سلیمان اس عورت سے پیدا ہوا جو پہلے اوریاہ کی بیوی تھی۔"

گویا انجیل نے حضرت داؤد علیہ السلام پر لگائے گئے اس بہتان کو برقرار رکھا ہے۔ جس میں معاذ اللہ حضرت داؤد علیہ السلام اوریاہ کی بیوی کو نہاتا ہوا دیکھ کر فریفتہ ہو گئے اور معاذ اللہ اوریاہ کی بیوی سے بدکاری کی اور اوریاہ کو مروا دیا۔

انجیل میں البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات جو فلاح انسانیت کے لیے ہیں چند تحریفات کو چھوڑ کر آج بھی قابل تحسین اور درست ہیں۔ لیکن انجیل میں وہ عالمگیریت اور آفاقیت نہیں جو قرآن حکیم کا خاصہ ہے۔ قرآن حکیم کی ایک یہ بات بائبل سے قطعی مختلف ہے کہ قرآن حکیم میں سائنسی حقائق کی مثالیں جا بجا دی گئی ہیں۔ موریس بکائیے کی کتاب "قرآن، بائبل اور سائنس" اس مسئلے پر خاصی مستند ہے۔ انجیل میں عورت کے حقوق کا مسئلہ بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ قرآن نے عورت کو خاصی عزت اور آزادی بخشی ہے۔ جبکہ انجیل نے عورت کی دوسری شادی کو ناپسند کیا ہے۔ انجیل میں ہے کہ

"جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے۔ وہ اس پہلی کے برخلاف

زنا کرتا ہے اور اگر عورت شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی بائبل نے ایک یہ کام کیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو شادی نہ کرنے اور مجرد زندگی گزارنے گویا رہبانیت اختیار کرنے کا درس دیا۔ بائبل میں ہے:

"شاگردوں نے اس سے کہا اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں۔ اس نے ان سے کہا کہ سب اس بات کو قبول نہیں کر سکتے۔ مگر وہی جن کو یہ قدرت دی گئی ہے۔ کیونکہ بعض خوجے (ہیجڑے) ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوجے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ایسے ہیں جنہوں نے آسمانوں کی بادشاہی کے لیے اپنے آپ کو خوجا بنایا۔"

آسمانوں کی بادشاہی کے لیے اپنے آپ کو خوجا بنانے کی بات سے صاف ظاہر ہے کہ انجیل نے انسان کو مجرد زندگی کا درس دیا ہے اور یہ بات تو طشت از بام ہے کہ جنسی جذبے پر غیر فطری حدود و قیود انسان کو ناکارہ اور مہمل بنا دیتی ہیں۔ بلکہ آج کل ہندو جنسی مفکر "گرور جنیش" تو کہتا ہے۔

"وہ شخص جو عہد کرے کہ وہ ساری عمر مجرد گزارے گا تو اس کا یہ عہد کرنا ہی ثابت کر رہا ہے کہ اس کے اندر جنسیت کا بے پناہ دباؤ موجود ہے۔ ایک آدمی پختہ عہد کرتا ہے کہ آج سے وہ کم کھائے گا۔ ایسا عہد کرنے والے کے اندر درحقیقت کھانے کی زبردست خواہش موجود ہے۔"

لہٰذا انجیل کا اس طرح کا درس بھی غیر فطری ہونے کی وجہ سے انسان کو پھر جنسیت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ مشہور ماہر جنسیات ڈاکٹر جے۔ ڈی انون (J.D.Unwin) کا خیال ہے کہ
"جبری تجرد کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں (۸۵)۔"

مسلمانوں کے مذہب میں جنسیت کا نفوذ

اسلام کا پیغام جو قرآن مجید میں حرف بہ حرف محفوظ ہے۔ چودہ سو بائیس سال سے انسانیت کے لیے اپنے اصلاح کے دروازے وا کیے ہوئے ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بالکل ابتداء

میں یہ حیران کن دعویٰ کیا ہے کہ لاریب فیہ اس میں کوئی ریب نہیں۔ قرآن حکیم کے محفوظ ہونے کی قسم خالق کائنات نے ان الفاظ میں کھائی ہے۔ "وانا لہ لحفظون" اور ہمارے ذمے ہے اس کی حفاظت۔ قرآن کے ان تمام دعاوی کے بعد جب ہم ایک غیر جانبدارانہ نظر سے قرآن کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دعویٰ کس قدر سچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بائبل کی طرح کہیں بھی تکلیف دہ جنسی روایات کا وجود نہیں۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں اسلام کی حقانیت اور پاکیزگی کا ہی پیغام ہے۔ لیکن بعض روایات جو اسلام کے ازلی دشمنوں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی سازش سے اسلامی کتب کے ذخائر میں داخل کر دی گئیں، قابل مذمت ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں یہ روایات کیسے داخل ہوئیں؟ ظاہر ہے یہود و نصاریٰ کو یہ کب پسند تھا کہ ان کا یہ فخر کہ "دین حق" بنی اسرائیل میں آیا کسی اور کے حصے میں چلا جائے۔ توریت، زبور اور انجیل بنی اسرائیل میں جبکہ قرآن حکیم بنی اسماعیل میں آیا اور یہی بات یہود و نصاریٰ کو گوارا نہ تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام...... حضرت اسحاق علیہ السلام سے کم درجے کے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام...... کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی لونڈی کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ اس مخالفت کی بنا پر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں بنی اسرائیل کے لیے ناپسندیدہ ٹھہرے۔ ظہور اسلام کے زمانہ ہی سے یہود و نصاریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ یثرب کے یہود ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہ کو انتہائی پریشان کیا اور اسی وقت سے یہود و نصاریٰ اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کسی طرح محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو بدل دیا جائے۔ انہوں نے قرآن حکیم کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن بری طرح ناکام رہے۔ جیسا کہ تاریخ میں کئی واقعات موجود ہیں۔ پھر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منسوب کر کے چھوٹی باتیں مشہور کیں۔ جس کا بروقت احساس اس وقت کے محدثین اور ائمہ کو ہوا اور انہوں نے اپنے تئیں اس پریشانی کا تدارک کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں بہتر حد تک کامیاب ہوئے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کی یہ سازش بھی

مکمل طور پر پروان نہ چڑھ سکی- لیکن وہ چند روایات اور کچھ حکایات جو کسی نہ کسی طرح اسلامی کتب کے ذخائر میں داخل ہوگئیں' باقی رہ گئیں اور انہیں روایات سے متعصب مستشرقین اور دشمنان اسلام نے بہت ناجائز فائدے اٹھائے- اگرچہ "فضائل اعمال" کی روایات بھی زیادہ تر مشکوک ہیں- لیکن وہ روایات جن کے ذریعہ سے نبی کریمؐ کی کردار کشی کی گئی' زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ ہیں- ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ سے نکاح کرنے کا واقعہ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحالت روزہ ازواج مطہرات سے مباشرت کرنے کا واقعہ...... یا اسی طرح کے دیگر واقعات جن کا ذکر کرنے سے زبان قاصر ہے اور ہمت پست...... انہیں روایات کا نتیجہ ہیں جو اسلامی کتب کے ذخیرہ میں چور دروازے سے داخل ہوئیں- حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مطلقہ کا واقعہ کچھ اس طرح سے بگاڑا گیا ہے کہ صاف طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعہ سے ملتا جلتا نظر آتا ہے جو اوریاہ کی بیوی سے شادی کرنے کا...... بائبل میں درج ہے- دراصل یہود و نصاریٰ نے اپنے حسد کی وجہ سے اسلام پر بڑے اوچھے حملے کیے...... اور ان کی چور دروازے سے آئی ہوئی روایات کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہب میں کچھ ناپسندیدہ چیزیں داخل ہوگئیں- لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان حملوں کے باوجود بھی یہود و نصاریٰ اپنے مذموم مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے- علماء اور مفکرین نے ان کا محاسبہ کیا اور یوں اسلام کی اصلی شکل مسخ نہ ہوسکی- لیکن جو کچھ وہ داخل کرنے میں کامیاب ہوئے وہ بھی افسوسناک ہے-

اس کے بعد کچھ وہ شوقین مزاج لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے اپنے طور پر اعمال و فرائض کی کتابیں لکھیں اور اسلامی کتب خانوں کو اس دل فریب موضوع پر مواد فراہم کیا- یہاں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے-

"مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے ایک افسانہ لکھا...... افسانے میں عصمت چغتائی نے "سعادت حسن منٹو" کی طرح سیکس کو مرکزی حیثیت دے کر کچھ ناگفتہ بہ باتیں لکھ دیں- ان باتوں سے مذہبی علماء برافروختہ ہوئے اور عصمت چغتائی کے خلاف عدالت میں اخلاقی حدود کا مقدمہ دائر کر دیا- عصمت چغتائی مقدمے کی ایک تاریخ پر مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "بہشتی زیور" لے گئیں- کتاب کے بعض اقتباسات عدالت میں پیش کیے- کمرۂ عدالت میں صورت حال اس وقت خاصی

دلچسپ ہوگئی جب عصمت چغتائی نے بہشتی زیور کے کچھ ناگفتہ بہ بیانات پڑھ کر سنائے اور پھر عصمت چغتائی نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر بہشتی زیور کو شائع کر کے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو پڑھایا جا سکتا ہے اور اس سے ان لڑکے اور لڑکیوں کا اخلاق خراب نہیں ہوتا یا ان میں جنسی تحریک پیدا نہیں ہوتی تو پھر اس کا افسانہ بھی قابل گرفت نہیں ہے- مثلاً بہشتی زیور کے "غسل کے بیان" میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے...... جب مرد کے پیشاب کے مقام کی سپاری (عورت کے) اندر چلی جائے اور چھپ جائے تو بھی غسل واجب ہو جاتا ہے- چاہے منی نکلے یا نہ نکلے- چاہے مرد کی سپاری (عورت کی) آگے کی راہ میں گئی ہو یا پیچھے کی راہ میں تب بھی غسل واجب ہے- لیکن پیچھے کی راہ میں کرنا یا کرانا بڑا گناہ ہے...... چھوٹی لڑکی سے اگر کسی مرد نے صحبت کی جو ابھی جوان نہیں ہوئی ہے تو اس پر غسل واجب نہیں- لیکن عادت ڈالنے کے لیے اسے غسل کرانا چاہئے...... اگر کوئی مرد کسی کم سن عورت کے ساتھ جماع کرے تو غسل فرض نہ ہوگا- بشرطیکہ منی نہ گرے اگر کوئی مرد اپنا خاص حصہ کسی عورت یا مرد کی ناف میں داخل کرے اور منی نہ نکلے تو اس پر غسل فرض نہ ہوگا- حیض و نفاس کی حالت میں عورت کا بوسہ لینا' اس کا جھوٹا پانی پینا اور اس کے ساتھ سونا اور اس کی ناف اور ناف کے اوپر اور زانوں کے نیچے کے جسم سے اپنے جسم کو رگڑنا اگرچہ کپڑا درمیان نہ ہو اور ناف اور زانوں کے درمیان کے کپڑے کے ساتھ ملانا...... جائز ہے- بلکہ حیض کی وجہ سے عورت سے علیحدہ ہو کر سونا یا اس کے اختلاط سے بچنا مکروہ ہے-"

دنیا بھر کے حکماء' مذاہب' مفکرین اخلاقیات اس بات پر متفق ہیں کہ حائضہ عورت کے ساتھ اختلاط غیر درست ہے- اسی طرح مرد کا عورت کی ناف میں...... "کچھ" کرنا غیر اخلاقی بات ہے اور پھر اسی طرح کم عمر عورت کے ساتھ ہم بستر ہونا غیر فطری اور ظالمانہ حرکت ہے- لیکن نہ جانے وہ کون سی احادیث یا قرآنی آیات ہیں جو ہمارے بعض معتبر اور جید علماء کو بھی اس طرح کی چیزیں لکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں- اس طرح کی تمام کتابوں نے فائدہ تو خیر کیا پہنچانا ہے ہمارے مذہبی طبقہ

اور طلباء کو خاصا متاثر کیا ہے۔

یہ تو اس دور کی کتاب ہے۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ تو قرن ہا قرن سے بعض اسرائیلی روایات کے زیر اثر سیکس (Sex) کو بطور مذہبی عقیدہ کے اپنائے ہوئے ہے۔ محض جنسی لذت کے لیے عارضی یا وقتی شادی اس فرقہ کا بنیادی عائلی عقیدہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام میں اسرائیلی روایات چور دروازوں سے داخل ہوئیں اور بقول اقبال ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

اسلام کی اصل شکل تو موجود ہے لیکن مسلمانوں کی اصلی شکل ناپید ہے۔ کیونکہ بعض مفاد پرست لوگوں نے اپنی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے زیادہ تر انہیں غلط روایات کی پیروی کی۔ جو خرافات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اور یوں سینکڑوں سال گزرنے کے بعد آج ملت اسلامیہ کا یہ عالم ہے کہ زیادہ تر لوگ بعض اسلامی احکامات سے جنسی فائدہ ہی اٹھاتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں چار شادیاں کرنے کا جو تصور ہے اور جس کا ذکر ہم آگے چل کر تفصیل سے کریں گے۔ حقیقت میں دکھی انسانیت کی بھلائی کا نتیجہ تھا۔ لیکن بعد میں چار شادیاں کرنے کا یہ عقیدہ غلط رنگ اختیار کر گیا۔ جس کی بدولت عرب شیوخ جو جنسی ہوس پرستی کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ آج تک ناجائز فائدہ اٹھاتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ایک اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اسلام جو غلامی کے خاتمے کے لیے آیا تھا۔ بعض روایات کی بدولت لونڈیاں پالنے میں دنیا کا مشہور مذہب شمار کیا گیا۔ حالانکہ شروع زمانہ میں نبی کریمؐ نے غلام اور لونڈیاں برقرار رکھنے کی جو اجازت دی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ غیر مسلم کافر کسی مومن یا مومنہ کی غلامی میں آنے کے بعد اس مومن یا مومنہ کے کردار سے متاثر ہو کر دوران غلامی اسلام قبول کر لیں۔ ورنہ کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان کو غلام یا لونڈی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن بعد میں بادشاہوں کے حرم اس چیز کے لیے مشہور ہوئے۔ خلیفہ مہدی، ہادی اور ہارون الرشید وغیرہ کے زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ مکہ جیسے متبرک شہر میں غلام اور لونڈیاں فروخت ہونے کا سب بڑا اڈا تھا اور مدینے میں شاہی کنیزوں کو رقص کی تعلیم دی جاتی تھی (۸۶)۔

اگر چہ مکہ اور مدینہ کی یہ روایت تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا اور ہو سکتا ہے یہ مؤرخین کی ابلہ فریبی ہو۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ اموی اور عباسی خلفاء نہ صرف عیاش تھے بلکہ ان کے حرم میں کئی کئی لونڈیاں اور بیویاں اور کنیزیں اس پر مستزاد تھیں۔ انہیں بادشاہوں کی عیاشی نے ان حاشیہ نشین مذہبی پیشواؤں کو نئی نئی اختراعات وضع کرنے پر مائل کیا اور ملکیت زمین کے مسئلہ کی طرح شہوت پسندی کا مسئلہ بھی شرم ناک حد تک بگڑ گیا۔

انہیں نام نہاد اسلامی عقائد کی وجہ سے مستشرقین کو اسلام اور اکابر اسلام پر بہتان تراشی کا موقع ملا۔ ان مستشرقین نے اسی قسم کی اسلامی روایات کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ان میں خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مطہر ذات کے ساتھ حد سے زیادہ ناانصافی اور زیادتی کی گئی۔ عباسی خلفاء جو خود کو تشیع زدہ ظاہر کرتے تھے تو ویسے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مخلص نہ تھے۔ ان کے دور میں ''ابن علقمی'' کی زیر قیادت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اصحاب ثلاثہ کی کردار کشی کا سوچا سمجھا پروگرام جاری رہا۔ لیکن شاید وہ یہ نہ جانتے تھے کہ زوجہ رسولؐ کی توہین دراصل اہانت رسولؐ ہی ہے۔ ایک یہ روایت مشہور ہے کہ بوقت نکاح اور رخصتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال تھی۔ ظاہر ہے نو سال کی بچی نابالغ ہوتی ہے جبکہ قرآن حکیم میں ہے کہ

''ان کے ساتھ نکاح کرو جب وہ بالغ ہو جائیں۔''

یہی وہ باتیں ہیں جو عقیدتاً مشہور ہونے کے بعد اسلامی معاشرت معطل ہو کر رہ گئی۔ لیکن یہ امر خاصہ تسلی دینے والا ہے کہ ہمارے درمیان ہر فیصلہ کرنے کے لیے خالص قرآن بھی موجود ہے۔ ورنہ ارباب چمن کا تو یہ عالم ہے کہ

اوہام کا ارباب قدامت کا رغنوں
فرسودگی کا سحر روایات کا فسوں
اقوال کا مراق حکایات کا جنون
رسم و رواج و صحبت و میراث و نسل و خوں
افسوس یہ وہ حلقہء دام خیال ہے
جس سے بڑے بڑوں کا نکلنا محال ہے

اسلام کی موجودہ حالت سے ہم مسلمانوں کی جنسی ذہنیت کا کسی حد تک جائزہ پیش کر چکے ہیں- اس سے قبل ہم نے عیسائیت اور یہودیت کی جنسی حالت زار کا مختصر نقشہ دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں ہم انسانی تاریخ کے حوالے سے ماضی کے تمام تمدن اور مذاہب کے جنسی رجحانات کا مطالعہ کر چکے ہیں تو اس طرح ہم نے ایک بار کرۂ ارض پر بسنے والے ماضی قدیم سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام انسانوں کی اجتماعی جنسی کیفیت‘ نظریات اور خیالات کو ملاحظہ کر لیا ہے-

قانون مشیت ایزدی

★ مالک کل کا قانون مشیت ہے...... کہ آگ ہر چیز کو جلا دیتی ہے- پانی سب کچھ بہا لے جاتا ہے- سورج ہمیشہ حرارت دیتا ہے- ہوا تازگی فراہم کرتی ہے- سانپ کا ڈسا مشکل سے ہی جانبر ہوتا ہے- شہد کی مکھی کا لعاب دہن ہزار بیماریوں کا علاج ہے- ستارے راستہ بناتے ہیں- سمندر موتی اور معدنیات اگلتے ہیں- پرندے گیت گاتے ہیں- گدھا وزن اٹھاتا ہے- کتا پہرہ دیتا ہے- بلی خوشامد کرتی ہے...... انہیں مظاہر فطرت کہتے ہیں- یہ سب چیزیں خالق کائنات کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتی ہیں- ان کے لیے لگے بندھے قوانین ہیں- ہر وہ چیز جو اس کائنات میں موجود ہے اور جو مادی جسم اور پیکر رکھتی ہے- ان قوانین کی پابند ہے- لیکن اس کائنات میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو مادی یا مرئی جسم نہیں رکھتیں- اگرچہ ان اشیاء کے وجود کو بہت سے نام نہاد جدت پسند بے عقل لوگ پسند نہیں کرتے- لیکن عام زندگی کے مشاہدہ میں بھی ان چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے اور انسان حیرت سے دوچار ہوتا رہتا ہے...... بلکہ اب تو ”آئن سٹائن“ کے ”نظریہ اضافت“ کے بعد جس میں یہ حقیقت دنیا کو بتائی گئی ہے کہ مادہ فنا ہو کر ایک غیر مرئی قوت میں بدل جاتا ہے اور وہ قوت بے پناہ طاقت ور ہے- آئن سٹائن کے بقول مادے کو اگر روشنی کی رفتار (ولاسٹی) کے مربع سے ضرب دی جائے تو ”انرجی“ تخلیق ہوتی ہے- اس کلیے کو سائنس کی زبان میں...... $E=MC^2$...... لکھا جاتا ہے- سوال یہ ہے کہ انرجی جو ایک غیر مرئی اور غیر مادی قوت ہے اور جس کے بارے میں ماضی میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ اسے نہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا- البتہ گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے- اسی طرح مادے کے بارے میں بھی یہی نظریہ تھا- لیکن اب چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے

کہ انرجی عدم سے وجود میں لائی جا سکتی ہے تو جدیدیت پسند احباب کو بھی اب یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس کائنات میں اور بھی بہت سی ایسی مافوق الاسباب کارروائیاں پیش آتی رہتی ہیں جنہیں محض عقل کی بنیاد پر آسانی سے نہیں پرکھا جا سکتا- اسی طرح کی ایک چیز انسانی ذات بھی ہے- جسے مختلف مفکرین مختلف ناموں سے سمجھاتے آئے ہیں- جیسے نفس‘ پرسنیلٹی‘ ذات‘ انا‘ ایگو اور اقبال کے الفاظ میں خودی کہا جاتا ہے- یہ بھی مادی اسباب کے ذریعے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے- بس اس کی پہچان کا یہ طریقہ ہے- دو انسان جب آمنے سامنے موجود ہوں اور وہ ایک دوسرے کو ”تو“ اور ”میں“ کے الفاظ سے مخاطب کریں تو یہی تو اور میں کے الفاظ ہی انسانی ذات کی پہچان ہیں- اس کے برعکس دو جانور آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کی منفرد ذات کا ادراک نہیں رکھتے- یہاں ہم عظیم مفکر علامہ اقبال کی مایہ ناز تصنیف یعنی ”خطبات اقبال“ سے ایک اقتباس جس کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے کیا ہے پیش کر رہے ہیں- تاکہ ذات کے مسئلہ کو مزید آسانی سے سمجھا جا سکے-

> ”صوفیانہ احوال کا انفعالی ہونا ان معنوں میں کہ وہ ایک وجود فی الخارج سے اتصال کی بدولت طاری ہوئے تو اس امر کی دلیل نہیں کہ جس ہستی کا اس طرح شعور ہوا اس کا وجود فی الواقعہ ہم سے ”غیر“ ہے- یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے بلا تحقیق و تفحص یہ فرض کر رکھا ہے کہ علم جب ہی علم ہے جب اس کی نوعیت وہی ہو جو ادراک بالحواس کے ماتحت عالم خارجی کے علم (سائنس) کی- حالانکہ اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو ہمیں اپنی ”ذات“ کی حقیقت سے بھی انکار کرنا پڑے گا- بہرحال میں اس کے جواب میں روزمرہ میل جول کی ایک مثال پیش کروں گا- سوال یہ ہے کہ جب ہم آپس میں ملتے ہیں کیسے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے اندر بھی ہمارے ایسا ذہن کام کر رہا ہے؟ ہمیں اپنی ذات اور ہستی کا علم تو بے شک غور و فکر اور ادراک بالحواس دونوں ذرائع سے ہوتا ہے- لیکن دوسرے اذہان کے مشاہدے کی ہمیں کوئی حس نہیں ملی- لہٰذا ہمارے پاس نفس غیر کی موجودگی کی کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر دلیل ہے تو صرف یہی کہ دوسروں سے بھی کچھ ویسی ہی جسمانی حرکات سرزد ہوتی ہیں جیسی ہم

سے اور جن کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی صاحب شعور ہستی ہمارے سامنے موجود ہے یا پھر ''پروفیسر رائیس'' کے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ہم اپنے ابنائے جنس کو حقیقی سمجھتے ہیں تو اس لیے کہ وہ ہمارے اشاروں کا جواب دیتے اور یوں اپنی حرکات و سکنات سے ہمارے ناقص اظہار مطلب کی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ آمنے سامنے موجود اشخاص کا ایک دوسرے کو جواب دینا...... اشاروں کا جواب دینا ہی بلاشبہ کسی صاحب شعور ہستی کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ قرآن پاک کا بھی یہی ارشاد ہے۔ ''**وقال ربکم ادعونی استجب لکم**'' اور کہا تمہارے رب نے مجھ سے دعا کرو تو میں تمہیں اس کا جواب دیتا ہوں...... یا...... ''**واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان**'' اور جب سوال کرتا ہے میرا بندہ مجھ سے تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ اس کے دعوے (دعا) کا جب وہ دعا کرتا ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ نوامیس فطرت جو قوانین فطرت کے پابند ہیں...... تو ہر وقت ہمارے حواس کے سامنے اپنے طرز عمل اور اطاعت مالک کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ قوتیں جو مافوق الاسباب' غیر مادی یا نہ نظر آنے والی ہیں۔ ہمارے حواس کے سامنے اپنے طرز عمل کا اظہار نہیں کرتی۔ البتہ ہمیں بعض مادی عوامل اور منہاجات کی بدولت یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی غیر مادی قوت کارفرما ہے۔ انسانی ذات بھی اسی طرح کی ایک غیر مادی چیز ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی روح میں سے...... روح انسان کے مادی پیکر میں رکھ دی ہے۔ ظاہر ہے اللہ جو ایک ''**لیس کمثلہ شئی**'' ہے اور مادی وجود سے ماوراء ہے اس کی روح بھی جو انسان کے اندر ہے انہیں خصوصیات کی مالک ہو گی۔

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مادی اشیاء تو قوانین مشیت ایزدی کی پابند ہیں جیسا کہ اقبال نے کہا

تقدیر کے پابند نباتات جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

انسانی ذات چونکہ ایک مادی شے نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ طبیعات کی گرفت میں نہیں آئی۔ گویا

اپنے طرز عمل میں بظاہر آزاد ہے۔ بظاہر آزاد سے مراد یہ ہے کہ انسانی ذات قانون طبیعیات کی گرفت سے تو آزاد ہے لیکن قانون مشیت ایزدی کی گرفت سے باہر نہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا مظاہر فطرت کی پابند اور لگی بندھی اطاعت گزاری کا ذکر یہی سمجھانے کے لیے کیا ہے۔ وہ خدا جس کے قوانین کی گرفت مادی اشیاء پر مضبوط ہو سکتی ہے۔ غیر مادی اشیاء مثلاً انسانی ذات پر مضبوط کیوں نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا انسانی ذات بھی قانون مشیت ایزدی کی بالکل اسی طرح پابند ہے۔ جس طرح کہ نوامیس فطرت لیکن اس کا طرز عمل اور انداز دوسرے مظاہر فطرت سے یکسر مختلف ہے...... وہاں یہ ہے...... کہ چیزیں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ جبکہ انسان کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل صرف احکام الٰہی کی پابندی سے کر سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ احکام الٰہی کی پابندی کیا ہے؟ احکام الٰہی کی پابندی یہ ہے کہ وہ مستقل اخلاقی اقدار جو انسانی معاشرے کے توازن کے لیے ضروری ہیں۔ ہر انسان اپنی زندگی میں طبیعاتی قوانین کی طرح پورے یقین کے ساتھ نافذ کرے۔ جب انسان انفرادی طور پر ایسا کرتا ہے تو انسانی معاشرہ خود بخود مجموعی طور پر بلکہ اجتماعی طور پر متوازن ہوتا چلا جاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ احکام الٰہی کی یہ پابندیاں انسان کی جسمانی فطرت کے دائرہ کار سے نہ تو باہر ہیں اور نہ اس کی ضد...... جیسا کہ اہل مذہب نے سمجھ رکھا ہے مثلاً مذہب میں موسیقی حرام ہے۔ لیکن ایک معصوم بچہ جو انسانی فطرت کی صحیح پڑتال پیش کرتا ہے۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اب یہی موسیقی جو ایک خوش نما چیز ہے اور ساز و آواز کا ایک متوازن عمل ہے۔ کیونکر معاشرے کے غیر متوازن ہونے کا باعث بن سکتی ہے۔ ہاں! موسیقی اس وقت غیر متوازن سمجھی جائے گی جب اس کے ساز و آواز بے ہنگم ہوں یا ان کے نتائج و عواقب میں سیکس کی ترغیب پائی جائے۔

اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاشرے کا توازن ہی اگر انسانیت کا مطمع نظر ہو تو ذات پات کی اونچ نیچ' ذاتی ملکیت کا طوفان بدتمیزی' ظلم و جبر اور ناانصافی باقی نہیں رہے گی۔ نتیجتاً زمین پر بسنے والے انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے جنت تخلیق کر لیں گے تو امن' سلامتی اور آزادی کا مزا چکھنے کے بعد پھر کبھی غیر متوازن اعمال کی طرف نہیں لوٹیں گے اور یوں اللہ تعالیٰ کا وہ

منصوبہ جو روز ازل اس نے فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

یہ اللہ کا اٹل قانون ہی ہے جس کی بدولت ماضی اور حال کی اقوام اپنے اعمال کے ہاتھوں، تکالیف اور مصائب کی زد میں ہیں اور اس تکلیف دہ صورت حال کی ذمہ دار انسان کی جو غیر متوازن حرکات ہیں ان میں سرفہرست جنسی بے راہ روی ہے۔ انسان اپنی جنسی خواہش پر جب جانوروں سے بھی گر کر عمل پیرا ہوتا ہے تو نتیجتاً جنسی عمل کے اصل مقصد یعنی افزائش سے ہٹ کر دور چلا جاتا ہے اور ایک شیطانی مقصد یعنی جسمانی لذت اور سرور حاصل کرنا ہی سامنے رہ جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں وقتی مفاد کے لیے مستقل مفاد کو ٹھکرا دینا۔ ظاہر ہے ایسی حرکت عقل مندی نہیں کہلا سکتی۔ اب تک ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہا کہ قومیں اپنے جنسی عقائد کی بدولت جنت کی راہ سے دور ہٹ گئیں۔ گویا بہشت سے نکال دی گئیں اور اب ان کی یہ فردوس گم گشتہ اسی صورت میں واپس آ سکتی ہے کہ وہ اپنی حیوانی بلکہ جناتی یا یوں کہیے کہ شیطانی خواہشات پر کنٹرول کر کے اپنے آپ کو آدمیت کے سانچے میں ڈھالیں۔ کیونکہ آدمیت وہ بلند ترین مقام ہے جس کا حصول انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔ آدمیت کے مقام پر فائز رہنے کے بعد انسان اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور حسن سے قربت کی یہ لذت...... جو اسے ملتی ہے۔ ابدالآباد تک...... یعنی مرنے کے بعد بھی ہمیشہ تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔

باب ۴

قرآن کا نظریۂ حسن

فلسفۂ حسن

یہ مسئلہ کہ

"اللہ" کیا ہے؟

کیسے ہے؟

کہاں ہے؟

اور پھر خصوصاً یہ کہ کیوں ہے؟ ہزاروں سال سے انسانوں کے لیے ایک معمہ رہا ہے۔ انسانی ذہن جو ہر چیز کو اپنے محدود پیمانے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے...... اپنے حواس خمسہ کے ذریعے ہر نہ سمجھ میں آنے والی بات کو رد کرنے کا عادی ہے...... اللہ کو سمجھنے میں بھی ہمیشہ سے اسی وطیرے پر عمل کرتا آیا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ کہہ کر...... لیس کمثلہ شئی...... کم از کم اللہ کو مادی وجود میں دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسان بدستور اسی تگ و دو میں ہے کہ کسی طرح حقیقت آشکار ہو جائے۔ اس سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر "قاسم شاہ صاحب" کا یہ پنجابی شعر پسند ہے۔

اوہنوں گندیا بندیا لبھنا ایں
اوہدی شکل (۸۷) کوئی نئیں تیری عقل کوئی نئیں

جے اوناں لبھی آکھیں او جانڑیں
جے او لبھ جاوی آکھیں نئیں لبھیا

"...... اے انسان تو اس ذات کو ڈھونڈتا ہے جس کی کوئی مادی شکل نہیں اور یہ بھی ہے کہ اس کو ڈھونڈنے کے لیے تیری عقل ناکافی ہے۔ اگر وہ تجھے نہ مل سکے تو پھر سے

ڈھونڈنا شروع کر اور اگر مل جائے تو سمجھ ابھی نہیں ملا۔"

فلاسفر، مفکرین، اہل علم و دانش اور بڑے بڑے صوفیائے کرام اس چکر میں الجھے رہے اور عمریں گزار دیں۔

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

دراصل ہر دور کے عقل مند (جینیئس) لوگ اپنے تئیں اسی کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح "آخری بات" تک پہنچ جائیں۔ "سقراط، ارسطو، افلاطون، دیو جانس کلبی، افلاطونس، الکندی، الفارا
ابن مسکویہ، ابن الہیثم، ابن سینا، الغزالی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، شیخ الاکبر محی الدی
ابن عربی، آگسٹائن، زینو، اڈنگٹن، اسپنسر، نیٹشے، اوسپنسکی، کانٹ، ایکرمان، براؤننگ، برگسان، شپنگلر
برکلے...... شاہ ولی اللہ، اقبال...... اگر ان ناموں کی فہرست بنائی جائے تو الگ کتاب مرتب کی سکتی ہے۔ یہ سب لوگ انبیاء نہیں تھے کہ اللہ کی طرف سے ان پر وحی نازل ہوتی اور یہ اپنی پریشانی کا حل معلوم کر لیتے۔ ان کی پریشانی یہی تھی کہ آخر اس کارگہ ہست و بود کی حقیقت کیا ہے؟

زمان و مکان کیا ہیں؟

انسان کیا ہے؟

عقل و شعور کیا ہے؟

تقدیر کیا ہے؟

اور یہ سب کچھ "جو ہے" کیوں ہے؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ اس تخلیق کا مقصد کیا ہے؟
سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کے لیے وہ کون سا دقیقہ تھا جو ان لوگوں سے فروگزاشت ہوا
کون سی کمی تھی جس کی بدولت یہ لوگ آخر دم تک مطمئن نہ ہو سکے۔ ان میں بعض لوگ ایسے بھی جو "ڈھونڈتے ڈھونڈتے" تھک گئے اور مجبوراً یہ کہہ دیا کہ حقیقت کچھ نہیں۔ یہ کارگہ ہست اتفاقی حادثہ ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوتی رہی کہ ہر دور کے مفکرین اپنے وقت میں موجود علوم و فنون کی سے نئے نئے افکار پیش کرتے رہے اور یوں وقت کے ساتھ ساتھ حقیقت کے رخ روشن کے سا

ٹھہرے بادل ایک کے بعد ایک سرکتے رہے اور ان لوگوں نے کسی حد تک کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ مثلاً زمانہ قدیم میں انسانی علوم محدود تھے۔ انسانی علوم کی تحقیق کا دائرہ محدود تھا۔ چنانچہ ان ادوار میں خدا کو پیکر محسوس کی حیثیت سے تلاش کیا جاتا رہا۔ لیکن بعد ازاں جب عقل کا سورج مزید روشن ہوا تو انسان کی آنکھ کھلی اور اسے تمام محسوس اشیاء اپنی غلام نظر آئیں اور اس نے طے کر لیا کہ یہ تو خدا نہیں ہو سکتیں۔ دھیرے دھیرے ایک نظر نہ آنے والے خدا کے تصور نے جنم لیا...... تو پہلے سے بھی زیادہ عجیب و غریب مشکلات سامنے آئیں۔

وہ خدا تو ہے لیکن کیا خالق بھی ہے؟

صانع بھی ہے؟

قادر بھی ہے؟

اول و آخر بھی ہے؟

ہر جگہ موجود بھی ہے؟

اسی قسم کے نئے نئے سوالات اٹھتے رہے اور علم فلسفہ تخلیق ہوتا چلا گیا۔

انسان دراصل اپنے الٰہ میں کوئی کمی یا خامی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اسے جب بھی پتہ چلتا کہ اس کے تصور خدا میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہے یا اس میں کوئی خامی ہے تو وہ پھر نئے سرے سے اس کے لیے نئے نئے نام تجویز کرتا رہا۔ فلاسفہ کی مشہور دلیلیں، دلیل کونی...... دلیل غائی، دلیل وجودی...... انہیں محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے ان تمام دلائل پر بھی نکتہ چینیاں ہوتی رہیں اور پھر نئے سے نئے گنجلک سوالات اٹھتے رہے۔

انسان چاہتا تھا کہ خدا کو کسی ایسے نام سے پکارے جس میں سب کچھ سما جائے۔ لیکن ایسا منفرد اور اچھوتا اور مکمل نام اسے اپنی بصیرت کی تگ و دو سے نہ مل سکتا تھا اور نہ ملا۔ کیونکہ انسانی ذہن جو کائنات کے مکان سے باہر نکلنے سے قاصر ہے۔ اس ذات کے بارے میں کوئی آخری تصور قائم کر ہی نہیں سکتا۔ جس کی محض ایک آن بلکہ ایک آن سے بھی شاید بے پناہ حد تک مختصر...... بلکہ اتنی مختصر کہ جس کے لیے انسانی زبان میں الفاظ نہیں...... وہ آن پوری کائنات ہے۔ یہ کائنات جو ہمارے لیے حد امکان سے بھی کہیں زیادہ پھیلی ہوئی ہے جو ہماری وسعت خیال سے ماورا اور حدود

عقل سے باہر ہے...... اس کی محض ایک آن ہے...... تو پھر ایسے میں کون ہے جو اس محیط کل ہستی کا صحیح تصور عقل کے محدود دائرے میں لا سکے- یہی وجہ ہے کہ فلاسفر اور مفکرین اپنے تئیں بڑی بھرپور ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے...... ہاں! البتہ اپنے بارے میں خدا ہی بہتر طور پر ہمیں بتا سکتا ہے کیا وہ کیا ہے؟

میں اکثر اللہ تعالیٰ کو اپنی حقیر بصیرت سے سمجھنے کے لیے ''حسن آخر'' کا لفظ اس لیے استعمال کرتا ہوں کہ عام علوم سائنس، افکار فلاسفہ اور اب تک کی تمام تحقیقات کو سامنے رکھ کر اگر وحی سے مدد لی جائے تو یہی نظریہ سمجھ میں آتا ہے- میں کوئی فلسفی تو نہیں اور نہ ہی اللہ کو ''حسن آخر'' کہنے والی بات میں نے نئی کی ہے- قبل ازیں بہت سے مفکرین جن میں یونانی بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی اللہ کو سمجھنے کے لیے ''حسن'' کا لفظ استعمال کرتے آئے ہیں- لیکن اب آ کے...... یعنی حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے افکار کے بعد یہ مسئلہ پہلے کی نسبت بہت حد تک کھل چکا ہے- حضرت علامہ اقبالؒ جن کی تمام عمر اس خارزار میں گزری اور جو اپنے حضور عرب و عجم کے تمام فلاسفہ کو کھڑا کر کے ان کی کلاس لیتے ہیں- میرے نزدیک فی الحال تک الٰہیات میں سب سے بہتر نظریات کے حامل ہیں- اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبالؒ نے...... اپنے افکار کی تدوین کے لیے مولانا رومؒ اور امام غزالیؒ جیسے بڑے بڑے صوفیاء اور فلاسفہ سے مدد لی ہے- لیکن پھر ایسا تو ہوتا ہی ہے- میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے...... قرآن حکیم جو خالص حالت میں اللہ کی وحی کے طور پر اب تک موجود ہے سے عشق کیا...... تو ان پر عجیب و غریب اسرار منکشف ہوتے چلے گئے- میں خود کو علامہ اقبالؒ کا انتہائی عقیدت مند اور ان کے افکار کو ماننے والا سمجھتا ہوں- علامہ اقبال نے اپنی تمام شاعری اور خطبات میں بتدریج وقت کے ساتھ ساتھ فکری ارتقاء کیا اور نتیجتاً آخری ایام میں ایسا فلسفہ پیش کیا جو اب تک دنیا میں موجود تمام افکار پر ہر لحاظ سے بھاری ہے- فلاسفہء یونان کی حمایت میں ہمارے بہت سے مسلمان مفکرین بھی حقیقت مطلقہ کے تصور میں غلط راستوں پر بھٹکتے رہے- جن میں ''الفارابی، الکندی، ابن رشد، ابن طفیل، بوعلی سینا اور ابن باجہ'' جیسے بہت سے نام شامل ہیں- فلاسفہء یونان کا یہ خیال تھا کہ تصورات جنہیں وہ اعیان ثابتہ کہتے تھے، ہی حقیقی اشیاء ہیں اور کائنات کی تمام چیزیں انہیں اعیان محض سے نکلی ہیں- اعیان کا عالم ہی دراصل عالم حقیقت ہے- چنانچہ وہ تصور کو محسوسات سے الگ ایک مستقل ہستی خیال کرتے ہیں- ان کے نزدیک دنیا دراصل عالم مجاز ہے-

مثلاً ہم درخت یا گھوڑے کو دیکھتے ہیں- یہ دونوں اشیاء اپنی ذات میں حقیقی نہیں بلکہ ان کی ایک ''عین کلی'' یعنی تصور ازلی ہے- جو درخت اور گھوڑے کی تمام صفات پر مشتمل ہے- چنانچہ درخت اور گھوڑے تو فنا ہو سکتے ہیں- لیکن ان کا تصور کبھی فنا نہیں ہو سکتا- کیونکہ یہ حقیقی ہے بالفاظ دیگر ''عین'' یا تصور دراصل ایک مثالی اور ابدی نمونہ ہے- جس کے مطابق فطرت اشیاء کو پیدا کرتی ہے- اس لیے وہ حسین ہیں (۸۸)- ان یونانی فلاسفہ نے بھی حسن کو ہی خدا کہا ہے- ''سقراط'' نے ذات الٰہی کو ''اگاتھوس'' کہا تھا- یعنی خدا خیر محض اور سراسر حسن و خوبی ہے- لیکن ان کے فلسفہء حسن اور اقبالؒ کے فلسفہء حسن میں زمین آسمان کا فرق ہے- زیادہ تر لوگ اقبال کے فلسفہء حسن کو نظریہء عشق کا نام دیتے ہیں- لیکن میں اسے اقبال کا فلسفہء حسن ہی کہوں گا-

قرآن حکیم میں انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود اللہ تعالیٰ کے ساتھ وصال ہے......

''وانھم ملاقی ربھم'' کی طرز کی آیات قرآن حکیم میں جگہ جگہ موجود ہیں- اس طرح احادیث سے ثابت ہے کہ بہشتیوں کا آخری انعام دیدار الٰہی ہی ہوگا اور پھر یہ بات کہ...... ''دیدار'' صرف اور صرف حسن کا ہی کیا جاتا ہے- اب ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ فلاسفہء یونان کے نظریہء حسن اور اقبال کے نظریہء حسن میں فرق کیا ہے- ''افلاطون'' جسے اقبال حکیم ''گوسفند گاں'' کہتے ہیں کے فلسفے کا لب لباب یہ ہے کہ ''حسن عمل کا معیار عقل محض ہے-''

وہ خدا کو عقل کل کہہ کر عقل ہی کو خیر و شر کا عالمگیر معیار قرار دیتا ہے- اس نظریہ کی رو سے ہم ہر اس شے کو نیکی یا خیر قرار دیں گے جو عقل کی رو سے اچھی ہوگی- افلاطون کا مزید یہ نظریہ ہے کہ ''جب کوئی روح عالم حقیقت سے عالم مجاز میں آتی ہے تو اسے اپنی اصلی وطن کی یاد ستاتی ہے- اس میں محبت کا جذبہ جوش مارتا ہے اور وہ عالم حقیقت کے لیے بے قرار رہتی ہے- لیکن عالم مجاز میں اسے عقل عطا کی گئی ہے اور یوں وہ حقیقت کو اپنے غور و فکر سے تصور میں لاتی ہے- اس طرح کا تصور فلسفے کی زبان میں ''تذکر'' کہلاتا ہے-

اگرچہ یہ افلاطونی یا یونانی فلسفہ بعد میں آنے والے فلاسفہ میں سالہا سال تک مقبول رہا- لیکن اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ''عمل'' تصور کے مقابلے میں پیچھے چلا جاتا ہے- یہی وجہ ہے کہ جدت پسند اہل یورپ اسے (Arms Chair Philosophy) بازوؤں والی

کرسی کے فلسفے کا نام دیتے ہیں- کیونکہ بازوؤں والی کرسی پہ بیٹھا ہوا انسان صرف سوچتا ہے- عمل کے لیے تیار نہیں ہوتا- فلاسفہء یونان کی تقلید میں حسن کا یہ نظریہ جو صرف عقل کا طواف کرتا رہتا ہے- محض ایک نظریہ ہی رہ جاتا ہے- یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے مفکرین بھی اسی مفلوج نظریے کا دیر تک شکار رہے- اس کے برعکس علامہ اقبال "وصال حسن" کے قائل تو ہیں لیکن بذریعہ عمل اور عمل بھی وہ جس میں اتنی شدت ہو کہ وہ جنون کی سرحدوں کو چھونے لگے- اسی کو اقبال عشق کہتے ہیں- افلاطونی عقل کے مقابلے میں اقبال کا عشق ایک وجدانی کیفیت کا نام ہے- جس میں عاشق اپنے محبوب سے وصال کے لیے اس قدر بے قرار ہوتا ہے کہ کسی مشکل اور رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا- اقبال عقل کے مقابلے میں عشق کو بالاتر سمجھتے ہیں-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

دراصل علامہ اقبالؒ نے اپنا سارا فلسفہ قرآن کے "حسنہ"...... نظریہء حسن سے لیا ہے- جب تک قرآن نہیں آیا تھا- انسانیت کی رگوں میں بے عملی کا ٹھنڈا خون دھیرے دھیرے سرک رہا تھا- لیکن قرآن حکیم نے پہلی مرتبہ اہل زمین کے سامنے یہ عظیم الشان اعلان کیا کہ عمل ہی...... "حسن عمل" ہی انسانی ناؤ کا آخری سہارا ہے- اقبال قرآنی نظریہء عمل کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

دراصل بات وہاں سے بگڑنا شروع ہوئی جب انسان نے تصور خدا میں وحی سے ہٹ کر اپنی ذاتی قدر و محدود فکر سے کام لینا شروع کیا- قرآن حکیم میں ہے کہ......

"هو الله الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلٰم المومن المهمن العزیز الجبار المتکبر ط سبحان الله عما یشرکون ٥ هو الله الخالق الباری المصور له الاسمآء الحسنیٰ ط یسبح له ما فی السمٰوٰت والارض ج وهو العزیز الحکیم٥

"وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق بندگی نہیں- بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے) سالم امن دینے والا' نگہبان' غالب' زبردست' بڑائی والا- اللہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے- وہی اللہ (تمام مخلوقات) کا خالق ہے- ایجاد واختراع کرنے والا' صورتیں بنانے والا' اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں- جو چیزیں آسمانوں و زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے-"

آیات بالا میں قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے جو اسماء حسنہ بیان کیے ہیں ان کو ایک نظر دیکھتے ہی اسلام کا آفاقی عملی اعلان سمجھ میں آ جاتا ہے-

دراصل سادہ الفاظ میں قرآن کا فلسفہء حسن یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کا نور ہے- قرآن میں ہے کہ...... اللّٰه نور السمٰوٰت والارض ...... "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے-" ایک لمحے کو ٹھہریے اور اس عقیدہ کو دیکھیے جس میں قرآن و حدیث کی رو سے ہم کہتے ہیں ملائکہ سب کے سب نور ہیں- اب دونوں باتوں کو ملائیے...... تو صاف نظر آئے گا کہ اللہ کے ملائکہ گویا سمٰوات اور ارض اور ان میں موجود ہر چیز اور ہر قوت جو اللہ کا نور ہے- دراصل اللہ کے حسن کا ظہور ہے- اب ہوتا یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ تمام حسن یا نور جو ملائکہ کو عطا ہوا...... یعنی کائناتی قوتوں یا ارض و سمٰوات کو اللہ نے اپنی مرضی سے انسان کے دست تصرف میں دے دیا ہے- جیسا کہ قرآن میں ہے ملائکہ (کائناتی قوتیں) انسان کے حضور سجدہ ریز ہیں اور یوں بات ایک دلچسپ مرحلے میں داخل ہوتی ہے- ملائکہ انسان کے حضور سجدہ ریز ہو گئے- گویا انسان کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ان کائناتی قوتوں کو اپنے استعمال میں لائے- ظاہر ہے اب اللہ یہ تو نہیں چاہے گا کہ انسان ان قوتوں کا غلط اور ناجائز استعمال کرے- اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ ان قوتوں کا درست اور جائز استعمال کیا جائے اور یہ درست اور جائز استعمال لامحالہ انسان اپنی اس "خدائی روح" کے اختیار سے عمل میں لائے گا- جو اللہ نے اپنی روح میں سے اس کے اندر پھونکی- اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک روح خدا کی ہے جو بہت بڑی اور عظیم ہے اور خدا بہت بڑا اور عظیم خالق یا تخلیق کار ہے اور وہی روح انسان میں بھی ہے- لہٰذا انسان بھی چھوٹے پیمانے پر خالق یا تخلیق کار ہے- اللہ صرف تخلیق کار ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے- اسی طرح انسان بھی صرف تخلیق کار نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ

ہے......انسان کے ذمہ اللہ نے ایسی ڈیوٹی لگا دی ہے جو ایک بڑے اور عظیم پیمانے پر وہ خود بھی سر انجام دیتا ہے۔ اقبال کی نظم ''خدا اور انسان'' اسی خوبصورت فلسفے کی ترجمان ہے۔

خدا (۸۹)

جہاں را زیک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی خیال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نظم میں اقبال نے خدا اور انسان کا تمثیلی مکالمہ پیش کیا ہے۔ خدا انسان سے کہتا ہے میں نے یہ جہان آب و گل سے بنایا لیکن تو نے ایرانی، تاتاری اور حبشی اقوام بنا ڈالیں...... میں نے مٹی سے لوہا پیدا کیا لیکن تو نے اس لوہے سے تلواریں، تیر اور توپیں بنا ڈالیں۔ تو نے اس لوہے سے کلہاڑا بنایا کہ چمن کو کاٹ دے۔ تو نے اسی لوہے سے پنجرہ بنایا کہ گیت گاتے آزاد پنچھیوں کو اس میں قید کر لے...... خدا کے اس شکوہ کا جواب انسان نے یوں دیا...... کہ دیکھ تو نے رات بنائی، جو تاریک تھی۔ میں نے چراغ بنا کر اسے روشن کر دیا۔ تو نے مٹی بنائی جو بظاہر بیکار تھی۔ میں نے اس مٹی سے پیالہ بنایا جو کار آمد ہے۔ تو نے جنگل، خشک پہاڑ اور صحرا بنائے میں نے اس کے مقابلے میں خیابان، گلزار اور باغ بنائے۔ میں وہ ہوں کہ میں نے بیکار ریت اور پتھر سے آئینہ بنایا۔ میں وہ ہوں کہ میں نے خوفناک زہر سے زندگی بخش ادویہ بنائیں۔

''بال جبریل'' کے ایک شعر میں اقبال نے یہاں تک کہہ دیا ہے......

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

یہی نہیں اقبال نے تو یہ بھی کہا۔

اس دشت جگر تار کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

بات یہ ہے کہ انسان کے ہاتھ میں نوریوں کو استعمال کرنے کا اختیار دے کر گویا اللہ نے انسان کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ اس نور اور اس حسن کو مزید نکھار کر دکھائے اور چونکہ قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود ملاقات ربانی ہے...... یا یوں کہیے کہ ملاقات حسن...... تو اس کے قرآنی احکامات کی رو سے انسان کو عمل کا جو طریقہ بتایا گیا ہے۔ وہ بھی یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ نور میں مزید سے مزید اختراعات کرتا چلا جائے۔ ارض و سموات اس کے غلام ہیں اور حسن کے مظاہر ہیں اور انسان کے سامنے وسیع حدود تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انسان کے لیے قطعی مشکل نہیں کہ وہ کائنات کی ان اشیاء کو اپنی مرضی سے استعمال کرتا یا تبدیل کرتا چلا جائے اور پھر جب انسان ایسا کرتا ہے...... تو سوال یہ ہے کہ اس کو فائدہ کیا پہنچتا ہے؟ اور جواب یہ ہے کہ حسن کی تخلیق یا تزئین کر کے اسے جو خوشی اور سرشاری حاصل ہوتی ہے وہ ایک عجیب و غریب روحانی لذت ہوتی ہے جو ہر قسم کی جسمانی لذتوں سے مختلف اور بالاتر حتیٰ کہ متضاد ہوتی ہے۔

عام انسانی سطح پر فلسفہء حسن کا اطلاق

دراصل تخلیق کا حسن جب اپنے جلوے دکھانے لگتا ہے تو بالکل لذت وصال سے ملتی جلتی گدگدی من کے اندر کہیں محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مصور جب خوبصورت پینٹنگ تخلیق کرتا ہے تو جوں جوں اس کی تصویر مکمل ہوتی جاتی ہے۔ اسے اپنا سینہ خوشی سے پھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایک انوکھی اور لذت انگیز چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی فنکار، کاریگر، مزدور، معمار، معلم،

طالب علم حتیٰ کہ کسی بھی شعبہء زندگی کا متعلقہ فرد جب دل کی گہرائیوں اور شوق سے اپنا مطلوبہ کام مکمل کرتا ہے تو اسے روحانی طور پر بے پناہ سرشاری محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی تخلیقی توانائی سے نہ صرف خدا کی کائنات میں ایک خوبصورت اضافہ کرتا ہے بلکہ ساتھ کے ساتھ اپنے قلب کو بھی حیات نو بخشتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں......

آفریند کائنات دیگرے

قلب را بخشد حیات دیگرے

مشہور مغربی فکر ''شیکسپیئر'' نے کسی حد تک اس بات کو یوں بیان کیا ہے......

''ہر نئی زبان سیکھنے سے انسان کے اندر ایک نئی روح پیدا ہوتی ہے۔''

اب وہ قلبی راحت جو اس تخلیق کار کو میسر آئی ہے کوئی معمولی چیز نہیں۔ دراصل وہ چھوٹے پیمانے پر حسن سے ملاقات کا ایک ذریعہ ہے۔ مثلاً تصویر بنانے والا فنکار جوں جوں حسن تخلیق کرتا چلا جاتا ہے وہ حسن کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا یہ چھوٹے پیمانے پر حسن سے ملاقات ہے۔ حسن سے اس کی ملاقات جو اسے دنیا میں نصیب ہوئی اگر اسی طرح اسے متواتر نصیب ہوتی رہے تو اس کے قلب کی تخلیق گویا روح کی سرشاری اور بالیدگی ہوتی رہتی ہے اور اس طرح وہ اگر دیر تک حسین کام کرتا رہے تو ایک وقت میں وہ خود بخود بدنما کاموں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باز آ جاتا ہے۔ گویا بیک وقت اس نے کائنات کے حسن میں پے در پے اضافے کیے اور ساتھ کے ساتھ اپنی ذات اور قلب کی نشوونما بھی کی۔ قلب کی نشوونما اس کو عام زندگی میں عموماً مطمئن رکھتی ہے۔ وہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ایک مطمئن قلب لیے ہوتا ہے۔ یہ اطمینان اس کے چہرے پہ بھی نظر آتا ہے۔ قرآن کی زبان میں......

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ؕ

لیجیے! ایک پنتھ تین کاج...... بلکہ کئی کاج سامنے آ گئے۔ اس نے حسین کام کیے اس کے آس پاس رہنے والے اس کے بے ضرر اور خوبصورت کردار سے خوش ہوئے۔ کائنات میں حسین تخلیقات کا اضافہ ہوا اور اسے خوبصورت کام کر کے جو سرشاری اور مزہ نصیب ہوا اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا چہرہ نورانی اور پرسکون ہو گیا بلکہ اس کا قلب مطمئن ہو گیا۔ اس کی ذات نے نشوونما پائی اور یوں اس نے دنیا میں اپنے حصے کا کام مکمل کر لیا۔ جب اس نے اپنی زندگی اس طرح گزار دی تو اس دار فانی سے رخصت کے وقت اس دار حقیقی میں اللہ تعالیٰ نے بذات خود اس کے استقبال کے لیے اپنے دروازے وا کر لیے اور آواز آئی......

''یا ایتھا النفس المطمئنۃ ترجعی الیٰ ربک راضیۃً مرضیۃ ۝ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی''

''اے نفس مطمئنہ! لوٹ آ اپنے رب کی طرف۔ وہ تجھ سے راضی ہے تو اس سے راضی ہو جا۔ پس تو اس کے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

یہ ہے حسین کام کرنے کا نتیجہ اور میں سمجھتا ہوں قرآن کا یہ فلسفہ دنیا کا آسان ترین فلسفہ ہے۔ مثلاً ہم ایک ٹھیلہ لگانے والے شخص کو لیتے ہیں جوان پڑھ بھی ہے اور غریب بھی۔ لیکن اگر وہ نظریہء حسن کو اتفاقی طور پر اپنا لیتا ہے یا پھر خوش قسمتی سے شعوری طور پر...... تو ظاہر ہے وہ اپنے پرانے اور غریبانہ کپڑے ہر وقت اس لیے صاف ستھرے رکھے گا کہ صاف ستھرا ہونا حسن ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنے ٹھیلے کو بھی صاف ستھرا اور سجا کر رکھے گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے ٹھیلے پر رکھے پھلوں کو دھو کر ترتیب سے سجائے گا۔ یقیناً اس کے پھل تازہ اور اچھے بھی ہوں گے۔ اس کے پاس انہیں خوبیوں کی وجہ سے دور دور سے گاہک آئیں گے۔ اس کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوں گے۔ اس کی تعریف کریں گے۔ اس کی حسن پسندی کو سراہیں گے اور یوں اسے جو خوشگواریت اور سرشاری کا احساس ہوگا وہ رزق حلال کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی منور کر دے گا۔ آپ دیکھیے! ایک تو معاشرے کے لوگ اس سے خوش ہوئے دوسرا اس کی زندگی میں صاف ستھرے اور اجلے پن کی وجہ سے توازن آیا۔ معاشرے کو ایک خوبصورت شہری میسر آیا اور سب سے بڑا فائدہ اس ٹھیلے والے کو یہ ہوا کہ اسے حسن کا قرب نصیب ہوا۔ اسی حسن کا قرب...... جس کا قرب انسانی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

کتنا آسان ہے نظریہء حسن پر عمل پیرا ہونا اور کتنے دوررس فوائد ہیں اس معمولی سے کام کے' اور پھر وہی شخص جب اپنی زندگی کے آخری لمحے پر پہنچتا ہے تو مرتے ہوئے مطمئن ہوتا ہے کہ آگے بھی حسن ہی اس کا منتظر ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

نقش ہے سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

میں ذاتی طور پر بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اپنے تئیں اسی طرح کی زندگی گزار
کی کوشش کر رہے ہیں- انہیں میں میں ایک ہستی (۹۰) کو جانتا ہوں جو لاہور کے ایک پسماندہ
میں لگ بھگ ستر سال سے مقیم ہیں...... انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز (خطاطی) سے کیا-
صاف ستھری زندگی کے ساتھ ساتھ وہ خطاطی میں بھی نت نئی تخلیقات پیش کرتے رہے- اپنے
میں انہوں نے اتنا کمال حاصل کیا کہ بالآخر بیت اللہ شریف اور مسجد نبویؐ کے درو دیوار پر ان
ہاتھ کے لکھے ہوئے فن پارے کندہ کروائے گئے...... حسن کے اس تخلیقی، ارتقائی عمل کے ساتھ سا
انہیں برابر روحانی سرشاری بھی نصیب ہوتی رہی- اپنے کام سے لگن، تخلیق سے عشق نے انہ
اطمینان قلب کی دولت بھی بخشی اور اب یہ عالم ہے ایک دنیا ان کے حضور روحانی فیض حاصل کر
کے لیے چوبیس گھنٹے حاضر رہتی ہے...... وہ لوگ جو ان سے بیعت کر کے معرفت چاہتے ہیں- انہ
چاہئے کہ اس مطمئن شخص کی زندگی پر نظر کریں اور اپنے لیے تلاش حسن کی راہیں استوار کریں- اس
طریقہ سے انہیں روحانی فیض حاصل ہوگا اور اسی طریقہ سے وہ اپنے قلب کی نشوونما کر پائیں گے-
یہ ہیں نتائج اپنے کام کے ساتھ لگن اور عشق کے- جس کے لیے بقول اقبال...... ''جگر کا
خون صرف کرنا پڑتا ہے-''

جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے تو تخلیق وہ ہوتی ہے جو بعض محسوس اور غیر محسوس مبہم اجزاء کے ملنے
سے وقوع پذیر ہو اور کوئی متوازن چیز سامنے آئے- یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف حسین
چیز ہی تخلیق ہو سکتی ہے؟ کیا ایٹم بم کو تخلیق نہیں کہا جا سکتا؟ تو جواب یہ ہے کہ تخلیق حسین بھی ہوتی ہے
اور قبیح بھی- حسن رحمان کا ظہور ہے اور قبح شیطان کا- حسن توازن ہے اور قبح عدم توازن...... عدم
توازن گویا بگڑی ہوئی چیز- بگڑی ہوئی چیز یا عدم توازن ہمیشہ کسی سرکش قوت کے ہاتھوں تخلیق ہوتا
ہے- سرکشی کا مادۂ سرشت کائنات میں حسن کے تقابل کے طور پر ہر دم موجود ہے- شیطنیت کی غیر
موجودگی میں رحمان کی جستجو یا یوں کہیے کہ بدصورتی کی غیر موجودگی میں حسن کی جستجو بے معنی ہے
بالکل ایسے ہی جیسے رات کی عدم موجودگی میں دن کا تصور یا سائے کے بغیر روشنی کا یا جہالت کے بغیر

لم کا یا موت کے بغیر زندگی کا......(وما یستوی الاحیاء والاموات)
جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہر متوازن چیز حسین ہوتی ہے- کہتے ہیں کہ ملکہ ''قلوپطرہ'' کی
ک اگر تھوڑی سی ٹیڑھی ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا- توازن ہر مقام پر یعنی ظاہری اور
باطنی محسوس اور غیر محسوس غرض ہر سطح پر حسن ہوتا ہے- اگر نبی کریمؐ کے فرمان...... خیر الامور اوسطہا
پر...... نظر ڈالی جائے تو تین حروف میں قرآن کا پورا پیغام سمٹا ہوا دکھائی دیتا ہے- قرآن کا پیغام
بھی یہی ہے کہ دنیا و آخرت میں صرف جستجوئے حسن ہی مقصود کائنات ہے- قرآن حکیم میں ہے کہ

ربنا اتنا فی الدّنیا حسنة وفی الآخرة حسنة o
اے ہمارے رب! ہماری دنیا بھی حسین بنا اور آخرت بھی-

قرآن حکیم میں پیغمبر آخر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں ارشاد ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنةo
تحقیق تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں حسین نمونہ ہے-

دنیا جانتی ہے کہ روئے زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی متوازن اور حسین زندگی کسی
نے نہیں گزاری اور پیغمبر آخر کے ہاتھ انفس و آفاق کے توازن کا ہدایت نامہ انسانیت تک پہنچانا ہی
وہ ضرورت تھی جس کے پیش نظر آپ کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہترین معیار قرار دیا گیا-
اب انسان کا کام ہے کہ وہ کس طرح اور کس حد تک توازن قائم کرتا ہے- قرآن کریم میں جگہ
جگہ...... ''واقیموا الصلوٰة''...... کا لفظ اسی نظام کے قیام کے لیے استعمال ہوا ہے- معاملہ تخلیق کا
ہو یا عمل کا، فکر کا ہو یا وجدان کا، علم کا ہو یا اکتساب کا، غرض جو بھی ہو توازن قائم ہوتے ہی حسن کا
ظہور عمل میں آ جاتا ہے- جو نگاہوں کو خیرہ اور جگر کو گداز کر دیتا ہے اور قلب و نظر پر وجدانی کیفیت
طاری ہو جاتی ہے- سرشاری اور سرمستی کی اسی کیفیت کو لذت وصال کہتے ہیں- لذت وصال جو
قرب حسن کے نتیجہ میں ملتی ہے- ایک مرتبہ نصیب ہو جائے تو بقول غالب......

چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی

یہی وہ مقام ہے جہاں اقلیم الروح کو غذا ملنا شروع ہوتی ہے- باطن روشن ہونے لگتا ہے
بقول اقبال خودی کی نشوونما ہوتی ہے- گویا قلب جاری ہو جاتا ہے اور حصول حسن کی یہ خواہش ہر

انسان کی بنیادی خواہش ہے۔ اب وہی قبح، بدصورتی، عدم توازن یا شیطنیت جسے حسن کی پہچان اور پرکھ کے لیے معرض شہود وظہور میں لایا گیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے کا کام کرتی ہے۔ انسان جب اپنے اعمال میں اپنی فکری صلاحیتیں استعمال کرتا ہے تو اس کے اعمال متوازن ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ عشق ولگن سے اپنے اعمال وافعال کو سرانجام دیتا ہے تو فکر ترقی پا کر وجدان بن جاتی ہے۔ بقول اقبال...... ''وجدان فکر کی ترقی یافتہ شکل ہے (۹۱)۔'' یہی بات جرمن مفکر کانٹ بھی کہتا ہے۔ بہرحال انسانی اعمال جوں جوں متوازن ہوتے جاتے ہیں اور تخلیق جوں جوں مکمل ہوتی جاتی ہے۔ حسن اپنے جلوے نچھاور کرتا چلا جاتا ہے اور یوں اسے گویا حقیقت مطلقہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ یہ قرب اسے محسوس کی لذت سے غیر محسوس کی سرشاری اور سرمستی کی طرف لے جاتا ہے۔

جستجو اور لگن وجدان بن جاتی ہے تو انسان پر بے خودی، جنون اور عشق طاری ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھئے! کہ انسان کو اس نشے کی لت پڑ جاتی ہے اور اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ عشق کس قدر بے خطر، خودسر، منہ زور اور بے پرواہ قوت کا نام ہے جو کسی رکاوٹ اور مشکل کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بالفاظ دیگر انسان بہادر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بہادری بذات خود حسین عمل ہے۔ لہٰذا اس کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں ہوا کہ حسن عمل نے لذت وصال بخشی، لذت وصال نے ابدی آرزو کا رنگ اختیار کیا۔ ابدی آرزو جستجو بن گئی۔ بات جستجو سے آگے بڑھی تو جنون عشق کہلائی۔ گویا جگر میں آگ لگ گئی اور فرد کا اختیار ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے حصول حسن کے لیے کرتا ہے۔ وہ دیدار یار کے لیے اس قدر دیوانہ ہو رہا ہے کہ حسن کے آگے اپنی تمام فطری مذاحمتوں سمیت ہر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ میں اسی کو مقام فنا سمجھتا ہوں۔

جذبۂ جنس اور توازن کا قیام

قرآن حکیم جو اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کے قیام کے لیے انسانوں کو عطا فرمایا ہے۔ ہر سطح کی معاشرتی زندگی میں توازن کے قیام پر زور دیتا ہے۔ خصوصاً انسان نے جنسیت کے باب میں جو بے ضابطگیاں روا رکھی ہوتی ہیں۔ قرآن ان کا قبلہ درست کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن

ان لوگوں کو جو جنسی بے اعتدالیوں کا شکار ہیں۔ حد سے بڑھنے والے لوگ کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے......

''بل انتم قوم مسرفون''...... یقیناً تم حد سے گزرنے والے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ......

لنرسل علیهم حجارة من طین o مسومة عند ربک للمسرفین o

''تاکہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں یہ نشان کر دیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گزرنے والوں کے لیے''

حد سے گزرنا گویا اعتدال کی راہ چھوڑنا ہے یعنی عدم توازن۔ اسلام انسانیت کو تلقین کرتا ہے کہ اعتدال کی راہ نہ چھوڑو! اور خصوصاً جنسی حوالے سے حیوانوں کی طرح اپنی سفلی خواہشات کی پیروی مت کرو۔

اسلام نے انسان کو جنسی تسکین حاصل کرنے کے پورے پورے جائز مواقع فراہم کیے ہیں۔ لیکن مسئلہ اس وقت بگڑنا شروع ہوتا ہے جب ہم اپنے بچوں کی تربیت کے دوران اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ انہیں کل کلاں بالغ ہونا ہے اور ان میں فطری جنسی جذبہ بھی پیدا ہونا ہے اور وہ اپنی ان خواہشات کی تکمیل بھی چاہیں گے...... نظرانداز کر دینے کا تو یہ عالم ہے کہ ہم اپنی اولاد خصوصاً بچیوں کو سختی سے بعض ایسی نام نہاد اخلاقی حدود کا پابند بنا دیتے ہیں جن کی پابندی ہمارے بچے کبھی بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ پابندی ان پر اس طرح زبردستی ٹھونسی جاتی ہے کہ ان کی جنسی خواہش اصل سے بھی کہیں بڑھ کر سر اٹھاتی ہے اور نتیجہ جو نکلتا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز کی زیادتی بری ہوتی ہے۔ لہٰذا بے جا پابندیاں اور فضول قسم کا رہبانیت زدہ لٹریچر یا نصیحتیں اس مسئلے کا حل نہیں۔ اسلام انسان کے جبلی جذبوں کی قدر کرتا ہے اور لوگوں کو یہ راہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہشات کو صرف افزائش نسل کی ضرورت تک محدود رکھیں۔

باب ۵

انسان پر وراثت (جینٹکس) کے اثرات

سیارۂ زمین پر بسنے والی مخلوقات جو لاکھوں کروڑوں سال سے کائنات کے اس چھوٹے سے سیارے کو اپنا مسکن بنائے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں ہیں- سائنس دانوں نے انہیں کئی طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے- ہر طبقے کے ماتحت کئی کئی انواع ہیں- ہر نوع اپنا الگ طرز زندگی اور الگ بودوباش رکھتی ہے- ان انواع میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ نوع، نوع انسانی ہے- زندہ اشیاء جن خصوصیات کی وجہ سے زندہ سمجھی جاتی ہیں...... ان میں حرکت...... سانس لینا...... خوراک حاصل کرنا اور افزائش نسل شامل ہیں- ہر نوع اپنی نسل کو آگے بڑھانے کا رجحان رکھتی ہے اور ہر نوع اپنی اگلی نسل میں ایک خودکار نظام کے تحت بہت سی ہدایات اور زندگی گزارنے کے طریقے منتقل کرتی ہے- مثلاً شہد کی مکھی اپنے تولیدی جراثیم کے ذریعے اپنی اولاد کو یہ بتا دیتی ہے کہ انہیں کس طرح زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے- اسی طرح گھوڑا اپنے بچوں کو بتا دیتا ہے کہ اسے کس طرح دوڑنا یا وزن اٹھانے کے لیے اپنی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط بنانا ہے- بات کو مزید واضح کیا جائے تو یوں ہوگی کہ کسی نوع کی ایک نسل کے بعد اگلی نسل جس قسم کی جسمانی ساخت، طرز زندگی اور جبلت لے کر آتی ہے اسے وراثت یا جینٹکس کہتے ہیں- وراثت کے لیے جاندار اپنے آپ کو پورے کا پورا اپنی اولاد میں منتقل کر دیتا ہے اور جب خود مر جاتا ہے تو اس کی اگلی نسل اس کے سابقہ وجود کو برقرار رکھتی ہے- جو جاندار جس قسم کی پیچیدہ ساخت کا مالک ہو اس کی اگلی نسل میں اسی قسم کے پیچیدہ پیغامات اور ہدایتیں منتقل ہوتی ہیں- پودوں اور جانوروں میں عموماً رنگ روپ، قد کاٹھ، چستی سستی اور چند دیگر افعال اگلی نسل میں بذریعہ جینز منتقل ہوتے ہیں- البتہ انسانوں کا معاملہ تمام جانداروں میں سب سے زیادہ مختلف اور پیچیدہ ہے- چونکہ انسان کے تولیدی خلیہ کے ذریعے صرف قد کاٹھ، رنگ و روپ، آواز وغیرہ ہی منتقل نہیں ہوتے- بلکہ جو چیز سب سے زیادہ پیچیدہ ہے اور بذریعہ جنسی خلیہ اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہے، وہ ہے نفسیات- کتنی عجیب بات ہے کہ انسانی نفسیات ماں اور باپ کے خلیے سے

بچے کے خلیے میں چلی آتی ہے- جس کے ساتھ بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی مبہم اور مشکل باتیں بھی اولاد میں موروثی طور پر پہنچ جاتی ہیں- مثلاً جانور جنسی ملاپ کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سونگھتے ہیں اور خاص قسم کی شہوت انگیز بو پا کر اختلاط کے عمل کا آغاز کرتے ہیں- لیکن انسان کا بچہ بچپن ہی میں عموماً اپنے جنسی اعضا یا اپنے ساتھ سکول میں پڑھنے والی بچی کے جنسی اعضا کے اصل مقصد کو پہچان لیتا ہے- یہاں تک بات ہمارے موضوع حاضر کی مثال نہیں- یہاں سے آگے یوں ہوتا ہے کہ لڑکی اور لڑکا بالغ ہونے سے پہلے ہی اپنے جنسی اعضاء کو تحریک دیتے اور لطف لیتے ہیں- حالانکہ انہیں نہ کسی قسم کی بو آئی اور نہ ہی افزائش نسل کی ضرورت محسوس ہوئی- چنانچہ جب انسانی بچہ لڑکا بننے کے بعد بلا ضرورت جنسی عمل کی خواہش کرتا ہے...... اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہر لڑکا اسی قسم کی خواہش رکھتا ہے...... تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح جانوروں کے والدین نے انہیں جنسی خوشبو سونگھنے کی حس وراثت میں بخشی- اسی طرح انسان کا بچہ جنسی بے راہ روی کی نفسیاتی تحریک وراثت میں ساتھ لے کر آیا- یہ مثال اگرچہ طویل تھی لیکن ہم نے موضوع کتاب کی وجہ سے بیان کرنا مناسب سمجھی- البتہ مزید وضاحت کے لیے ہم یہ مثال لے سکتے ہیں- ایک لڑکا سرد مزاج ہے، جلد غصہ نہیں کرتا جبکہ دوسرا گرم دماغ ہے اور جلد غصے میں آ جاتا ہے تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ ان کی اس فطرت یا مزاج میں ان کے والدین کے جینز کو بھی دخل ہے- جینز کس طرح اگلی نسل میں منتقل ہوتے ہیں اور کس طرح پچھلی نسل کی عادات اور شکل و صورت کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں- اس کے لیے ہمیں عمل تولید کا پورا پراسیس دیکھنے کی ضرورت ہے-

میاں بیوی میں مباشرت

انسانوں میں زیادہ تر مرد اور عورت میاں بیوی کے نام سے ایک جوڑے کی صورت میں اکٹھے زندگی گزارتے ہیں- جہاں ان کی اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں وہاں معاشرے کو نئی نسل فراہم کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے- جانوروں میں تو یہ ہے کہ بار آوری کے خاص موسم میں وہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور نئی نسل پیدا کرنے کا انتظام کرتے ہی ایک دوسرے

سے الگ ہو جاتے ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کے بعض جوڑے اولاد پیدا ہونے کے بعد بھی دیر تک اکٹھے رہتے ہیں۔ لیکن انسانوں میں معاشرتی زندگی کی وجہ سے معاملہ اس سے بہت مختلف ہے۔ انسانوں میں والدین اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا ذمہ بھی اٹھاتے ہیں اور انہیں جوان ہونے کے بعد بھی یا بعض صورتوں میں عمر بھر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں میں شروع دن سے یعنی جوڑا بننے کے دن سے ہی یہ طے ہو جانا چاہئے وہ کس قسم کی اولاد پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کس طرح ان کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے اور انسان بھی زیادہ تر جانوروں کی طرح بغیر سوچے سمجھے اولاد پیدا کر بیٹھتے ہیں۔

اس زمانہ میں چونکہ سائنس نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ ثابت کر دیا ہے کہ وراثت کے ذریعے اگلی نسلوں میں ہر قسم کی خصوصیات منتقل کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا انسانی جوڑے کو جو باشعور ہے شادی سے پہلے ہی یہ سوچ لینا چاہیے کہ انہیں کس طرح اپنے فرائض سرانجام دینے ہیں۔ وہ اگر دیکھیں کہ ان کی عادات اور مزاج ایک دوسرے سے نہیں ملتے تو انہیں چاہئے کہ وہ ایک رشتے میں بندھے جانے کا خیال ترک کر دیں۔ کیونکہ جب دو مختلف المزاج میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کو زندگی گزارنے کے لیے بھرپور مدد نہیں دے سکتے تو ظاہر ہے کہ ان کی اولاد ان کے آپس کے تعلق کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی اور خود گمراہ ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ لڑکی اور لڑکے کا میاں بیوی کے رشتے میں بندھے جانے سے پہلے ہم مزاج ہونا ضروری ہے۔

اب اس کے بعد وہ مرحلہ آ جاتا ہے جب میاں بیوی ہم بستر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایک انتہائی اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ میاں بیوی کی مباشرت جو فطرتاً افزائش نسل کے لیے ہوتی ہے حقیقتاً...... افزائش نسل کے لیے ہی ہو لیکن عموماً ہوتا یوں ہے کہ میاں بیوی شادی کے بعد دن رات بلاضرورت صرف جنسی حظ حاصل کرنے کے لیے ہم بستر ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں دور کہیں یہ شائبہ تو ہوتا ہے کہ ان کے اس عمل سے...... ہوسکتا ہے بچہ پیدا ہو جائے۔ لیکن کسی باقاعدہ پروگرام کے تحت وہ ایسا نہیں کرتے...... حالانکہ دوسرے جانوروں کی نسبت انسان ہونے کے ناطے ان کی کہیں زیادہ یہ ذمہ داری ہے...... کہ وہ اپنے جنسی اختلاط کے عمل کو افزائش نسل کے لیے صحیح طریقے سے اپنائیں تاکہ ان سے پیدا ہونے والی اولاد انسانی معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔

پھر اس کے بعد یہ بات آ جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم بستر کیسے ہوتے ہیں

دوسرے جانوروں کا تو یہ ہے کہ وہ محض جنسی اعضاء کے ملاپ سے اپنی فطری ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان کے ہاں ایک دوسرے کے لیے جنسی اعضاء کے علاوہ باقی جسم میں بھی کشش پائی جاتی ہے اور یہ چیز بھی انسان کے ہاں بذریعہ جینز منتقل ہوئی۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو سر سے لے کر پاؤں تک بوقت ملاپ استعمال کرتے ہیں اور جنسی اعضاء کے ملاپ سے پہلے تک کافی دیر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹتے اور بوس و کنار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے بدن میں خون کی گردش اور حدت بڑھ جاتی ہے اور جنسی اعضاء اپنے صحیح قدرتی اعمال سرانجام دینے کے اتنے قابل نہیں رہتے جتنا کہ کسی دوسرے جانور کے ہوتے ہیں۔ دیر تک اس قسم کی حرکات وسکنات سے نفسیاتی طور پر یہ منفی اثر پڑتا ہے کہ میاں بیوی کو اصل مقصد یعنی افزائش نسل بالکل بھول جاتا ہے اور وہ ایک خالص سفلی جذبے کی تسکین کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اصل مقصد کو بھلا دینے سے ان کی ہوس اور عجلت کے اثرات ان جرثوموں پر بھی پڑتے ہیں جو آگے چل کر بچہ بننے والے ہیں۔ کثرت جماع سے مادۂ منویہ پتلا ہو جاتا ہے اور مرد کے دم دار تولیدی خلیے اس میں مناسب حرکت نہیں کر سکتے۔ خلیوں کی حرکت سست ہونے سے نر اور مادہ جرثوموں کا ملاپ صحت مند انداز میں نہیں ہو پاتا۔ نتیجتاً بچے بیمار اور کمزور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند مرد کا مضبوط عضو تناسل ایک صحت مند عورت کی مضبوط اندام نہانی میں داخل ہو کر جو مادۂ منویہ خارج کرتا ہے اس میں تیزی سے حرکت کرتے ہوئے مرد کے تولیدی خلیے عورت کے تندرست انڈے کے ساتھ مل کر ایک صحت مند بچے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مرد کے تولیدی خلیے ''خصیوں'' کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور عورت کے یہ خلیے ''اوور یز'' یا ''خصیۃ الرحم'' میں بنتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے خصیے پیٹ کے اندر اوپر کی طرف چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن پیدائش کے فوراً بعد لڑھک کر نیچے آ جاتے اور عمر بھر جلد کی ایک تھیلی میں لٹکے رہتے ہیں۔ نر خلیے پیدا ہونے کے لیے قدرے کم درجہ حرارت کی ضرورت ہے۔ اس لیے قدرت نے اس تھیلی کو عام ہوا میں باہر رکھنے کا انتظام کیا ہے۔ عورت کے تولیدی خلیے جو اووریز میں تیار ہوتے ہیں۔ انہیں تیار ہونے کے لیے قدرے زیادہ درجہ حرارت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیٹ کے اندر قدرے گرم ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ بچوں اور بچیوں میں بلوغت سے پہلے تک تولیدی خلیے پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ ان

کے پیدا ہونے کا اہتمام قدرت ساتھ ساتھ کرتی رہتی ہے۔ مرد کا تولیدی خلیہ ساخت کے اعتبار سے انتہائی باریک لیکن لمبی سی دم والا ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کا خلیہ جو انڈا کہلاتا ہے زیادہ باریک نہیں ہوتا اور عام پرندوں کے انڈوں جیسا ہوتا ہے۔ مرد کے تمام نر خلیے خصیوں کی پرت در پرت ''فصوص'' سے نکل کر ایک پر پیچ نالی میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس نالی کا منہ ''سپر میٹک ڈکٹ'' میں کھلتا ہے۔ جماع کے وقت پر پیچ نالی کی دیوار سکڑتی ہے اور تمام خلیے جو کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں ''سپر میٹک ڈکٹ'' میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ''ڈکٹ'' باہر نکل کر ران کے جوڑ کے اوپر ''سپر میٹک کاڈ'' میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں سے یہ پیٹ میں داخل ہو کر پھر پچھلی جانب مڑتی ہے اور ''غدہ قدامیہ'' تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں سے یہ دوسری غدودوں کی نالیوں کو چھوتی ہوئی پیشاب کی نالی یعنی عضو تناسل میں جا کھلتی ہے۔ اسی مقام پر مثانہ بھی پیشاب کی نالی میں کھلتا ہے۔ جماع کے وقت نر کے مادۂ منویہ میں نر خلیے دم ہلانی شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ......

''خلق من ماء دافق'' وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا۔

عورت کی بیض نالی کا آخری سرا قیف کی شکل کا ہوتا ہے اور لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ بیض نالی کا دوسرا سرا رحم کے اندر کھلتا ہے۔ رحم کی دیوار عضلات کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں پھیلنے اور سکڑنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمل کے دوران عورت کا رحم بہت پھیل جاتا ہے۔ رحم کا منہ اندام نہانی میں کھلتا ہے۔ عورت کی اووری کی بیرونی سطح پر انڈے بنانے والے خلیے ہوتے ہیں۔ مرد کا سپرم یعنی نر خلیہ اور عورت کا انڈا خارج ہونے کے بعد چند گھنٹے تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ حمل ٹھہرنے کا بہترین وقت وہ ہے جب بیضہ پختگی کے بعد اووری سے خارج ہوتا ہے۔ اسی موقع پر مرد کا مادۂ منویہ اگر عورت کی اندام نہانی میں داخل ہو جائے تو کچھ سپرم مادۂ منویہ کے لیس دار پانی میں دم ہلاتے اچھلتے کودتے عورت کی بیض نالی میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق مرد کے ایک عام انزال میں چالیس کروڑ نر خلیے ہوتے ہیں۔ جبکہ عورت کا ایک ماہواری کے دوران صرف ایک خلیہ پیدا ہوتا ہے۔ جب اتفاق سے کبھی کسی عورت کے دو انڈے پیدا ہو جاتے ہیں...... یا دو سے زیادہ تو اتنے ہی سپرم ان سے جا ملتے ہیں اور یوں جڑواں یا دو سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ نر خلیے اس لیے زیادہ ہوتے ہیں کہ انہیں انڈے تک پہنچنے کے لیے بہت سے دشوار گزار راستے طے

کرنے پڑتے ہیں اور یوں بہت سے خلیے ضائع ہو جاتے ہیں۔ جونہی مرد کا سپرم عورت کے انڈے کی جھلی کو چھوتا ہے تو اس کا نر بیضے کی لچکدار سطح میں پھنس جاتا ہے۔ یعنی بیضہ اسے نگل لیتا ہے۔ سپرم کی دم پیچھے رہ جاتی ہے اور اس کا سر انڈے کے ساتھ مل کر زائیگوٹ بناتا ہے۔

زائیگوٹ کی کہانی

جس لمحے مرد کا سپرم اور عورت کا انڈا آپس میں ملتے ہیں وہی لمحہ ہوتا ہے جب کسی نئے انسان کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اسے ''جفتہ'' یا ''زائیگوٹ'' کہتے ہیں۔ کسی ''جفتہ'' کا رحم کے اندر نشوونما پانے کا عمل مل کہلاتا ہے۔ یہاں بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز بات رونما ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ''زائیگوٹ'' جو مرد اور عورت کے دو جنسی خلیوں سے مل کر بنتا ہے۔ خلیاتی تقسیم کے قدرتی عمل سے گزرتا ہے۔ یعنی اندر ہی اندر خود بخود تقسیم ہو کر ایک سے دو ہو جاتا ہے۔ دو سے چار، چار سے آٹھ اور یوں بڑی تیزی سے زائیگوٹ میں خلیوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور بالآخر خلیوں کا ایک مجموعہ بن جاتا ہے جسے ''مورولا'' کہتے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ زائیگوٹ بیضی نالی کے اندر اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور ایک ہفتہ کے بعد یہ زائیگوٹ رحم مادر میں جا پہنچتا ہے۔ رحم مادر کی دیواریں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور بارہ ہفتے تک رحم کی دیوار میں نئی غدودیں اور خون کی نالیاں بنتی رہتی ہیں۔ رحم کی دیوار ساتھ کے ساتھ مضبوط اور موٹی ہو جاتی ہے اور وہ زائیگوٹ جو بارہ ہفتے پہلے یہاں آیا تھا زائیگوٹ سے ''جنین'' بن جاتا ہے۔ جنین کی بیرونی تہیں آکسیجن حاصل کرتی ہیں اور زندگی کا سفر رواں دواں ہو جاتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ جنین کے خون کی نالیاں ماں کی خون کی نالیوں سے جا ملتی ہیں اور دونوں خون میں کیمیائی مادوں کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے۔ آکسیجن اور خوراک ماں کے خون سے ''جنین'' میں اور فاضل مادے جنین سے الٹی طرف پھر جاتے ہیں۔ جنین کے گرد پانی تالاب کی طرح موجود ہوتا ہے اور یہ ابتدائی قسم کا بچہ یا جنین ایک طرح سے پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ لیکن قدرت نے ایسے لیسدار مادوں کا انتظام کیا ہے کہ جنین پانی کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بچے کے اعضاء بننا شروع ہوتے ہیں۔ زائیگوٹ بننے کے تین ہفتے بعد تک ''جنین'' خشخاش کے ایک دانے کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن انتہائی حیرت کی

بات ہے کہ چار ہفتے مکمل ہونے پر جنین کی آنکھیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور دل حرکت کرنے لگتا ہے- پانچویں ہفتے میں ٹانگیں' بازو' کان حتیٰ کہ کسی حد تک اعصابی نظام بھی بن جاتا ہے اور آٹھویں ہفتے میں ایک انچ کے قریب ننھا منا انسان کسی حد تک مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی شکل پہچانی جا سکتی ہے- اس مرحلے میں اسے ''ایمبریو'' کہتے ہیں- بارہویں ہفتے تک یعنی تین مہینے بعد بچے کے کان اپنا کام شروع کر دیتے ہیں- بچہ ماں کے پیٹ کے اندر پانی میں حرکت کرنا شروع کرنے لگتا ہے- آنکھوں کے پپوٹے ابھی بند ہوتے ہیں لیکن ان میں ڈھیلے حرکت کرنے لگ جاتے ہیں- پانچ ماہ تک بچہ آٹھ انچ لمبا ہو جاتا ہے اور اس کا وزن تقریباً ایک پونڈ ہو جاتا ہے- اس وقت اس کی انفرادی شکل پہچانی جا سکتی ہے-

خلیاتی تقسیم کی قدرتی ہدایت

زائیگوٹ کی کہانی میں ہم نے ذکر کیا کہ زائیگوٹ حمل کے پہلے دن سے ہی خود بخود تقسیم ہو کر ایک سے دو' دو سے چار' چار سے آٹھ اور اسی طرح کئی خلیوں میں بٹتا چلا جاتا ہے..... زائیگوٹ خود بخود تقسیم ہونا شروع کیوں ہوا- اس کے خلیات ایک سے دو' دو سے چار کیوں ہوئے- یہ سمجھنے کے لیے ہمیں خلیاتی تقسیم کی قدرتی ہدایت پر غور کرنا پڑے گا- اس باب میں ہم نے عورت اور مرد کے جنسی ملاپ اور زائیگوٹ سے بچہ بننے تک کی کہانی اس لیے بیان کی ہے تا کہ ہم جینز کے اس چکر کو آسانی سے سمجھ سکیں- جس کی بدولت انسانی خصلتیں مرتب ہوتی ہیں اور خلیاتی تقسیم کی قدرتی ہدایت کو دیکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ ہم جینز کی ماہیت اور انسانی کردار پر اس کے اثرات کی وجہ معلوم کر سکیں- جانداروں کے خلیے سائنس دانوں کے بقول دو طریقوں سے اپنی تعداد بڑھاتے ہیں- ایک طریقے کو ''می اوسس'' اور دوسرے کو 'مائی ٹوسس' کہا جاتا ہے- دراصل اگر خلیے کی ساخت ملاحظہ کی جائے تو ہمیں اس میں بہت سے اجزاء یا اعضاء نظر آئیں گے- خلیے کئی قسم کے ہوتے ہیں اور جسمانی ضرورتوں کے لحاظ سے ان کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں- خلیہ جانداروں کے جسم کی اکائی ہے- جس طرح کسی عمارت کی اکائی ایک اینٹ ہوتی ہے اور اینٹ سے مل کر عمارت بنتی ہے- اسی طرح خلیہ بھی اکائی ہے اور خلیہ سے خلیہ مل کر جسم بنتا ہے- زمین پر

جو آزاد یعنی اکیلے زندہ خلیے دستیاب ہیں ان میں پرندوں کا انڈا قابل فہم مثال ہے- ہم اگر مرغی کے انڈے کو ذہن میں لائیں تو ہمیں اس کے اندر مختلف چیزیں نظر آتی ہیں- اس کے مرکز میں زردی ہے جو اس زندہ خلیے کی خوراک کا ذخیرہ ہے اور اس کے سفید حصے میں جسے سائٹوپلازم کہتے ہیں دوسرے کارآمد اجزاء ہیں- خلیے کے اندر کچھ ذرات ایسے ہیں جو اس کے لیے آکسیجن فراہم کرتے ہیں- انہیں مائٹو کانڈریا کہتے ہیں- خلیے کے فاضل مادے خارج کرنے والے عضو کو ''کنٹریکٹائل ویکیول'' کہا جاتا ہے- خلیے کا مرکزی حصہ جسے زردی یا نیوکلیئس کہا جاتا ہے اپنے اندر ایک انتہائی اہم چیز چھپائے ہوئے ہے- جنہیں ''کروموسومز'' کہتے ہیں- یہ ''کروموسومز'' خلیاتی تقسیم میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں- ''کروموسومز'' پروٹین اور ''نیوکلیک ایسڈ'' سے مل کر بنے ہوتے ہیں- اس مرکب کو ''نیوکلیو پروٹین'' بھی کہتے ہیں- ''نیوکلیو پروٹین'' کا اہم ترین جزو دو قسم کے تیزاب ہیں- ایک کا نام ہے ڈی آکسی نیوکلیک ایسڈ (DNA) اور دوسرے کا نام ''رائبو نیوکلیک ایسڈ'' (RNA)- کروموسومز شکل کے لحاظ سے دھاگہ نما لمبے لمبے ہوتے ہیں- ہر ''کروموسوم'' دو ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے دھاگوں سے مل کر بنتا ہے- اگر دھاگوں کے اس جوڑے کو الگ الگ کر دیا جائے تو ہر دھاگہ ایک ''کرومیٹڈ'' کہلاتا ہے- ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ ''کروموسومز'' ڈی این اے اور آر این اے یا دوسرے الفاظ میں نیوکلیو پروٹینز سے مل کر بنے ہیں- دراصل وہ ''کومیٹڈز'' ہی ہیں جو ان مرکبات سے مل کر بنے-

جب ایک خلیہ اپنے آپ کو تقسیم کر کے دو خلیات میں بٹتا ہے تو یوں ہوتا ہے کہ اس کے یہی کروموسومز جو دو دو کرومیٹڈز سے مل کر بنے تھے- اپنے کرومیٹڈز کو الگ الگ کر لیتے ہیں- مثلاً ایک خلیے میں آٹھ کروموسومز ہیں (یاد رہے کہ شہد کی مکھی کے خلیے میں آٹھ کروموسومز ہوتے ہیں) تو گویا وہ دراصل سولہ کرومیٹڈز ہیں- خلیہ جب دو حصوں میں تقسیم ہونے لگتا ہے تو اس کی سب سے اہم چیز یعنی یہ کرومیٹڈز آدھے آدھے دونوں حصوں میں چلے جاتے ہیں یعنی ایک حصے میں آٹھ اور دوسرے حصے میں آٹھ- اب یوں ہوتا ہے کہ یہی کرومیٹڈز اپنے الگ الگ حصوں میں جا کر مکمل کروموسومز بن جاتے ہیں- اس کے ساتھ کچھ دوسرے عوامل بھی ہوتے ہیں- مثلاً سینٹروسوم بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور ہر حصہ ''سینٹری اول'' کے نام سے نئے پیدا ہونے والے خلیوں

میں پہنچ جاتا ہے- بعدازاں خلیہ درمیان سے پچک کر ٹوٹ جاتا ہے اور ایک خلیے سے دو بن جاتے ہیں جنہیں ”دختر خلیات“ کہتے ہیں- خلیات کی یہی قدرتی تقسیم زائیگوٹ میں رو پذیر ہوتی ہے- جس کی رفتار انتہائی تیز ہوتی ہے اور یوں وہ ایک باریک سا نقطہ جو کبھی زائیگوٹ تھا- لاکھوں اور کروڑوں خلیوں کا مجموعہ بن کر ایک ننھا سا جسم یعنی بچہ بن جاتا ہے-

کروموسومز کا کمال

ہر جاندار کے بنیادی خلیات کے ”کروموسومز“ کی تعداد مختلف ہوتی ہے- مثلاً شہد کی مکھی کے خلیے میں آٹھ کروموسومز پیاز کے خلیے میں سولہ اور انسان کے خلیے میں تیئس کروموسومز ہوتے ہیں- ہم بتا چکے ہیں کہ ہر کروموسوم دو کرومیٹڈز کا ایک جوڑا ہے- اس طرح انسان کے تیئس کروموسومز اصل میں چھیالیس کرومیٹڈز ہوئے- مرد کے سپرم میں کروموسومز کے ۲۳ جوڑوں کو سائنس دانوں نے اس طرح نام دیئے ہیں کہ پہلے جوڑے سے لے کر ۲۲ ویں جوڑے تک "AA" اور تیئسواں جوڑا "XY" ہے-

جبکہ عورت کے تولیدی خلیے یعنی انڈے کے اندر موجود کروموسومز کے تیئس جوڑوں کو سائنس دانوں نے "AA" اور اسی طرح آخری جوڑے کو "XX" کا نام دیا ہے- جب زائیگوٹ بنتا ہے تو مرد اور عورت کے جوڑوں میں سے ایک ایک "A" یعنی ایک ایک کرومیٹڈز نکل کر آتا ہے اور ایک تیسرا خلیہ بنانے کے لیے دونوں طرف کے "A" کروموسوم مل کر نئے ۲۲ جوڑے بنتے ہیں-

نر نسبتی خلیے کے کروموسومز:

A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A X
A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A Y

مادی نسبتی خلیے کے کروموسومز:

A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A X
A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A X.

اب ہوتا یوں ہے کہ مرد کے جوڑوں میں...... ہر جوڑے میں سے ایک کرومیٹڈ یعنی "A" اور اسی طرح عورت کے جوڑوں میں‘ ہر جوڑے میں سے ایک کرومیٹڈ...... یعنی A نکل کر آپس میں ملے تو "A" "A" کے نئے بائیس جوڑے وجود میں آئے- مرد کے کروموسومز کا...... تیئسواں جوڑا "XY" ہے اور عورت کے کروموسومز کا تیئسواں جوڑا "XX"- ماں کے پیٹ میں لڑکا یا لڑکی بننے کا انحصار انہیں دو جوڑوں پر ہوتا ہے اور بچی یا بچہ بننے کے چانسز ففٹی ففٹی ہوتے ہیں- حمل کے ابتدائی مرحلے میں جب کوئی سپرم کسی عورت کے انڈے کے ساتھ ملتا ہے تو مرد کے "22A" اور عورت کے "22A" آپس میں مل جاتے ہیں- لیکن مرد کا تیئسواں جوڑا جو "XY" ہے- عورت کے تیئسویں جوڑے "XX" کے ساتھ ملتے وقت وہ عظیم سانحہ رونما ہوتا ہے جسے بچے یا بچی کی پیدائش کہتے ہیں- ہوسکتا ہے مرد کی طرف سے "X" آئے اور ظاہر ہے عورت کی طرف سے تو "X" ہی آئے گا- اس طرح نئے خلیے میں "23" کے "23" جوڑے عورت کے کروموسومز جیسے بن جائیں گے- ظاہر ہے بچی پیدا ہوگی- لیکن اگر مرد کی طرف سے "X" کی بجائے "Y" آئے اور ظاہر ہے عورت کے تیئسویں جوڑے سے پھر بھی "X" ہی آئے گا تو ایسی صورت میں کروموسومز کے تمام جوڑے مرد کے خلیے سے مشابہ ہو جائیں گے اور یوں بچہ پیدا ہوگا- یہ بات نئے پڑھنے والوں کے لیے قدرے مشکل تو ہے لیکن ایک دو بار غور کرنے سے واضح ہوسکتی ہے- اگر میاں بیوی ہم بستری سے پہلے اپنے کمرے اور گھر کے ماحول میں نیلے رنگ اور نیلی روشنیوں کا اضافہ کر دیں تو بچی پیدا ہونے کے چانسز زیادہ ہو جاتے ہیں- اسی طرح اگر گھر کے ماحول میں سرخ رنگ یا گلابی روشنیوں کا اضافہ کر دیں تو نرینہ اولاد پیدا ہونے کی توقعات کی جا سکتی ہیں- یہ تجربہ پرندوں کے انڈوں کے خول پر نیلی اور سرخ روشنیاں ڈال کر کیا گیا ہے (۹۲)-

کروموسومز کے ان جوڑوں کی ترتیب بدل کر نر اور مادہ بچے پیدا کرنے کی کوششیں آج سے کئی سال پہلے کر لی گئی ہیں- جبکہ ہمارے ہاں ابھی تک قرآن کی آیت کا مفہوم نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ پیٹ میں بچی یا بچہ ہونے کی خبر دینا ممکن نہیں- حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ”سلوتری“ (جانوروں کا ڈاکٹر) گائے کے رحم میں بچھڑے یا بچھڑی کا بیج اپنی مرضی سے رکھ لیتا ہے- آج کل تو یورپ کے سائنس دانوں نے کروموسومز میں

ردوبدل کرنے کی مہارت حاصل کر لی ہے اور نت نئے حیران کن تجربات سامنے آ رہے ہیں۔

مینڈل کے قوانین وراثت

مشہور ماہر وراثت "جان گریگر مینڈل" نے ۱۸۶۵ء میں یعنی آج سے ایک سو چھتیس سال قبل "مٹر" کے پودوں پر انتہائی حیران کن تجربات کیے اور اس نے سالہا سال کے تجربات کے بعد یہ ثابت کیا کہ پہلی نسلوں کی خصوصیات آنے والی نسلوں میں ایک خاص ربط اور ترتیب کے ساتھ منتقل ہو جاتی ہیں۔ اس نے دو قوانین وضع کیے جن میں ایک "لاء آف سیگریگیشن" اور دوسرا "لاء آف اینڈیپنڈنٹ اسارٹمنٹ" ہے۔ "مینڈل" نے بتایا کہ والدین پودوں کی خصوصیات اولاد پودوں کی پہلی نسل میں منتقل ہوتے وقت ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں یعنی ایک سرخ پھول والا پودا ایک سفید پھول والے پودے کے ساتھ جنسی ملاپ کرتا ہے تو ان سے گلابی پھول والے پودے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہی نسل جس کے پھول گلابی ہیں جب آپس میں ملاپ کرتی ہے تو تیسری نسل میں پچاس فیصد کے حساب سے پہلی نسل والی خصوصیات لوٹ آتی ہیں۔ پچاس فیصد سے مراد یہ ہے کہ تیسری نسل کے آدھے پودے تو گلابی ہی رہتے ہیں باقی آدھوں میں سے آدھے پہلی نسل کی طرح سرخ اور آدھے سفید ہوتے ہیں۔ یعنی سو فیصد میں سے پچاس فیصد گلابی ہی رہے۔ باقی کے پچاس فیصد میں سے ۲۵ فیصد سفید اور ۲۵ فیصد سرخ پیدا ہوئے۔ یہ بات اس لیے نئی اور حیران کن تھی۔ کیونکہ جب دوسری نسل کے گلابی پودوں کو آپس میں ملایا گیا تھا تو ہونا یوں چاہئے تھا کہ آئندہ سارے پودے گلابی ہی پیدا ہوتے۔ لیکن قانون قدرت یہ ہے کہ پہلی نسل کی خصوصیات جو دوسری نسل میں کہیں گم ہو گئی تھیں تیسری نسل میں ایک بار پھر سامنے آ گئیں۔ "مینڈل" کے اس قانون کا نام "لاء آف سیگریگیشن" ہے۔ مینڈل کا دوسرا قانون "لاء آف انڈیپنڈنٹ" کے تجربات بھی مٹر کے پودوں پر کیے گئے۔ مینڈل نے اپنے قوانین سے یہ ثابت کیا کہ جانداروں میں ان کی خصوصیات نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب پہلی نسل کی خصوصیات پوری کی پوری اگلی نسلوں میں دوبارہ سامنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً یوں بھی ہوسکتا ہے کہ دادا...... شکل وصورت اور خصلتوں کے حوالے سے اپنے پوتے، پڑپوتے یا اس سے بھی آگے

کسی نسل میں پورے کا پورا ہو بہو دوبارہ پیدا ہو جائے۔ یہ بات عجیب بھی ہے اور حیران کن بھی۔ انسان کی زندگی چونکہ مختصر ہے اس لیے ہم اپنے باپ یا زیادہ سے زیادہ دادا کی شکل یاد رکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دو یا تین چار نسلوں کے آگے پیچھے ہونے سے شکلوں اور خصلتوں کا ہو بہو توارد ہو جائے۔ مٹر کے پودے تو انتہائی سادہ اور سمجھ میں آنے والی چیز ہیں۔ جبکہ انسان حد سے زیادہ پیچیدہ اور نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے جینز کے ذریعے جو باتیں اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کر دیتا ہے۔ ان کا حادثاتی یا اتفاقی اعادہ ہمیں حیران کر دیتا ہے۔ لیکن مینڈل کے قوانین کی روشنی میں ہمیں ایسے موقع پر حیران ہونے کی بجائے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ شاید یہ پیش آمدہ اعادہ پچھلی نسلوں میں سے کسی کا ہو۔ ہم بات کو مزید واضح کرتے ہیں۔ ایک شخص کسی انوکھی بیماری کا شکار ہے اور اس سے یک لخت ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ اسے پاگل یا آسیب زدہ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کی وہ نفسیاتی بیماری جینز کے ذریعے اس کے آباؤ اجداد سے اس تک آ پہنچی ہو۔

جینز

پچھلی صدی کے آغاز میں جو انقلاب آئن سٹائن کے نظریہء اضافت نے برپا کیا۔ اسی صدی کے وسط میں اس کا ایک خطرناک نتیجہ ایٹم بم کی صورت میں سامنے آیا اور پچھلی صدی کے اختتام میں کمپیوٹر نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ان کی مثال ہزاروں سال میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن سائنس کے ان تمام انقلاب آفریں اقدامات کے ساتھ...... ماہرین حیاتیات نے "جینز" کے میدان میں جو دھماکہ خیز کارروائیاں کیں وہ ایٹم بم اور کمپیوٹر کی ایجادات سے بھی زیادہ حیران کن اور خطرناک ہیں۔ ماہرین وراثت نے دنیا کو بتایا کہ انسان اپنے تولیدی خلیات کے ذریعے اپنی اگلی نسلوں کو محض دو چار یا آٹھ دس خصوصیات ہی منتقل نہیں کرتا بلکہ وہ خصلتیں، عادتیں اور نفسیات جو انسان جینز کے ذریعے اپنی اولاد کے تخم میں ڈال دیتا ہے۔ ہزاروں یا لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں ہیں۔ سائنس دانوں نے ابھی تک جینز کو تسخیر کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ نامکمل اور ادھوری ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ سر پھرے لوگ ایک نہ ایک دن انسانی

جینز کے ذریعے منتقل ہونے والی زیادہ تر خصوصیات جان جائیں گے- حالانکہ جینز جو خلیے میں کروموسومز پر واقع ہوتے ہیں اس قدر باریک چیز ہیں کہ دیکھے نہیں جا سکتے -لیکن ان میں کمپیوٹر کی ڈسک کی طرح لاکھوں کروڑوں ہدایات فیڈ (Feed) ہوتی ہیں- ایسی ایسی ہدایات کہ عقل کو حیران ہونے کے لیے جگہ نہیں ملتی- یوں لگتا ہے شاید ان جینز میں پوری کائنات کے علوم پوشیدہ ہیں- انسان نے اپنے ارتقاء کے روز اول سے جو جو حرکتیں کیں اور جو جو عادتیں اپنائیں سب کی سب' سب کے سب انسانوں کے جینز میں فیڈ ہیں- ماہرین جینز جوں جوں ان اسراروں یا رازوں کو کھولتے جا رہے ہیں انتہائی جذباتی حد تک حیران ہوتے جا رہے ہیں- مجھے تو لگتا ہے کہ شاید یہی جینز ہی ہیں جو ''اعمال نامہ'' یا تقدیر کی کتاب کہلاتے ہیں- جینز اگرچہ سائنس کا تازہ موضوع تو نہیں لیکن اس میں حیران کن معلومات حال ہی میں سامنے آئی ہیں- یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کتابی صورت میں اس موضوع پر بہت کم مواد موجود ہے- امریکہ اور یورپ میں ہو سکتا ہے اس موضوع پر خاصی کتابیں لکھی گئی ہوں لیکن ہمارے ہاں ایسی کتابیں اتنی دستیاب نہیں جتنی کہ کمپیوٹر کے شعبے سے متعلق اور وہ بھی زیادہ تر نصابی قسم کی ہیں- ہاں البتہ وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی کے اخبارات میں اس موضوع پر نت نئے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں-

ابھی تک سائنس دانوں نے جو کچھ معلوم کیا ہے وہ اس علم کا عشر عشیر تو کیا صحرا میں ریت کے ذرے کے برابر ہے- ابھی تک تو وہ صرف یہ باتیں معلوم کر سکے ہیں کہ جینز کے ذریعے جلد کا رنگ' بالوں کا رنگ' آنکھوں کی رنگت' قد کاٹھ' جسامت' آواز' چہرے کی بناوٹ' جبڑا' ٹھوڑی' سینہ' چستی' سستی' جذبات خصوصاً غصہ' نفرت' محبت' صدمے کی حالت میں حرکات' خوشی کی حالت میں حرکات' ذہانت' شوق' رجحانات' پسندیدہ شعبہ ہائے زندگی' رات کو جاگنے کی عادت' دن میں جاگنے کی عادت' بھوک برداشت کرنے کی صلاحیت' یا جنسی رجحانات وغیرہ والدین سے بچوں میں منتقل ہوتے ہیں اور سائنس دان اب اس کوشش میں بڑے زور و شور سے لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح جینز کی بے پناہ قوتوں پر کنٹرول حاصل کر لیا جائے- وہ جینز کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں- اس سلسلے میں سائنس دانوں کی کئی ایک کوششیں کامیاب بھی ہوئی ہیں- مثلاً امریکہ کے سائنس دانوں نے جینز میں تبدیلیاں کر کے چند ایسے بچے پیدا کر لیے ہیں جو سب کے سب لڑکے ہیں- شکل و صورت' بالوں اور آنکھوں کی رنگت کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں اور ان کا قد کاٹھ جوان ہونے کے بعد ایک جیسا ہی ہوگا-

اب وہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ انسان کے نفسیاتی رجحانات کو کنٹرول کرنے والے جینز پر بھی قابو پا لیں اور اگر اس طرح ہو گیا جیسا کہ امید ہے کہ ہو جائے گا تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا- کیونکہ وہ ایسے بچے اپنی مرضی سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے- جن کے نفسیاتی رجحانات ان سائنسدانوں کی خواہش کے مطابق ہوں- مثلاً وہ ''سرد مزاج'' بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں- جنہیں جلد غصہ نہ آتا ہو...... تاکہ ان کے غیر جذباتی پن سے معاشرے کے لیے خاص مقاصد حاصل کیے جا سکیں- ظاہر ہے اگر اس طرح کی نسل پیدا ہونا شروع ہو گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس نسل کو خاص تربیت دے کر کچھ ''خاص'' مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائیں-

ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ جینز کا معاملہ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کی طرح ہے جس میں ہر طرح کی معلومات محفوظ ہوتی ہیں اور انسان ان معلومات کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا ہے- بالکل اسی طرح انسان کے تولیدی خلیات میں موجود کروموسومز پر جینز ہوتے ہیں اور ان جینز میں لاکھوں کروڑوں معلومات فیڈ (Feed) ہوتی ہیں جو پیدا ہونے پر بچے یعنی نئے انسان کی مکمل شخصیت مرتب کرتی ہیں- ان میں برائی کی طرف جلد مائل ہونے والے جینز بھی ہوتے ہیں اور نیکی کی طرف جلد مائل ہونے والے جینز بھی-

جینز کی تحقیقات کے منظر عام پر آ جانے کے بعد مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے بارے میں شرح صدر ہوا ہے- جس میں آپؐ نے فرمایا کہ ''میرے اسلاب (آباؤ اجداد) میں کسی نے گناہ کبیرہ نہیں کیا-'' اس حدیث کی وضاحت سے پہلے میں چاہوں گا کہ ایک اور مشہور حدیث مبارکہ کا ذکر کروں جو نبی کریمؐ نے آج سے سوا چودہ سو سال پہلے فرمائی اور آج جینز کی تحقیقات کے بعد حرف بحرف درست ثابت ہوئی- نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ''جب میں بچہ تھا تو ایک بار جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور میرے سینے سے دل نکال کر دل کے شیطان والے خانے کو دھو دیا- اس لیے مجھ سے گناہ کبھی سرزد نہیں ہوتا- اب میں ان دونوں احادیث کو جینز کی جدید تحقیقات کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں- آپ نے جو فرمایا کہ میرے اسلاب میں کسی نے گناہ کبیرہ نہیں کیا- تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد جو انبیاءؑ کی اولاد تھے-

ارادۃً برے اعمال سے بچتے اور نیک اعمال سرانجام دیتے رہے۔ نسل در نسل سلسلہ یونہی چلتا رہا اور یہ بات تو سائنس بھی مانتی ہے کہ سینکڑوں سال تک جو عادت اپنائے رکھی جائے وہ بالآخر فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ گویا جینز میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے آباؤاجداد سے گناہ سرزد کیوں نہ ہوا...... آخر وہ بھی تو انسان تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہزاروں سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! دنیا کا سب سے کامل اور پاکیزہ انسان میری نسل میں پیدا کرنا اور جب کوئی انسان دل سے دعا کرتا ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے عملی طور پر کوشاں بھی رہتا ہے۔ ورنہ دعا قبول ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنی دعا کی قبولیت کے لیے عملی طور پر کوشاں ہو گئے اور اپنی اولاد کی تربیت اس طرح کرنا شروع کر دی کہ ان کی اولاد صالح اور نیک ہو۔ چونکہ وہ ایک نبیؑ کا ارادہ تھا۔ لہٰذا عام انسانوں سے مختلف تھا۔ نبیؑ تو اپنے ارادے پر پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدم رہتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ کی محنت رنگ لائی اور ان کی نسلیں دیر تک نیک طینت اور صالح رہیں۔ یہاں تک کہ نبی کریمؐ پیدا ہوئے۔ اب ذرا غور کیجیے! ہزاروں سال تک نبی کریمؐ کے آباؤاجداد صالح اعمال کرتے رہے۔ ان صالح اعمال نے ان کی فطرت میں داخل ہو کر ان کے جینز بھی پاک کر دیئے اور یوں دوسری حدیث کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔ جس میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ میرے دل سے گناہ کا خانہ دھل چکا ہے۔ دل کی جگہ جینز کا لفظ تو ظاہر ہے آپؐ اس وقت استعمال نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ کی مخاطب ایک ان پڑھ صحرائی قوم تھی۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں احادیث سے یہی مراد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جینز میں گناہ کرنے کی فیڈنگ (Feeding) ہی نہیں تھی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ جو تمام انبیاءؑ کو معصوم کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انبیاءؑ کے جینز پاک ہوتے ہیں۔ اب یہاں سے ایک نازک مسئلہ بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں پاکیزہ جینز منتقل نہیں ہوئے؟ یہ مسئلہ نازک اس لیے ہے کہ اگر ہاں کہہ دی جائے تو دنیا بھر کے سید اپنے آپ کو پاکیزہ اور معصوم سمجھ لیں گے۔ جیسا کہ وہ قبل ازیں سمجھتے ہی ہیں۔ لیکن اگر ''ناں'' کہہ دی جائے تو بہت ہی نازک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیمؑ سے کم استقامت کے مالک تھے کہ آپ نے اپنی اولاد کے لیے اس قسم کی دعا نہ کی۔ یا معاذ اللہ اگر کی تو قبول نہ ہو سکی۔ جبکہ ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی

ہے کہ سادات کو چاہیے کہ اپنی بیٹیاں غیر سادات میں دینے سے حتی الوسع اجتناب کریں۔ اگر سید رشتہ موجود نہ ہو تو پھر اس بات کی اجازت ہے کہ سادات اپنے خاندان سے باہر بیٹی کا رشتہ کر لیں۔

آلِ رسولؐ پاک ہیں

اس حدیث کے سامنے آنے کے بعد مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے لیکن تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے پاک ''جینز'' (جن میں برائی کی فطرت ہی نہیں تھی) آگے بھی چلے اور چلتے رہیں گے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ سے لے کر آج تک وہ لوگ جو واقعتاً نبی کریمؐ کی اولاد ہیں'' حقیقت میں گناہ کبیرہ سے محفوظ ہی رہتے ہیں۔ جس طرح کے نبی کریمؐ کے آباؤاجداد محفوظ رہے۔ پھر حدیث کے الفاظ میں ''اسلاب'' کا لفظ ہے اور سلب تو آگے بھی چلتا ہے اور چلتا رہا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ آل رسول کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ جو ہم ہر تیسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سید کہتا ہے تو یہ سب...... تو سید نہیں ہیں۔ کیونکہ ماہرین ریاضیات سے حساب کروا کر بھی دیکھ لیا جائے تو ثابت ہو گا کہ چودہ سو بیس سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اتنی زیادہ نہیں پھیل سکتی۔ جتنے سید اس وقت کرۂ زمین پر موجود ہیں۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ نبی کریمؐ...... کی اولاد صرف حضرت فاطمہؓ سے چلی...... اور خاندان رسولؐ کے ۷۲ افراد کوفہ میں شہید بھی کر دیئے گئے...... تو پھر نبی کریمؐ...... کے آئندہ اسلاب اس قدر زیادہ تعداد میں کس طرح پھیل سکتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت تک صرف ۴۰ پشتیں ہی گزری ہیں۔ حضرت فاطمہ سے لے کر اب تک۔

میں ثابت یہ کرنا چاہ رہا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پاک ہے اور ان سے کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہوتے اور جن لوگوں سے کبائر سرزد ہوتے یا جو کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں وہ سادات نہیں۔ یاد رہے کہ تکبر اور کام چوری بھی کبیرہ گناہ ہے۔ کیونکہ نبی کریمؐ غریبوں میں سے تھے اور محنت کو پسند کرتے تھے۔ لہٰذا حقیقی سید وہ ہے جو ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہو۔ جھوٹ نہ بولتا ہو اور اپنے سید ہونے کا برملا اظہار نہ کرتا اور اتراتا نہ ہو۔ لیکن وضاحتوں کے ساتھ مذکورہ بالا سوال کا سب سے بڑا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے تو بہت سے گروہ پیدا ہوئے جن میں اسرائیلی

خاص کر قابل ذکر ہیں- انبیاء بھی پیدا ہوتے رہے اور مخالفین انبیاء بھی- حدیث شریف میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسلاب کو پاک قرار دیا ہے اور وہ بھی صرف کبائر سے گویا معصوم نہ تھے- آج بھی خالص سید آدمیت کے حوالے سے مثالی ہوتے ہیں- سید ملنسار، خوش اخلاق، سخی، محنتی، سچا اور مخلص ہوتا ہے اور جو ایسے نہیں ہیں وہ سید نہیں ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال درست رکھ کر اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خود اصلاح شدہ جینز محفوظ کرنے ہوتے ہیں- جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزگی کے معراج کو چھوا- دراصل اس معیار تک اب کوئی اور انسان تو پہنچ نہیں سکتا- لہٰذا ان کی اولاد...... ان جیسی تو ہو نہیں سکتی- لیکن اپنی انسانی زندگی میں اگر خالص نسل رہی ہو تو کسی حد تک صالح اعمال کی حامل ضرور ہوتی ہے- یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ نے سادات کو خالص رہنے کی تجویز دی کہ...... چلو اس طرح زمین پر ایک نسل تو صاف ستھرے جینز والی ہوگی ہی اور باقی انسانوں کو قرآن کے ذریعے اپنے جینز کی اصلاح کرنے یعنی اعمال درست کرنے کی بھرپور تلقین کی اور اپنی مثال پیش کر کے عمل کرنے کا طریقہ بتایا- بہر حال کوئی جو بھی کہے سادات اس وجہ سے قابل رشک ضرور ہیں کہ وہ اتفاق سے ہی سہی خانوادۂ رسول سے منسلک تو ہیں- ہاں! البتہ انہیں متبرک سمجھنا یا ان کی جوتیاں اٹھانا محض اس وجہ سے کہ وہ سید ہیں، درست نہیں- کیوں کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جس کے اعمال زیادہ درست ہیں- **ان اکرمکم عنداللہ اتقکم** -اگر سید کے اعمال پسندیدہ ہیں تو اس کو رشک اور قدر کی نگاہوں سے ضرور دیکھنا چاہیے-

نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق کہ "**خیر القرون قرنی**" سب سے بہتر زمانہ میرا ہے...... پھر آگے یہ الفاظ ہیں...... **ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم**...... پھر اس کے بعد وہ زمانہ جو میرے زمانہ کے بعد آئے اور پھر اس کے بعد وہ جو اس کے بعد آئے- اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی اولاد میں پاکیزہ جینز تو منتقل ہوئے- لیکن آپ تو کامل ترین انسان تھے اور رسولؐ تھے- جبکہ اولاد رسول تو نہ تھی- چنانچہ اہل بیت خصوصاً حضرت فاطمہؓ اور حسنؓ و حسینؓ وغیرہم بھی یقیناً پاکیزہ جینز کے حامل تھے- البتہ نبیؐ کی پاکیزگی اور ان کی پاکیزگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے- کیونکہ نبیؐ کا وحی نازل ہونے کی وجہ سے جو رتبہ ہوتا ہے اور پھر مصائب و آلام برداشت کرتے ہوئے جو حوصلہ ہوتا ہے اور اپنا کردار پیش کرنے کے لیے جو استقامت ہوتی ہے وہ تو ظاہر ہے کہ

غیر نبی میں ممکن نہیں- لہٰذا ابتداء کے زمانے میں نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق یقیناً آپ کے جینز اپنی نسل میں منتقل ہوئے- لیکن چونکہ نبی کریمؐ نے حضرت ابراہیمؑ کی طرح آئندہ کسی نبی کی آمد کی دعا نہیں مانگی- لہٰذا بعد میں آنے والے انسان جو اللہ کے قانون کے مطابق اپنے اعمال میں آزاد ہوتے ہیں- وقت اور حالات کا شکار بھی ہوتے رہے اور بالآخر ایک وقت وہ بھی آیا جب نام نہاد سادات نے خود کو مسلمانوں کا مالک و مختار سمجھنا شروع کر دیا- جس کے نتیجے میں آج تک سادات مقدس اور متبرک سمجھے جاتے ہیں اور ان کا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا- تکبر اور کاہلی ان کی فطرت ثانیہ بلکہ "جینز" بن چکی ہے-

نظریہء اضافت کی طرح جینز کا جو یہ انقلاب آفریں سلسلہ شروع ہوا ہے- اس کی بنیاد مینڈل کے زمانے میں گویا آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل رکھی گئی تھی اور یہ بات تو آج سے کئی سال پہلے معلوم کی جا چکی تھی کہ موروثوں یعنی جینز کا انتقال قدرتی انتخاب (نیچرل سلیکشن) کے قانون کے تحت ہوتا ہے- قدرتی انتخاب کا قانون یہ ہے کہ زمین کی آب و ہوا اور ماحول کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لیے زندہ اشیاء اپنی اگلی نسلوں کو نئی نئی ہدایات منتقل کرتی رہتی ہے- انسانی زندگی میں اس قانون کو سمجھنے کے لیے ہم ایک انتہائی سادہ مثال پیش کرتے ہیں-

فرض کریں سو سال قبل کا انسان اچانک آ جاتا ہے اور اس دور کی نئی ایجادات مثلاً ٹی وی یا کمپیوٹر کو دیکھ لیتا ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ پاگل پن کی حد تک حیرت زدہ ہو جائے گا- جبکہ ہمارے بچے جو اس دور میں پیدا ہو رہے ہیں...... پیدا ہونے کے بعد اپنے گھر میں ان ایجادات کو دیکھ لیتے ہیں- لیکن حیران ہونا تو درکنار وہ ہم سے یہ سوال بھی نہیں کرتے کہ یہ چیزیں...... کیا ہیں؟...... کیسی ہیں ہمارے بچے ان چیزوں کو اس طرح لیتے ہیں...... جیسے انہیں پیدا ہونے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ دنیا میں یہ اشیاء پائی جاتی ہیں- وہ ان ایجادات کو حیرت انگیز اور نیا نہیں سمجھتے- اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جو سالہا سال سے ان اشیاء کے ساتھ مانوس ہیں اور ان کے استعمال کے اس طرح عادی ہیں جس طرح ہم کپڑوں، جوتوں یا گھر کی دوسری اشیاء کے عادی ہیں- لہٰذا ہمارے اندر سے ان چیزوں کے بارے میں حیرت ختم ہو چکی ہے- یہی بات ہم قدرتی انتخاب کے قانون کے تحت اپنی اولاد میں منتقل کر دیتے ہیں- میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہم ٹی وی، وی سی آر وغیرہ

کی معلومات جینز کے ذریعہ اپنی اولاد میں منتقل کرتے ہیں۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہم اپنے جینز کے ذریعے اپنے بدلے ہوئے ماحول کو اپنی اولاد میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہی ''قدرتی انتخاب کا قانون'' بدلے ہوئے ماحول کا اولاد میں منتقل ہونا نیچرل عمل ہے اور ہر جاندار اس پر قدرتی طور سے عمل پیرا ہے۔ اب یوں ہوگا سینکڑوں سال اسی طرح ان چیزوں کے استعمال کے بعد ایک وقت وہ آئے گا جب ہمارے جینز میں ان کے استعمال کی عادت داخل ہو جائے گی۔ جیسا کہ ماضی بعید میں ماحول بدل جانے سے جاندار نئے حفاظتی اقدامات اپنی اولاد کے جینز میں منتقل کر دیتے تھے۔

اپنے موقف کو سمجھانے کے لیے میں ایک اور مثال کا سہارا لیتا ہوں۔ آج سے ۷۰ یا ۸۰ سال پہلے ہم نے عام گھریلو کیڑے مکوڑوں کو مارنے کے لیے ایک دوا استعمال کرنا شروع کی۔ جسے ''ڈی ڈی ٹی'' کہا جاتا تھا۔ ہم اس دوا کے ذریعہ سالہا سال تک کیڑے مکوڑوں کا خاتمہ کرتے رہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کیڑے مکوڑوں میں اس دوا کے خلاف مدافعت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ گویا دوا کے استعمال نے زندہ رہنے کے لیے ان کے ماحول کو مشکل بنا دیا...... اب ان کے لیے زندہ رہنا بھی ضروری تھا۔ سو انہوں نے ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں جانوں کی قربانی دینے کے بعد کئی سال کی تگ و دو سے اپنی اولاد کو یہ سمجھا دیا کہ DDT سے کس طرح نمٹنا ہے۔ انہوں نے DDT کے خلاف مدافعت اپنی اولاد کو بذریعہ جینز منتقل کر دی اور اب ہم...... اگر اسی DDT سے ان کیڑوں کو مارنا چاہیں تو وہ بالکل نہیں مرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کیڑے مکوڑوں کو مارنے کے لیے نئی نئی ادویات دریافت ہو چکی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مکوڑوں کی جنگلی انواع جو DDT سے نا آشنا ہیں۔ آج بھی اسی DDT سے مر جاتی ہیں۔

بس میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ ہمارے بچے جو TV، VCR وغیرہ کو معمول کی چیزیں سمجھتے ہیں کچھ عرصہ بعد ان چیزوں سے فطری طور پر مانوس ہو جائیں گے۔

جینز کے بارے میں اس قدر تفصیل سے بتانے کے بعد اب ہم اپنے اصل موقف کو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہزاروں سال تک ''سیکس'' کا غلط استعمال کرتے کرتے غلط استعمال کی یہ عادت اب ہمارے جینز میں داخل ہو چکی ہے اور اس وجہ سے ہم اسے ''فطرت'' کہہ سکتے ہیں اور فطرت آسانی سے نہیں بدلی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جن میں فرائڈ سے لے کر آج کل کے گرو رجنیش تک شامل ہیں۔ جنسی بے راہ روی کو ناقابل اصلاح سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ بات درست

تو ہے لیکن محض اس حد تک کہ ہم اپنی مختصر زندگی میں اصلاح شدہ ''شہوانیت'' کا حال دیکھنے سے قاصر ہیں۔ البتہ اگر اس خوفناک جذبے کی اصلاح قرآنی اصولوں کی روشنی میں شروع کر دی جائے تو وہ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ نسلوں کے بعد ہم اس کے مثبت نتائج دیکھ سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کیڑے مکوڑوں نے نئے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ لیکن یہ بہت بڑا ارتقائی پروگرام ہے جسے ہم باقاعدہ شعوری طور پر اپنائیں گے۔

اب ہم ڈاکٹر عبدالودود کی شہرۂ آفاق تصنیف ''مظاہر فطرت اور قرآن'' کا ایک اقتباس اپنے مؤقف کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں (Phenomiena of nature & Quran) کے نام سے تقریباً آج سے تیس برس قبل شائع ہوئی اور تب سے اب تک جینز کے میدان میں بے پناہ نئی معلومات کا اضافہ ہو چکا ہے۔

''کسی نوع کے افراد کا گروپ جو ایک جغرافیائی حد کے اندر بستا ہے آبادی کہلاتا ہے۔ اس گروپ کے افراد اپنی آبادی کے اندر (Interbreed) باہمی صنفی ملاپ کرتے ہیں یا کبھی کبھی ایک آبادی کے افراد دوسری آبادی کے افراد سے۔

چنانچہ ایک آبادی کے اندر صنفی ملاپ سے مورثوں (جینز) کا آزادانہ تبادلہ ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے بعد...... اور نئی نئی نسلیں پیدا ہونے سے مورثے (جینز) مکمل طور پر آپس میں مل جاتے ہیں۔ ہر نسل میں صنف اور میوٹیشن کے ذریعے بعض افراد میں نئی نئی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ افراد زندہ رہیں اور اولاد پیدا کریں تو یہ نئی خصوصیات قدرتی انتخاب کی چھلنی سے گزر کر اس آبادی میں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جو افراد زیادہ اولاد پیدا کرتے ہیں ان کے مورثے (جینز) آبادی کے مورثوں کے کنڈ (Gene Pool) میں زیادہ جمع ہوتے جائیں گے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جن کی اولاد کم ہو۔ اس لیے اگر نئی (Trait) ''خصوصیت'' بعض افراد میں پیدا ہوتی ہے اور ان کی اولاد زیادہ بڑھتی جاتی ہے تو وہ نئی خصوصیت اس آبادی میں عام[۹۳] ہو جائے گی اور اس کا مستقل فیچر بن جائے گی۔ یہ ارتقائی تبدیلی کی ایک اکائی ہے۔ اس طرح کی بہت سی اکائیاں اس

آبادی میں جمع ہو کر افراد کی شکل و صورت اور اعمال کو بالکل بدل دیں گی اور ایک نئی نوع وجود میں آ جائے گی۔"

جدید دنیا کو لاحق اندیشے

جینز کے بارے میں جدید تحقیقات اور خصوصاً "کلوننگ" نے ماڈرن دنیا کے مفکرین کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ ایٹم بم سے اتنے خوفزدہ نہ ہوئے تھے جتنے جینز کی جدید تحقیقات سے ہوئے ہیں۔ نوبت بہ ایں جا رسید، کہ مغربی ممالک کے ارباب فکر نے پچھلے دنوں امریکی سینٹ میں یہ قرارداد پیش کی کہ کلوننگ اور جینز کی آزادانہ تحقیق پر پابندی عائد کی جائے اور ان سائنسدانوں کو جو اس مشن پر کام کر رہے ہیں۔ کسی طاقتور حکومتی ادارے کے ماتحت لایا جائے۔ وجہ اس کی یہ بتائی گئی کہ اس طرح کی آزادانہ تحقیق کسی دن ایسے نتائج پر پہنچ سکتی ہے جو ساری انسانیت کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً "جینز" پر کنٹرول حاصل کر کے اگر ایسے بچے پیدا کرنے شروع کر دیئے جائیں جن کو کسی خاص مقصد کے لیے تربیت دے کر استعمال کیا جائے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ فرض کریں کچھ بچوں کے "جینز" میں زمانہء قدیم کی وحشت یا خونخواری کو ابھار دیا جائے اور پھر ان کے پیدا ہونے کے بعد انہیں اسی مقصد کے لیے تربیت دی جائے۔ تو کیا وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوں گے۔ زمانہء قدیم کا انسان جو قتل و غارت اور خونریزی کو فطرتاً اپنائے ہوئے تھا اور جس کی باقیات آج بھی انسان میں پائی جاتی ہیں۔ اگر اس جدید دور میں جدید اسلحہ اور علوم سے لیس ہو کر نکل آئے تو کیا وہ شہروں کو جنگل نہیں بنا دے گا۔

اس سلسلے میں یورپ کے ارباب فکر پریشان ہیں اور ان کی پریشانی کی وجہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ جانوروں کی کلوننگ بھی ہے۔ حتیٰ کہ سبزیوں اور پودوں تک کو جینز کی ان جدید تحقیقات سے خطرات لاحق ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نباتات کے ماہرین اب تک ہزاروں قسم کے نئے پودے اور پھل اپنی مرضی سے پیدا کر چکے ہیں اور ان میں خصوصیات بھی اپنی مرضی سے ڈال چکے ہیں۔ اسی طرح گائے، بکری، بھیڑ، کتے اور چوہے وغیرہ پر انتہائی خطرناک کلوننگ کے تجربات کیے جا رہے ہیں اور بات انسانوں تک آ پہنچی ہے۔ "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" تو اب ہر جگہ پیدا کیے جا رہے

ہیں۔ لیکن یہ جو سلسلہ چل نکلا ہے کہ انسانوں کی خصوصیات بھی اپنی مرضی سے تبدیل کی جا رہی ہیں..... انتہائی خطرناک ہے۔ اس قسم کے تجربات امریکہ میں کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے اکثر کامیاب ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ امریکہ میں چند بچے ایسے پیدا کیے گئے ہیں جو ایک جیسی جنس، شکل و صورت اور خصوصیات کے مالک ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی عادات بھی ایک جیسی ہیں۔ انہیں ہم "مشینی بچے" کہہ تو سکتے ہیں لیکن وہ مکمل انسان ہیں اور نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ چلتا رہا جو یقیناً چلتا رہے گا تو اہل فکر کو اندیشہ ہے کہ دنیا مصیبت میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ بہت وقت کے بعد سو دو سو سال بعد جب اس طرح کے بچوں کی تعداد بے پناہ بڑھ جائے گی تو مرد اور عورت کا جنسی اختلاط صرف اور صرف حصول لذت کے لیے رہ جائے گا۔ اگرچہ اب بھی اکثریت صرف حصول لذت ہی چاہتی ہے۔ لیکن اس وقت تو شاید مباشرت کے ذریعے بچے پیدا کرنے کا تصور ہی جاتا رہے اور یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ بعض ممالک اس طرح کے بچے پیدا کرنا شروع کر دیں گے جو ان کی دشمن اقوام کے خلاف استعمال کیے جا سکیں گے۔

"ذہانت" جو ملتی ہی صرف جینز کے ذریعے سے ہے اور جس کے عطا ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہر امیر آدمی اپنی اولاد کے لیے خریدے گا۔ ظاہر ہے پیسہ خرچ کر کے ہر آدمی اپنی بیوی کے لیے ایسا بیج خرید سکے گا جس سے اس کی مرضی کی خصوصیات کا حامل بچہ پیدا ہو اور ایسا ہونا چنداں مشکل نہیں۔ ہم یہاں اپنے ترقی پذیر ملک پاکستان کے عام دیہاتی جانوروں کے ہسپتالوں میں جا کر اپنی گائے یا بھینس کے لیے ایسا بیج..... اس دور میں خرید لیتے ہیں جو ہماری مرضی کا بچھڑا یا بچھڑی پیدا کر سکے۔ جانوروں کے عام ہسپتالوں میں ہر قسم کی خصوصیات کے حامل بیج موجود ہیں۔ جن میں گائے کا رنگ، قد کاٹھ اور نسل وغیرہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ جب اتنا کچھ ہم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھتے ہیں تو پھر انسان کی کلوننگ کیونکر ناممکن ہو گی اور پھر انسان کے جینز تو اور بھی پیچیدہ اور عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ اگر ان کی خصوصیات پر قابو پا لیا گیا تو واقعی دنیا بہت بڑے بڑے مسائل کا شکار ہو جائے گا۔

جینز کی تحقیقات کے فائدے

جہاں جینز کی تحقیقات خطرناک ہیں- وہاں ان سے حاصل ہونے والے فوائد بھی بے شمار ہیں- خصوصاً اس نقطہء نظر سے کہ انسان کی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے- اگر ایسا ہو سکے تو یقیناً انسانیت کا بہت بڑا فائدہ ہوگا- لیکن جینز کی اصلاح سے صرف ان بیماریوں کا علاج ممکن ہو سکے گا- جو موروثی ہوتی ہیں- ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ جینز میں اس طرح کی اصلاح کی جائے جس سے انسان میں بیماریوں کے خلاف مدافعت بڑھائی جا سکے- اس طرح شاید کسی قدر زیادہ بیماریوں کا علاج کیا جا سکے-

ایک حیرت انگیز فائدہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کبھی شاید انسان کی فطرت میں سے حیوانی اور جناتی خصلتوں کو نکالنے کا خواب دیکھا جائے- لیکن اول تو اتنے عظیم پیمانے پر جینز کی ترقی ممکن نظر نہیں آتی اور دوسرے ایسا کرے گا کون- انسان کی موجودہ فکری حالت دیکھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی بھی ایسا نہ ہو سکے- ہاں جیسا کہ میں نے اس بات کو "خواب" کہا ہے- شاید سینکڑوں، ہزاروں سال بعد کبھی ایسا ہو سکے کہ انسان اپنی کارروائیوں پر شرمندہ ہو اور اپنے گناہوں کی تلافی پر اجتماعی طور پر آمادہ ہو سکے- لیکن فی الوقت تو یہ باتیں مذاق ہی لگتی ہیں-

ایک اور دعویٰ کیا جا رہا ہے ماہرین جینز کی جانب سے اور وہ بھی بظاہر مذاق ہی لگتا ہے کہ انسانی خلیات کے جینز میں ردوبدل کر کے یا اضافہ و کمی کر کے انسان کو بعض علوم پیدائشی طور پر سکھائے جا سکیں گے- مثلاً زبانیں، ثقافت، شاعری وغیرہ لیکن اس کے لیے بہر حال ان بچوں کی تربیت ضروری ہوگی جن کے ساتھ ایسا کیا جائے گا- بس ہوگا صرف اتنا کہ اس کا مزاج بدل دیا جائے گا- مثلاً شاعری کو ہی لیں- کہتے ہیں شاعری خداداد صلاحیت ہے اور یہ خداداد صلاحیت دراصل جینز ہی کی مرہون منت ہے- لیکن ایک شاعر بھی اپنے ابتدائی دور میں پہلے اکتسابی تجربے کرتا ہے- اسی طرح لٹریچر یا زبان دانی سیکھنے کے لیے بھی ایک خاص قسم کے مزاج کی ضرورت ہوتی ہے تو یوں ہوگا کہ جینز کے ذریعے بچے کے مزاج میں اس کے لیے پیش آمدہ شوق پہلے سے تجویز کر کے ڈال دیے جائیں گے-

سب سے بڑا فائدہ جو جینز کی کامیاب تحقیقات کا انسان کو ہو سکتا ہے وہ ہے حافظہ یا حافظے کا

علاج- ایک لحاظ سے موجودہ دور کے انسانوں کا کمزور حافظہ نفسیاتی بیماری کا نتیجہ ہے- کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی خصوصاً قرونِ وسطیٰ کا انسان خاصا تیز حافظے کا مالک تھا- حافظہ کے تیز ہو جانے سے جو بہتریاں انسان یا انسانیت کے لیے ہو سکتی ہیں- وہ خاصی زیادہ لیکن ہمارے موضوع سے خارج ہیں-

بہر حال اگر کچھ بھی نہ ہو اور صرف موذی بیماریوں کا علاج ہی ہوتا رہے تو یہ تحقیق انسان کے لیے بہت مفید ہے اور تحقیق کے حق میں ایک سب سے بڑی دلیل آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے تسخیر کی ہے اور انسان پر فرض ہے کہ وہ ان مسخرات پر حکمرانی کرتا رہے اور ان کے علوم حاصل کرتا رہے- جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ

"سخر لکم مافی السموٰت والارض"

"اور تمہارے لیے زمین و آسمان میں جو کچھ ہے مسخر کر دیا گیا ہے-"

جینز ہو یا کوئی اور علم اس کی تحقیق ہونی چاہئے- یہ انسان کا اولین فرض ہے- حدیث شریف میں ہے کہ

"اطلب العلم فریضه علی کل مسلم و مسلمة"

"ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے-"

خیر! حدیث شریف کے الفاظ سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علم مسلمانوں پر فرض ہے- گویا مسلمان ہی اس قسم کی تحقیقات کے اہل ہیں- اگر غیر مسلموں یعنی کافرین کے ہاتھوں میں ان علوم کی زمام اختیار ہوئی تو واقعی نقصان کا اندیشہ ہے-

باب ۶

جذبۂ جنس اور لاشعور کی دنیا

(شعور اور تحت الشعور)

علم نفسیات اگرچہ ابھی ترقی پذیر حالت میں ہے لیکن گزشتہ دو تین صدیوں میں ماہرین نفسیات نے ایسے ایسے تجربات اور پھر انکشافات کیے ہیں کہ شعور اور لاشعور کی دنیا ایک وسیع اور پیچیدہ سائنس کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ نفسیات سائنس کا ایسا وسیع الحدود مضمون ہے جس کا بحر ناپید کنار طبیعات اور پھر حیاتیات سے بھی کہیں گہرا اور عظیم ہے۔ کیونکہ لاشعور کے مطالعہ میں کسی سب سے بڑی باشعور ہستی کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے اور جس کے تلاش کرنے کے لیے مادی وسائل اور آلے بھی مدد دینے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ جب شعور کی ایک چھوٹی مثال ہو سکتی ہے تو ایک بڑی مثال بھی ہو سکتی ہے۔ شعور اور لاشعور یا باطن، خودی، ایگو، نفس اور ذات وہ عجیب و غریب حقائق ہیں جنہیں نہ تو حواس خمسہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی مکمل تعریف کی جا سکتی ہے۔ علماء نفسیات نے اب تک کے تجربات سے جو نتائج حاصل کیے ہیں ان کے مطابق انسان کے باطن کو تین حصوں شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شعور حالت بیداری میں ہر وقت مستعد اور چاق و چوبند رہتا ہے اور تحت الشعور ذہن کا وہ ریکارڈ روم ہے جہاں سے بوقت ضرورت یادداشتوں کو نکالا جا سکتا ہے۔ ان کے برعکس لاشعور وہ گہرا اور تاریک سمندر ہے جہاں تک پہنچنا عام انسانی ذہن کے بس سے باہر ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی صحیح پوزیشن سمجھنے کے لیے اس پہاڑ کی مثال لیجیے جو گہرے سمندر کی سطح سے اتراتا ہوا نکلتا ہے اور ایک جزیرے کی طرح سمندر کے سینے پر ایستادہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ سطح آب سے نمودار ہو کر نظر آنے والا پہاڑ کا حصہ سورج کی کرنوں سے مکمل طور پر روشن ہے۔ یہ حصہ ہر وقت مستعد رہنے والے شعور کی مثال ہے

۲۔ سطح سمندر سے نیچے مدھم روشنی میں نظر آنے والا پہاڑ کا حصہ تحت الشعور ہے۔

۳۔ انتہائی گہرائی میں تاریک سمندر کے اندر نہ نظر آنے والا پہاڑ کا گم شدہ حصہ لاشعور کی مثال ہے۔

انسانی ذہن میں شعور اگرچہ ہر وقت سرگرم اور فعال رہتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ظرف کے حوالے سے شعور کا پیمانہ انتہائی مختصر حتیٰ کہ ایک باریک ترین نقطے کی طرح سے ہے۔ جس پر ایک لمحے میں صرف ایک حقیقت ٹھہر سکتی ہے۔ ہم جب کوئی لفظ زبان سے ادا کرتے ہیں تو ہمارا شعور ایک لفظ کے لیے کئی بار اپنی حالت بدلتا ہے۔ مثلاً "بارش" کہتے ہوئے ہم نے ب، ا، ر، ش چار حروف ادا کیے۔ ہمارے ذہن کے ریکارڈ روم یعنی تحت الشعور میں ان چار حروف کی الگ الگ فائلیں دستیاب ہیں۔ جہاں سے ہمارا شعور معلومات حاصل کرتا اور الفاظ کو معانی پہناتا رہتا ہے۔ شعور کے مقابلے میں تحت الشعور کا ظرف بہت بڑا ہے جو ذہن کا ایک ایسا ریکارڈ روم ہے جہاں سے بوقت ضرورت معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس ریکارڈ روم میں ہر قسم کی فائلیں دستیاب ہیں۔ خوشبوؤں کو پہچاننے کے لیے خوشبوؤں کا ریکارڈ، رنگوں کی پہچان کے لیے رنگوں کا، اسی طرح دیگر اشیاء اور آوازیں پہچانتے ہوئے بھی ہمارا شعور ہر آن تحت الشعور سے مدد لیتا رہتا ہے۔ تحت الشعور کا ایک زیادہ صحیح نام "محتسب" بھی ہے۔ جب ہم کسی چیز پر نظر ڈالتے ہیں، کوئی آواز سنتے ہیں، کسی بو کو سونگھتے ہیں، کوئی چیز چکھتے ہیں یا کسی شے کو چھو کر محسوس کرتے ہیں تو ہمارا شعور ایک لمحے میں بیک وقت محتسب کے ریکارڈ روم سے بہت سی معلومات طلب کر لیتا ہے۔ جن کے اشتراک سے ہم اس چیز کو معنی پہنا دیتے ہیں اور ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے۔ شعور و تحت الشعور کو مزید سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔

"ایک شخص سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک پر سے ایک لدا ہوا ٹرک گزرتا ہے۔ ٹرک میں موجود سامان کو چاروں طرف سے ڈھک دیا گیا ہے۔ لیکن سڑک کے کنارے موجود شخص ایک دم چونکتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ابھی ابھی سڑک پر سے آموں سے لدا ہوا ایک ٹرک گزرا ہے۔"

سڑک کے کنارے کھڑے شخص نے ماحول میں تیزی سے نفوذ کرتی ہوئی اور پھر ختم ہوتی ہوئی آموں کی خوشبو سے اندازہ لگا لیا کہ سڑک پر سے گزرنے والا ٹرک آموں کا تھا۔ محض خوشبو سونگھ کر اس قدر درست نتیجہ نکالنے میں شعور کی تمام تر مدد تحت الشعور نے کی۔ جہاں آم کی خوشبو کی فائل پہلے سے موجود تھی۔ اگر اس شخص نے زندگی میں کبھی آم نہ دیکھے ہوتے اور نہ کھائے ہوتے تو وہ کبھی بھی یہ رائے قائم نہ کرتا کہ سڑک پر سے آموں کا ٹرک گزرا ہے۔ محتسب یا تحت الشعور کی اس تشریح سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تحت الشعور میں سے کوئی بھی ریکارڈ کسی بھی وقت فی الفور طلب کیا جا سکتا ہے۔ نئے زمانے کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تو ہم تحت الشعور کو کمپیوٹر کی ''ہارڈ ڈسک'' سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جہاں لاکھوں کروڑوں معلومات (Datas) کو پیش آمدہ ضروریات کے پیش نظر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بوقت ضرورت کوئی سا بھی ڈیٹا مانیٹر کی سکرین پر کال کیا جا سکتا ہے۔ شعور مانیٹر کی سکرین کی طرح ہے۔ جہاں ایک وقت میں صرف ایک چیز مگر روز روشن کی طرح عیاں کسی بھی وقت سامنے لائی جا سکتی ہے۔ بعینہ اس طرح محتسب کے ریکارڈ روم میں موجود ڈیٹاز کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کی طرح محفوظ ہوتے ہیں۔

واقعہ یوں ہوتا ہے کہ جب ہم کوئی بھی چیز محسوس کرتے ہیں یعنی وہ چیز ہمارے علم میں آ جاتی ہے تو دماغ کے پیچیدہ نظام میں اس عمل کے دوران مختلف عوامل محض ایک آن میں رو پذیر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی خوشبو ہمارے ناک سے ٹکراتی ہے تو ہمارے جسم کی حرکی خلیے ناک کے اعصاب میں تیزی سے حرکت کرتے ہوئے دماغ کے مرکز تک کسی چیز کے ٹکرانے کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ دماغ کا خودکار کمپیوٹر سسٹم اس اجنبی چیز کی پہچان کے لیے تحت الشعور یعنی ہارڈ ڈسک سے معلومات طلب کرتا ہے۔ تحت الشعور میں موجود لاکھوں ڈیٹاز کی فائلوں میں سے خوشبوؤں کے سیکشن کی فائلوں کا آئی کون (Icon) روشن (Hi-Light) ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک یعنی تحت الشعور مزید پروسیسنگ (عمل) کرتا ہے اور مخصوص چیز کی خوشبو کی فائل کھل جاتی ہے۔ اس کے فوراً بعد حسی خلیے دماغ سے پہچان کا پیغام لے کر چل پڑتے ہیں اور ناک کو ناگواری یا خوشگواری کی حرکت پر مائل کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم کسی چیز کو دیکھتے، سنتے، چکھتے، یا سونگھتے ہیں۔ یعنی حواس خمسہ میں سے کوئی سی ڈسک جب مصروف عمل ہوتی ہے تو یہی ترتیب دہرائی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے اور مجھے ان سے اتفاق ہے کہ کمپیوٹر کی موجودہ شکل کی تیاری میں

انسان کی حیاتی اور شعوری زندگی کی تراکیب سے رہنمائی لی گئی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی سطح کی، کسی بھی طرح کی رہنمائی ہو۔ حیاتی زندگی میں سے جینز (جن کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا) اور شعوری زندگی میں باطن کا عجیب و غریب نظام...... کمپیوٹر سے بہت بلند سطح پر کمپیوٹر کی طرز کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

لاشعور

کمپیوٹر کے نظام میں ہمیشہ کے لیے بھول جانے والی یادداشتوں جنہیں شاید ''یادداشت'' کہنا بھی درست نہیں کو محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس لیے ابھی تک کمپیوٹر میں لاشعور کی طرح کی کوئی چیز نہیں بنائی گئی۔ یہ سمندر میں موجود پہاڑ کا وہ تاریک حصہ ہے جو کسی بھی موسم اور کسی بھی وقت میں نظر نہیں آ سکتا۔ یہ شعور اور لاشعور سے لاکھوں گنا بڑا اور وسیع ریکارڈ روم ہے۔ بلکہ اسے ریکارڈ روم کی بجائے ڈاک روم کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ یہاں اگرچہ انسان کے ساتھ پیش آنے والا ہر واقعہ حتیٰ کہ حواس خمسہ کے ذریعے ہر آن اور ہر لحہ محسوس کیا جانے والا واقعہ بھی لاشعور میں موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ تحت الشعور کی معلومات کے بھروسہ پر یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ نے سولہ جون ۱۹۹۵ء کے دن دوپہر کے کھانے میں (Lunch) کیا کھایا تھا۔ جبکہ یہی واقعہ آپ کے لاشعور میں محفوظ ہے۔ اگرچہ آپ باوجود کوشش کے لاشعور سے کوئی اور انفارمیشن نہیں نکال سکتے لیکن آپ کا ہپناٹسٹ (عمل تنویم کا ماہر) یا آپ کی باطنی اصلاح کا استاد (مرشد) ایسا کر سکتا ہے۔

ایک دوسری صورت میں لاشعور میں موجود معلومات خودبخود اور بغیر آپ کی خواہش کے گویا زبردستی آپ کے شعور کی سکرین پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس حالت کو خواب یا سپنا (Dream) کہا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں کھلی آنکھوں اور جاگتے دماغ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ جاتا ہے اور لاشعور سے بظاہر اجنبی انفارمیشن عود کر احاطہء شعور میں آ لگتی ہے۔ اس حالت میں آپ کسی شخص کو دیکھیں تو آپ اسے پاگل یا ابنارمل کہیں گے۔

دراصل لاشعور میں صرف ایک شخص کی اپنی زندگی سے متعلق واقعات کا ریکارڈ ہی نہیں ہوتا

بلکہ اس کے آباؤ اجداد کی عادات، خصلتیں اور مہارتیں تک کا مکمل ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ سنتے ہیں یا دیکھتے ہیں کہ کسی شخص پر ایسی غیر شعوری حالت طاری ہو گئی کہ وہ ہذیان اور اول فول بکنے لگا۔ یا بڑبڑانے لگا یا کسی اجنبی زبان کے جملے جو بظاہر مہمل ہیں اس کی زبان سے خود بخود نکلنے لگ گئے تو آپ سمجھتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہے یا کوئی جن اس پر قابض ہو گیا ہے۔ آپ ترقی یافتہ افکار کے مالک ہیں تو زیادہ سے زیادہ اسے پاگل کہہ کر چپ ہو جائیں گے۔ لیکن ماہرین نفسیات کے لیے ایسا شخص ایک دلچسپ تجربے کی طرح ہے۔ کیونکہ ماہرین نفسیات یہ جانتے ہیں کہ بعض اضطراری حالتوں میں کسی شخص پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو ایسے میں اس کے لاشعور سے اتفاقی اور حادثاتی طور پر کچھ واقعات اچھل کر احاطۂ شعور میں آ گئے ہیں۔ خواب کی حالت میں تو ہم سب کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن وہی خواب کی سی کیفیت جب جاگتی آنکھوں سے محسوس ہونے لگتی ہے اور پردۂ ذہن سے عجیب و غریب تصویریں اور واقعات گزرنے لگتے ہیں تو زیادہ عجیب محسوس ہوتا ہے اور ہم اس حالت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے مافوق الفطرت کہانیوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے وہ شخص جس پر بظاہر جنات قابض ہیں اور جس نے پنجاب میں پرورش پانے کے باوجود عربی کے ٹوٹے پھوٹے جملے بولنے شروع کر دیئے۔ اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کی زبان حادثاتی طور پر بولنے لگ گیا ہو۔ کیونکہ اس کے لاشعور میں موجود اس کے آباؤ اجداد کی زندگیوں کا ریکارڈ بھی اسے ورثے میں ملا ہے۔ وہ چھوٹا سا نقطہ جو رحم مادر میں باپ کے جرثومے اور ماں کے انڈے سے مل کر زائیگوٹ بنا۔ اپنے جینز پر موجود ہزاروں سال کا ریکارڈ لیے ہوتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ہزاروں سال کی معلومات لے کر آتا ہے۔ اس کا لاشعور عمرو عیار کی اس زنبیل کی طرح ہے جس میں دنیا جہان کی ہر چیز موجود ہے۔ دس ہزار سالہ انسانی تہذیب، تاریخ، تمدن، ماحول، حالات، واقعات اس کے لاشعور میں بذریعہ جینز منتقل ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ پیدائش کے وقت سے لے کے بڑا ہونے تک...... ہر لمحہ اور ہر نقطہ اس کے لاشعور میں ریکارڈ ہوتا رہتا ہے۔ وہ چیزیں جو روزمرہ ضرورت اور استعمال کی ہیں تحت الشعور میں ہی مستقل طور پر رہ پڑتی ہیں اور وہ اشیاء، اسماء اور پہچانیں جن کی روزمرہ ضرورت نہیں پڑتی کچھ وقت تحت الشعور کے ریکارڈ روم میں گزارنے کے بعد لاشعور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل دفتر ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ معلومات جو استعمال

نہ ہوئیں اور لاشعور کے اندھے غار میں گرنے سے پہلے...... دہانے پر رکھی ہیں۔ اچانک طلب کر لی جاتی ہیں تو انہیں واپس احاطۂ شعور میں آتے ہوئے کچھ وقت لگتا ہے۔ اسی کو ہم بھولی ہوئی بات...... کا یاد آنا کہتے ہیں۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ وہ بھولی بسری بات جو مدت ہوئی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ لاشعور کے اندھے کنویں میں سر کے بل گرتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک اسے کسی اتفاق کی وجہ سے احاطۂ شعور میں پھر لوٹنا پڑا۔ تو قدرے وقت کے بعد شعور اس کے خدوخال محسوس کرنے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے اصل بات یاد آتی چلی جاتی ہے۔ گویا وہ لاشعور میں جتنی دور چلی گئی تھی۔ خیال کی رفتار سے ریورس ہوئی اور احاطۂ شعور میں پوری طرح داخل ہوتے ہوئے اسے کچھ وقت لگ گیا۔ مثال کے طور پر بیس سال بعد ملنے والا بچپن کا کوئی دوست یا کلاس فیلو جس کا چہرہ عمر اور تجربات نے بدل دیا ہے اور جو پردۂ یادداشت سے قریب قریب محو ہو چکا تھا۔ جب سرِراہ سامنے آتا ہے تو اسے پہچاننے اور اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو دوبارہ احاطۂ شعور میں لانے کے لیے ذہن کا کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب گویا یہ ہے کہ ابھی وہ بات وہ یادداشت جسے مدتوں بعد پھر سے بلایا گیا۔ لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں گم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ لاشعور سے کوئی بھی بات ارادتاً از خود نکالنا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ البتہ ایسے لوگ جو مختلف طریقوں سے باطنی مہارت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اپنی اپنی سطح پر لاشعور میں غوطہ زن ہونے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مجاہدات، صوفیانہ واردات، مذہبی مشاہدات، مکاشفات، مراقبات، چلہ کشی اور اس قسم کے دیگر تجربے کرتے رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو مسمرزم، ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی (فرضی نام) جیسے سائنسی نقطہ نظر سے متعلق تجربات کرتے رہتے ہیں۔ دراصل لاشعور کی دنیا جسے اہل تصوف باطن کی دنیا سے موسوم کرتے ہیں۔ اپنی نوعیت کی ایک ایسی حیران کن وسیع اور ماوراء العقل دنیا ہے جس کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بھی اندازہ لگانا محال ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کے لاشعور لامحدود کائنات کی اس مقام تک سیر کر لیتے تھے جہاں پر حدودِ انسانی کا خاتمہ اور الوہیاتی توانائی یعنی حدودِ رحمانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مقام پر انبیاءؑ کی خالق کائنات سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ رب العالمین سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ لیکن انبیاءؑ کے علاوہ باقی تمام لوگ اس درجۂ کمال کے حامل نہیں ہوتے۔ ایک بات یہ بھی

ہے کہ انبیاء کی اپنی ریاضت وعبادت اور کوشش کے جواب میں خالق کائنات کا جواب محض عمل اکتساب کا نتیجہ نہیں- بلکہ نبی کی ذات اللہ تعالیٰ کا اپنا انتخاب ہے- انبیاءؑ کے علاوہ بڑے بڑے اولیاء اور صوفیاء اپنی اپنی سطح پر اپنے اپنے لاشعور میں غوطہ زن ہوتے ہیں- اس میدان کے بعض شہسوار اپنے لاشعور کے علاوہ دوسرے کے لاشعور میں جھانکنے کی مہارت بھی رکھتے ہیں- لیکن لاشعور کی کائنات اس قدر وسیع ہے کہ وہ انبیاءؑ کی طرح اس کے انتہائی مقامات تک نہیں پہنچ سکتے-

باطنی علوم پر ماضی میں علماء کرام کی جتنی توجہ رہی ہے- فی زمانہ اتنی نہیں- لیکن ایک لحاظ سے موجودہ زمانے نے جس منطقی اور سائنسی انداز میں نفسیات کو لیا ہے- اس سے قبل اس طرح نہیں لیا گیا- عظیم سائنسدان سگمنڈ فرائڈ کی تجرباتی تحقیق کے بعد نفسیات کی دنیا میں بھی آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی طرح انقلاب آیا ہے اور پھر کمپیوٹر کی ایجاد نے علماء نفسیات کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ انسانی دماغ اگر معلومات کے بے پناہ ذخیرے کو کمپیوٹر کے سمندر میں محفوظ کر سکتا ہے تو وہی انسانی دماغ خود اپنی ہارڈ ڈسک میں کس قدر معلومات رکھتا ہوگا اور پھر ہارڈ ڈسک تو محض تحت الشعور کی شبیہ ہے- لاشعور جو اس سے لاکھوں گنا بڑا وسیع اور گہرا سمندر ہے- اپنے اندر خدا جانے کون کون سی چیزوں کو ذخیرہ کیے ہوئے ہے- جب کوئی صوفی یا راہ سلوک کا مسافر اپنے استاد (مرشد) کی ہدایات کی روشنی میں اپنے لاشعور کا جائزہ لینے کے لیے غوطہ زن ہوتا ہے تو اسے ایسی ایسی ناقابل یقین معلومات کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے جو عام حالات میں اس کے احاطہ شعور میں نہ آ سکتی تھیں- ایسے موقع پر ہم اسے غائب کی خبریں دینے والا پہنچا ہوا قلندر سمجھتے ہیں-

فرائڈ کی تحریک کے بعد اس راز سے پردہ ہٹ گیا اور نفسیات دانوں نے تجربات سے یہ ثابت کیا کہ لاشعور سے حاصل ہونے والی معلومات اجنبی اور چونکا دینے والی ہوتی ہیں- جرمن کے ایک سائنس دان [۹۴] نے جو نفسیات کی سائنس کا مایہ ناز ڈاکٹر تھا- حال ہی میں ایک حیران کن تجربہ کیا ہے- اس نے عمل تنویم کے ذریعے ایک شخص کو مصنوعی نیند سلا کر اس کے لاشعور میں موجود اس کی زندگی کی کہانی کے ورق الٹنے شروع کر دیئے- ماہر نفسیات اس کے ماضی میں پیش آنے والے لمحات کی رپورٹ تیار کرتا رہا اور عمل تنویم کے ذریعے اس کی یادداشت کو پیچھے سے پیچھے لاتا گیا- یہاں تک کہ جب اس نے اپنے معمول کو اس کی شیر خوارگی کی عمر تک پہنچا دیا تو اس سے وہی معصوم بچوں جیسی حرکات سرزد ہونے لگیں- یہاں سے اس کے لاشعور کو مزید پیچھے کی طرف فلم سلائڈ

کی طرح چلایا گیا تو اس نے رحم مادر میں زائیگوٹ بننے کے پہلے روز کی تاریخ کو کراس کرتے ہی ایک نئی دنیا کے نظر آنے کا اعلان کر دیا- اب وہ شیر خوار بچہ نہیں تھا- بلکہ ایک جوان العمر شخص تھا اور کسی ویران جگہ پر کھڑا اپنے ماحول کا نظارہ کر رہا تھا- ہو سکتا ہے یہ واقعہ اہل یورپ کی سنسنی پسند طبیعت کی اختراع ہو- لیکن یہ بات قبل ازیں سینکڑوں مرتبہ تجربے میں لائی گئی ہے کہ لاشعور کی گہری اور گم شدہ یادداشتوں کو ہپناٹزم کے ذریعے واپس معمول کے احاطہ شعور میں بلایا جا سکتا ہے- جرمن کے سائنس دان کے اس واقع کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شخص کی تیس چالیس سالہ زندگی کے ریکارڈ کو جو ایک لمحے کی تفصیل کا حامل ہے- اس طرح چند دنوں میں دہرایا جا سکتا ہے- اس کا جواب یہ ہے کہ خیال کی رفتار مادی زندگی کے نظام الاوقات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی- مادی اشیاء میں روشنی کی رفتار کو سب سے تیز مانا جاتا ہے- روشنی کی ایک شعاع ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ سے کر لیتی ہے- اس کے برعکس خیال کو اپنے سفر کے لیے مادی دنیا کے زمان و مکان سے کوئی سروکار نہیں- آپ کے لیے ایک آن سے بھی کم وقت میں پوری کائنات کو اپنے تصور میں لانا مشکل نہیں- ابھی آپ کا خیال یہاں اس کتاب کی سطروں پر مرکوز ہے- لیکن ابھی آپ چاہیں تو مریخ پر سیر کرنے کے تصور کو فی الفور ذہن میں لا سکتے ہیں- دراصل خیال کے لیے یہاں سے وہاں تک کے مقامات کوئی معنی نہیں رکھتے- اس کے راستے میں کوئی سنگ میل نہیں اور نہ ہی کوئی منزل جس پر کم یا زیادہ فاصلے کی نشاندہی کی گئی ہو- بعینہ اسی طرح جو لوگ تصور قائم کرنے کی مشق رکھتے ہیں- (تصوف کی زبان میں اسے ''توجہ کرنا'' کہتے ہیں) جانتے ہیں کہ خیال کس رفتار سے باطن کی دنیا (لاشعور) میں غوطہ زن ہوتا ہے اور کس طرح تہہ سے انمول موتی اور ہیرے جواہرات نکال لاتا ہے- یہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے-

فا لھمھا فجورھا وتقواھا

ترجمہ: ہم نے اسے فجور اور تقوے کا الہام کر دیا-

تو یہ باطن میں موجود اس خودکار نظام کی طرف اشارہ ہے- جو انسان کو اس کے افعال واعمال کے دوران نیکی اور بدی کی ترغیب دیتا اور پہچان کراتا ہے- باطن جو علماء نفسیات کے تجربات کا مرکزی منہاج ہے کسی بھی انسان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اس کے موروثی یا خاندانی

حالات اس کی گزشتہ زندگی کے واقعات‘ اس شخص کی عادات متعین کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں اور یہی عادات ہی تو ہیں جنہیں اچھے یا برے اعمال میں شمار کیا جاتا ہے- تو گویا اللہ تعالیٰ نے لاشعور کے عظیم ذخیرے میں اچھی اور بری عادات متعین کرنے والے محرکات رکھ دیئے ہیں- یعنی فجور اور تقویٰ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ کس طرح ایک شخص وجدانی طور پر فجور یا تقویٰ کی طرف مائل ہوتا ہے- دراصل نفسیات ہی قرآن حکیم کا پسندیدہ موضوع ہے- قرآن حکیم آفاق کی مثالیں دیتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ''انفس'' کی دنیا (باطن) بھی اتنی ہی حقیقی ہے جتنی کہ آفاق کی- قرآن حکیم میں ہے-

"سنریهم ایاتنا فی الافاق وفی انفسهم"

ترجمہ: ہم نے اپنی نشانیاں بیان کردی ہیں- آفاق میں اور ان کے انفس میں-

قرآن کے حوالے سے لاشعور کے موضوع پر مشرق کے عظیم فلسفی علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب "Reconstruction of Religous thought in Islam" میں تفصیلی بحث کی ہے- یہاں ہم لاشعور کے اس قدر تعارف کے بعد اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں- لیکن اس سے پہلے ہمیں لاشعور کی دنیا کے ایک دلچسپ پہلو یعنی ''خواب'' پر روشنی ڈالنے کی بھی ضرورت ہے-

خواب

ہم جب نیند کی حالت میں چلے جاتے ہیں تو ہمارا شعور بظاہر ریسٹ کی حالت میں ہوتا ہے- شعور چونکہ دن بھر متواتر کام کرتا رہتا ہے- لہٰذا آرام کی چند گولیاں اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں- تاکہ دوبارہ کام کے لیے وہ پھر سے تازہ دم اور تیار ہو جائے- لیکن بعض اوقات نیند کی حالت میں بھی شعور کو آرام نہیں کرنے دیا جاتا اور وہ بدستور کام کرتا رہتا ہے- فرق صرف یہ ہے کہ اب حواس ظاہری طور پر حالت سکون میں محسوس ہوتے ہیں- لیکن حقیقت میں ہوتا یوں ہے کہ انسانی ذہن کے مانیٹر کی سکرین یعنی شعور پر کسی اجنبی دنیا سے خواہشات‘ حسرتیں اور دیرینہ آرزوئیں نکل نکل کر مبہم اور مہمل ترتیب کے ساتھ پردۂ ذہن پر نمودار ہونے لگتی ہیں- ہمارے حواس خمسہ میں سے

چونکہ سب سے زیادہ حساس قوت باصرہ ہے- لہٰذا ہم خواب کو سب سے زیادہ آنکھ کے پردے پر محسوس کرتے ہیں- جب ہم حالت خواب میں ہوتے ہیں- تو ہمارا شعور نظر آنے والی چیزوں کو اپنی ہمت کے مطابق معنی بھی پہنا رہا ہوتا ہے- لیکن جب ہماری آنکھ کھلتی ہے- تو ہمیں نہ صرف ان اجنبی معلومات پر حیرت ہوتی ہے بلکہ ان معنی پر بھی جو شعور نے خواب کی حالت میں معلومات کو پہنائے-

خواب پیدا ہونے کی وجہ

ماہرین نفسیات کے نتائج کی نتائج میں خواب پیدا ہونے کی وجہ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ جب ہم عام جاگتی ہوتی زندگی سے کسی ایسی چیز کو تمنا کرتے ہیں جس کا حصول قواعد وضوابط کی پابند دنیا میں ناممکن ہوتا ہے- تو ہمارا خیال‘ تصور اور تمنا کچھ وقت کے بعد ہمارے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں- اس کے بعد کچھ وقت تحت الشعور میں قیام پذیر رہنے کے بعد لاشعور کے اندھے کنویں میں جا گرتی ہیں- لیکن وہ خیال‘ تصور یا خواہش اتنی شدید تھی کہ گہرے کنویں کی تہہ سے آپ تڑپتے ہوئے قیدی کی طرح بار بار اوپر کی طرف اٹھتی اور لپکتی ہے- لیکن لاشعور سے کسی چیز کا حالت بیداری میں واپس آ جانا ممکن نہیں- یہی وجہ ہے کہ جب ہم محو خواب ہوتے ہیں تو ہمارے لاشعور میں آ دھمکتی ہے- گویا ہم جاگتے ہوئے جو نہ کر سکے اسے خواب کی حالت میں کرنا چاہتے ہیں- تاکہ زندگی کو اپنی تکمیل کا احساس ہو سکے- لیکن یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض خواہشات‘ تمنائیں‘ تصورات اور خیالات اخلاقی‘ تہذیبی اور روایتی لحاظ سے اس قدر ناممکن العمل اور باعث شرم ہوتے ہیں کہ ہمارا شعور نیند کی حالت میں بھی اپنے دامن میں ان کا وجود برداشت نہیں کر سکتا اور ان کو قبول نہیں کرتا- ایسی صورت میں خواب سے ہماری آنکھ کھل جاتی ہے-

خواب میں ڈرنا

اس طرح کی بعض خواہشات لاشعور کے اندھے کنویں سے نکلتے وقت یہ چالاکی کرتی ہیں کہ اپنا بھیس بدل لیتی ہیں اور درمیان میں موجود محتسب یعنی تحت الشعور کے کمرے سے دبے پاؤں

گزرتی اور شعور میں عجیب وغریب تصویروں اور ہیولوں کی صورت نمودار ہوتی ہیں۔ اس طرح کی خواہشات چونکہ بیداری کے عالم میں نہایت ناجائز تھیں۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد محتسب بیدار ہو جاتا ہے اور انسان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ جسے ہم خواب میں ڈر جانا کہتے ہیں۔

جذبۂ جنس اور لاشعور کی دنیا

ہم جو خواب دیکھتے ہیں بعض اوقات ہمیں بیدار ہو کر یاد ہی نہیں رہتے۔ بعض خواب کچھ وقت تک یاد رہتے ہیں اور بعض دیر تک ہمیں نہیں بھولتے۔ خواب میں نظر آنے والی تصاویر بھی ہمارے لیے عمر بھر معمہ بنی رہتی ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ ہم ایک کشتی میں سوار ہیں اور کشتی سرخ رنگ کے پانی میں بہاؤ کی مخالف سمت بہتی چلی جا رہی ہے۔ اب ہمیں بیدار ہو کر خواب تو یاد رہ گیا۔ لیکن ہم عمر بھر پانی کے رنگ اور بہاؤ کی الٹی سمت میں کشتی کے سفر کو کوئی تسلی بخش معانی نہ پہنا سکے۔ فرائڈ نے اس طرح کی کشتی کو عورت کی فرج کی علامت کہا ہے۔ خواب دیکھنے والے کا اس میں بیٹھنا فعل جنسی کی علامت۔ سرخ رنگ کا پانی، خون بہاؤ کی الٹی سمت لذت و سرشاری کی علامات ہیں۔ کیونکہ الٹی بہتی ہوئی کشتی نہ صرف لطف دینے والے ہچکولے کھاتی ہے بلکہ دریا کی نرم سطح کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عموماً جنسی خواہشات اور تصورات خواب کے عالم میں ہمارے ذہن پر یلغار کرتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ سوسائٹی میں رہتا ہوا انسان ہر لحظہ پیدا ہونے والی جنسی خواہشات کو پورا تو کر نہیں سکتا۔ وہ خواہشات اور تصورات روپ بدل کر شعور میں آنا اور پوری ہونا چاہتی ہیں۔ ماہرین نفسیات نے تجربات کیے تو انہوں نے نتیجہ نکالا کہ عورتیں خواب دیکھتی ہیں تو ان کی تصویری علامات مردوں کے خوابوں کے مقابلہ میں یکسر الٹ ہوتی ہیں۔ خصوصاً وہی خواب جو جنسی تمنا کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے اور اس کی وجہ عورتوں اور مردوں کی جسمانی ساخت ہے۔ اونٹ پر بیٹھی ہوئی عورت اور گاڑی میں سفر کرتا ہوا مرد دونوں حالت خواب میں جنسی تسکین حاصل کر رہے ہیں۔ لہٰذا زیادہ تر خواب بھی ایسی جنسی خواہشات کی تکمیل کا مجازی (عینی) روپ ہیں۔ جو بیداری کے عالم میں پوری ہونا تو درکنار سوچنا بھی جرم سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً کون شخص یہ تسلیم کرنے کی جرات کر سکتا ہے کہ اسے اپنے محترم رشتوں میں سے کسی کے ساتھ جنسی وصال کی خواہش پیدا

ہوئی۔ ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی، بھاوج، سالی ایسے رشتے ہیں جن کے ساتھ جنسی رغبت کی سوچ ہی انتہائی قبیح، رذیل اور گھٹیا سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جنسی کشش اور جذبۂ شہوت حقیقت میں محض حیوانی سطح کی ایک فطری کارکردگی ہے اور حیوان رشتوں کی پہچان سے معذور ہوتے ہیں۔ دراصل محترم رشتوں کے ساتھ جنسی رغبت کے خیال کو شعور کی بے پناہ قوت دماغ میں گھسنے سے روکتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہی شعور، حیوان اور انسان کے مابین تمیز کا باعث ہے۔ اب انسان کے اندر چھپا ہوا حیوان اپنی فطرت سے باز نہیں آتا اور وقتاً فوقتاً انسانی ذہن کو اس قسم کی قبیح حرکات پر مائل کرتا رہتا ہے۔ لیکن شعور جو ایک انسان کا خاصا ہے اس حیوان کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نتیجتاً وہ حیوانی خواہش جو مختصر وقت کے لیے پیدا ہوئی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر وہی خواہش جب انسانی شعور...... نیند کی حالت میں تھا چپکے سے شعور کے احاطے میں آ کر خود بخود پورا ہونا چاہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا زیادہ تر طرزِ عمل حیوانی سطح کا ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، بچے پیدا کرنا، بچوں کی حفاظت کرنا، بچوں کے لیے رزق تیار کرنا۔ اس طرح کے عوامل انسانی زندگی میں حیوانی سطح کے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حیوان اپنے بچے، ایک خاص عمر تک اپنے ساتھ رکھتا، ان کی حفاظت کرتا اور ان کے لیے رزق کا بندوبست کرتا ہے۔ لیکن جونہی وہ بچہ عمر کی ایک خاص حد سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی ماں اس سے رشتے کی حیثیت بھول جاتی ہے اور نہ ہی بچہ ماں کے رشتے کو پہلے جیسے انداز میں پہچان سکتا ہے۔ اب چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات گائے، بھینس، بکری، اونٹ وغیرہ میں جنسی رغبتوں اور رشتوں کی پہچان کا نظام یہی کارفرما ہے۔ لہٰذا آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو شعور کے بغیر محض ایک ممالیا جانور ہے...... بھی فطری طور پر اپنے اندر نہ تو رشتوں کی پہچان رکھتا ہے اور نہ ہی جنسی رغبتوں کے لیے کوئی شرائط، لیکن شعور کا اضافہ ہوتے ہی اسے محترم رشتے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر انسان ماں، بہن کی پہچان کھو دیتا ہے۔ اس تجربے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہوا کہ شعور کے غیر حاضر ہونے سے انسانی رویے تبدیل ہو گئے اور حیوانی جذبے غالب آ گئے۔ اسی طرح ایک پاگل شخص سے بھی رشتوں کے احترام کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ پھر بھی وہی نکلا کہ فطرت میں ان محترم رشتوں میں کوئی تقدس نہ تھا اور یہ صرف شعوری کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہم نے ماں کو ماں، بہن کو بہن اور بیٹی کو

بیٹی سمجھا۔

اس سے آگے چلیے تو ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ لاشعور میں ہی انسان کی حیوانیت کا سب سے بڑا ریکارڈ اور فطری سطح کی خواہشات کا انبار موجود ہے۔ اسی لاشعور میں کہیں انسانی سطح کی رحمانی ہدایات بھی محفوظ ہیں۔ جیسا کہ

فالھمھا فجورھا وتقوٰھا

کی آیت میں اللہ رب العزت نے دعویٰ کیا ہے...... بحث کا یہ مقام خاصا نازک اور دلچسپ ہے۔ لاشعور کے تاریک ریکارڈ روم میں حیوانی سطح کی جو مذموم آرزوئیں اور تصورات پوشیدہ ہیں۔ یعنی فجور۔ تو یہ...... ابن آدم کے باطن کا وہ خطرناک حصہ ہے جو وقتاً فوقتاً انسان کو برائی کی طرف مائل کرتا یا آمادہ کرتا ہے۔ گویا لاشعور کا یہ حصہ **الذی یوسوس فی صدور الناس** یعنی انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالنے والا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لاشعور میں موجود مذموم خواہشات تو عالم خواب میں نمودار ہوئیں۔ پھر عام زندگی میں برائی کی طرف مائل شخص نے ان سے رہنمائی کیوں لی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لاشعور نے محض ہمارے خوابوں پر ہی تسلط حاصل نہیں کر رکھا۔ بلکہ ہماری عادات بھی اسی کی وجدانی رہنمائی کے زیر اثر مرتب ہوتی ہیں اور یوں لاشعور میں موجود مذموم ارادے ہماری عادتوں کے ساتھ ہمارے کردار پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس لاشعور کے ریکارڈ روم میں تقوے کا الہام بھی موجود ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ تقویٰ اس وقت تک کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا جب تک اس کے لیے باقاعدہ شعوری طور پر کوشش نہ کی جائے۔ سادہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ شیطان خود بخود اور بغیر اجازت حملہ آور ہو جاتا ہے۔ جبکہ رحمان کی طرف رجوع کرنے کے لیے مصمم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ آسان الفاظ یہ ہیں کہ فطرت کو سرزد ہونے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ فطری خواہشات کو غلبہ حاصل کرنے کے لیے محض اس وقت رکاوٹ پیش آتی ہے جب کوئی متقی اور پرہیزگار انسان شعوری طور پر ارادہ کر کے فطرت کو اپنے اوپر غالب آنے سے باز رکھتا ہے۔

انسان نے شعور کا سورج روشن ہونے کے بعد ہی رشتوں کے تقدس کی تعیین کی۔ ورنہ اس سے پہلے انسان بھی عام جانوروں کی طرح ماں، بہن اور بیٹی کا فرق نہیں جانتا تھا۔ پیدائش آدم کے

سلسلے کی بعض مذہبی روایات بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں آیا ہے کہ آدم کے بیٹے اور بیٹیوں کے مابین شادیاں کر دی جاتی تھیں۔ اس روایت سے دراصل اصل مقصود یہی ہے کہ شعور کا شجر ممنوعہ کھانے سے پہلے یعنی ارتقائے آدم کے اس مرحلے کے دوران جب وہ وہاں سے انسان بننے جا رہا تھا۔ محترم رشتوں کے تقدس کا شعور ابھی اجاگر نہیں ہوا تھا۔

ثابت ہوتا ہے کہ انسان پر لاشعور کی مذموم خواہشات گویا حیوانی جذبے تو ازل سے حاوی ہیں جبکہ نیک اعمال یعنی خالص انسانی خصلتوں کی ترغیب بعد میں اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مذہب نے بھی اسی ترتیب سے پیدائش آدم کا واقعہ بیان کیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارادہ کہ ملائکہ تو بہت ہیں اب انسان پیدا کروں۔ پھر شیطان کا نمودار ہونا اور اللہ کے اس ارادے کی مخالفت کرنا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا انسان کو پیدا کر دینا۔ پھر ملائکہ جو کائنات کا نظام چلانے والی قوتوں کے مالک ہیں...... کا باشعور انسان کے حضور سجدہ ریز ہونا اور پھر شیطان کا انسان کی ابدی دشمنی کے اعلان تک...... بعینہ وہی تصویر ہے جو ماہرین حیاتیات اور نفسیات نے ارتقائے آدم کی پیش کی ہے۔ زمین پر اور کائنات میں ملائکہ سب سے پہلے تھے جو اللہ کی تابعدار مخلوق تھی۔ جبکہ سائنس کہتی ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں پہلے پیدا ہوئیں اور انسان کی تخلیق بتدریج ہوئی...... پھر بقول ماہرین ارتقاء انسان نے اپنے ابتدائی دور میں قابل بھروسہ جسمانی ساخت کے بل پر اپنے ہم عصر جانوروں پر برتری حاصل کر لی اور تمام درندوں سے زیادہ خونخوار ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ درجہء انسانیت پر فائز نہیں ہوا تھا اور ابھی اپنی خالص حیوانی خواہشات کے مطیع تھا۔ گویا ابلیس کی تخلیق ہو چکی تھی۔ مذہب نے اس مقام پر بھی صحیح بات بتائی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے زمین پر جنات (خونخوار لوگ) بستے تھے۔ یہ وہی خونخوار لوگ تھے جن کی حیوانی فطرت ان پر غالب تھی اور وہ شیطانی قوتوں کے غلام تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے "خلیفۃ اللہ فی الارض" بنانے کے لیے ایک ایسے عظیم اور شاندار منصوبے کا اعلان کیا جس نے کائنات کے ذرے ذرے کو ششدر کر دیا۔ بے پناہ طاقت کی مالک قوتیں سورج، چاند اور ستارے پیش آمدہ غلامی کے خیال سے لرزنے لگے۔ خونخوار لوگوں کے شیطانی نفس نے اپنی بالادستی کے ختم ہو جانے کے خوف سے صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن خالق کا بے مثال پروگرام اٹل رہا اور ایک ایسی شاندار ہستی کا ظہور ہوا

جس کی روح بہشت کے لالہ زاروں سے بلوائی گئی - اسے خلعت بشری پہنائی گئی اور اس کے مزاج میں ایک ایسی برق تپاں بھر دی گئی کہ...... جو اسے سیماب کی طرح مضطرب رکھتی ہے - بہشت کی روح...... یعنی شعور کے اتصال کے بعد وہی کافر ادا انسان نما حیوان ایسا شرار مضطرب ثابت ہوا جس کے قدم کونین سے قوسین تک کہیں نہ سمائے اور جس کے ارادے حدود خداوندی سے ٹکرانے لگے - لیکن المیہ یہ ہوا کہ اس کے پرانے دشمن ابلیس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے سب سے بڑے ہتھیار یعنی شعور کو...... لاشعور کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر کند کرنا شروع کر دیا -

تصریحات بالا سے ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کے نفس میں چھپا ہوا حیوان اپنے حملوں سے باز نہیں آتا اور انسان کو ایسے ایسے نادرست اعمال کے لیے اکساتا رہتا ہے جو اسے بحیثیت ابن آدم سرانجام نہیں دینے چاہئیں - اگرچہ اس قسم کے جذبات کی فہرست طویل ہے لیکن ان میں سب سے بڑا جذبہ جو انسان کو پل بھر میں وہی قدیم درندہ بنا دیتا ہے وہ جذبہء شہوت ہے - اگر شعور اس کے خلاف مزاحمت نہ کر سکے تو ماں' بہن اور بیٹی کی پہچان کھو جاتی ہے اور ہوا بھی یونہی کہ انسان نے شعور کے ہتھیار کے ذریعے مزاحمت کرنے کی بجائے الٹا شعور کو جذبہء شہوت کی تسکین کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کے لیے استعمال کیا - اب ایک باشعور انسان سوچی سمجھی سکیم کے تحت جنسی تسکین حاصل کرتا ہے اور اس مذموم مقصد کے لیے وہ ایسے ایسے حربے استعمال کرتا ہے کہ ملائکہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں - ان حربوں میں سب سے زیادہ قبیح ہم جنس پرستی ہے -

جنسی بے راہ روی میں لاشعور کا ہاتھ

یہ تو ہم ثابت کر چکے ہیں کہ انسان کی خواہشات جب پوری نہیں ہو پاتیں تو لاشعور میں کہیں چپکے سے دم سادھے دبک جاتی ہیں اور انہیں جب بھی موقع ملتا ہے - انسانی کردار پر حملہ آور ہوتی ہیں - دراصل بات اس وقت بگڑنا شروع ہوتی ہے جب انسان کی فطری خواہشات پیدا ہونا شروع ہوتی ہیں - اگر انسان کو ایسا ماحول مہیا کر دیا جائے کہ اس کے دل میں ایسی تمنائیں جنم ہی نہ لیں تو انسانی کردار اجتماعی طور پر سنور سکتا ہے - یہ لاشعور...... وہی تو ہے جسے باطن کہتے ہیں اور جس میں قرآن کے بقول تقویٰ اور فجور کا الہام موجود ہے - یہ دبکی ہوئی خواہشات' سربریدہ تمنائیں' سہمی

ہوئی آرزوئیں جو حیوانی نفس نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہیں فجور ہی تو ہیں - وہی شیطانی وسوسہ جو فی "صدور الناس" اتر جاتا ہے اور انسان اس کی اطاعت میں اپنی بشری عظمت کو بھلا دیتا ہے - اس کے دل و دماغ پر "وسواس الخناس" چھا جاتے ہیں - اس کے لیے رشتے' رشتے نہیں رہتے اور روایات' روایات - اس کے لیے دنیا کا ہر جرم دلکش بن جاتا ہے - اسے اپنے ہی دل سے اپنے عمل کے جواز ملتے ہیں - بقول قرآن

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاء

ترجمہ: ان کے دلوں میں مرض ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے مرض کو بڑھاتا رہتا ہے -

وہ اپنے نفس کے غلام ہو جاتے ہیں اور وہ کام کرنے لگ جاتے ہیں جو جانور بھی نہیں کرتے - بقول قرآن

اولئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا

ترجمہ: وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ

یوں لاشعور انسان کے سب سے قیمتی اثاثے کو ڈس لیتا ہے - دھیرے دھیرے شعور مکمل طور پر شکست کھا جاتا ہے اور کالا باطن دل و دماغ پر چھا جاتا ہے - عقل سلب ہو جاتی ہے - آنکھوں پر پردہ چڑھ جاتا ہے - کان معذور ہو جاتے ہیں اور زبانیں کند - ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ صم" بکم" وعمی"...... کہہ کر پکارتا ہے - ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں - ان پر مہریں لگ جاتی ہیں اور وہ...... او اشد قسوہ (پتھر سے بھی سخت) ہو جاتے ہیں - انسان اپنی انسانیت تو کیا حیوانیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور قعر مذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتا ہے - جہاں "ویل" ہے بہت گہری جہنم -

ثابت ہوا کہ جنسی بے راہ روی محض "اکیلا" جرم نہیں - پوری انسانی شخصیت کا قاتل ہے - تجربات جدید مشرق کے سب سے بڑے حکیم علامہ اقبال نے اپنے خطبات (۹۵) میں فرمائی ہے - "بات یہ ہے کہ جنسی ضبط نفس ہی خودی کی تربیت کا اولین مرحلہ ہے -"

ظاہر ہے جب تربیت کا اولین مرحلہ ہی شرمناک ہو تو باقی ماندہ ذات کی تربیت کس قدر باعث ندامت اور بارگراں ہوگی - یورپ والوں کی "ہستیاں" یعنی خودی اپنی تربیت کے اولیں

مرحلے میں ہی جنسی بے راہ روی کا شکار ہو کر برباد ہو جاتی ہے- یہی وجہ ہے کہ ان کا پورا معاشرہ انسانی خصلتوں سے گر کر حیوانی سطح تک آ پہنچا ہے- کتنی بھیانک صورت حال ہے یہ..... اور کتنا افسوسناک مقام ہے انسانیت کے لیے- اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ ایسی اقوام کے عبرتناک انجام کی داستانیں بیان کیں اور اب تو ہم اہل مشرق بھی تہذیبی اعتبار سے یورپ والوں کے شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت حاصل کرتے جا رہے ہیں-

دیکھا آپ نے..... فرد واحد پر حملہ آور ہونے والا اس کے لاشعور کا خانۂ فجور کس طرح پوری قوم کے مقدر پر چھا گیا-

اشتہا اور شہوت

دنیا میں انسان پر غالب ہونے والی دو ہی ایسی قوتیں ہیں جنہیں تسخیر کرنا قریب قریب ناممکن سمجھا جاتا ہے- ایک ہے ”اشتہا“ اور دوسری ”شہوت“-

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ان قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے..... تو یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے اور یا وہ اربوں انسانوں میں ”استثناء“ ہے- ”ولی ہو یا صوفی“، ”رشی ہو یا منی“، ”عالم ہو یا زاہد“ ماسوائے انبیاءؑ کے یا عشرہ مبشرہ کے یا اہل بیت رسولؐ کے..... مشکل سے ہی کوئی ہستی ایسی نظر آتی ہے جو فطرت کی ان زبردست قوتوں کا مقابلہ کر سکی ہو- تاریخ میں بڑی عجیب و غریب کہانیاں بکھری پڑی ہیں- مشہور بات ہے کہ جب ”گوتم بدھ“ نے زندگی کی آخری تپسیا کی اور چالیس دن تک بغیر کچھ کھائے پیئے ایک پتھر پر بیٹھا رہا تو اس کے اردگرد چھپے ہوئے اس کے بھکشوؤں (مریدوں) کو خیال ہوا کہ مہاتما کا انتقال ہو گیا ہے- وہ پتھروں کی اوٹ سے نکلے اور ”مہاتما جی“ کا حال معلوم کیا- تو پتہ چلا کہ اس شکتی مان میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے- لیکن ”گوتم بدھ“ کی حالت اس وقت بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ مردہ انسان کی ہوتی ہے- انہوں نے ابلے ہوئے چاول کا ایک دانہ ان کے حلق میں اتارا تو مہاتما جی کی پلکوں میں حرکت ہوئی- چند لمحوں بعد انہوں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرا دیئے- کہتے ہیں یہ وہی لمحہ تھا جب انہیں ”نروان“ حاصل ہوا اور اگر یہ سچ ہے کہ اس لمحے انہیں ”نروان“ جیسی دولت نصیب ہوئی

تو ثابت ہوتا ہے کہ ”نروان“ بھی ملا تو اس وقت جب ”گوتم جی“ کے پیٹ میں ”چاول“ کا دانہ پہنچا- انسان بھوک میں سب کچھ بھول جاتا ہے- بقول ساحر

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

کہتے ہیں..... کسی نے بھوکے سے پوچھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ اس نے جواب دیا ”چار روٹیاں“- یہ بھی ایک قدیم روایت ہے کہ قدیم زمانہ کی کوئی قوم کسی بت کی پوجا کرتی تھی جو ”ستو“ کا بنا ہوا تھا- ایک مرتبہ اس قوم پر قحط پڑا اور وہ اپنے خدا کو گرا کر کھا گئے-

ہاں! یہ سچ ہے کہ جب بھوک کی شدت بڑھتی ہے تو انسان اپنے خدا تک سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے- اسے سب سے پہلے غصہ ہی اپنے پروردگار پر آتا ہے جس نے اسے بھوکا مارا- روس میں یہی کچھ تو ہوا- جب بھوک بڑھی تو لوگوں نے پادریوں کو پکڑ کر قتل کر دیا اور ملک کا نظام بدل کر اشتراکیت کو نافذ کر دیا- بھوک میں انسان باؤلا ہو جاتا ہے اور خالی پیٹ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا- ڈھول تب ہی زیادہ زور سے بجتا ہے جب اس کا پیٹ خالی ہو- لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ روٹی جیسے ہی بھوکے کے پیٹ میں پہنچتی ہے- سب سے پہلے اس کے نفس پر حملہ آور ہوتی ہے اور اس کی شہوت کو جگا دیتی ہے- شہوت؟ وہ قوت ہے جس نے بڑے بڑے جغادری پہلوانوں کو اپنے حضور سرنگوں کر دیا- جو سر چڑھ کر بولتی ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر اپنا لوہا منواتی ہے-

ماہرین نفسیات میں ”سگمنڈ فرائڈ“ ہی وہ سائنس دان ہے جس نے اس قوت کے حقائق پر گہری نظر ڈالی- اس نے طرح طرح کے تجربات کیے، بڑی بڑی کتابیں لکھیں اور کئی سال کی انتھک محنت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ

”نیک شخص وہی ہے جسے عورت دستیاب نہیں“

ہم فرائڈ کے اس جملہ کی وضاحت ایک حکایت کی مدد سے کرتے ہیں- کہتے ہیں کہ حضرت رابعہ بصریؒ عورتوں میں دنیا کی سب سے نیک عورت اور ولیہ تھیں- جبکہ حضرت حسن بصریؒ اولیاء کرام میں سب سے زیادہ برگزیدہ تھے- لیکن کسی شخص نے خواب دیکھا اور دیکھا کہ اسے خواب میں شیطان ملا ہے اور شیطان اس شخص سے کہہ رہا ہے کہ اگر رابعہ بصریؒ اور حسن بصریؒ کو اکیلے کمرے

میں بٹھا دیا جائے تو میں ایک لمحے میں دونوں کو جنسی گناہ میں مبتلا کر دوں گا۔

"فرائڈ" کے بقول "کسی انسان کا جنسی حملہ سے بچنا ممکن نہیں ہے۔"

"انسانی نفسیات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز جنس ہے (۹۶)۔ یہاں تک کہ ایک ماں اپنی اولاد میں لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو زیادہ چاہتی ہے۔ تو اس کی وجہ اس کی جنسی رغبت ہے۔ بعینہ اسی طرح جب ایک باپ اپنی اولاد میں بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ بھی جنس مخالف کی کشش ہے۔ اسی طرح عورتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نر جانور زیادہ پالتی ہیں۔ مثلاً کتا، بندر وغیرہ اور مرد "مادہ" جانوروں کو شوق سے پالتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی جنسی جذبے کی تسکین ہے"

بظاہر فرائڈ کی یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا غور کریں تو یہی کچھ نظر آنے لگتا ہے کہ واقعی والدین اپنی اولاد کو اس بالعکس تناسب کے تحت چاہتے ہیں۔ فرائڈ جنسیات کے موضوع پر دنیا کا سب سے بڑا اور ماہر نفسیات دان مانا جاتا ہے اور فرائڈ کا کہنا ہے کہ کوئی بھی انسان کسی بھی لمحے جنسی جذبے کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اس نے ایک مثال میں ہوائی جہاز کے پائلٹوں کی نفسیات کا مشاہدہ پیش کیا ہے۔

"وہ کہتا ہے کہ مرد پائلٹ جب بھی ڈائیو (Dive) کرتا ہے تو کھائیوں، دریاؤں اور گہرائیوں میں ڈائیو کرتا ہے۔ اس کے برعکس خاتون پائلٹ چوٹیوں، چٹانوں اور میناروں پر ڈائیو کرتی ہے۔"

اس کی وجہ بھی جنسی جذبے کی تسکین ہے۔

ویسے بھی اگر اپنے چاروں طرف غور کریں تو ہمیں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات میں جنسی جذبے کی تسکین کی تحریک بدرجہ اتم داخل ہو چکی ہے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ اخبارات میں عورتوں کی دلکش تصاویر شائع کی جاتی ہیں تاکہ مردوں کو زیادہ سے زیادہ اخبار کا قاری بنایا جا سکے۔ اشتہاری کمپنیاں تو چلتی ہی اسی بنیاد پر ہیں۔ ایسی ایسی چیزوں کے اشتہاروں میں نوجوان، حسین اور دلکش ماڈلز کی تصاویر دی جاتی ہیں جس چیز کے ساتھ عورت کا تعلق تک نہیں ہوتا۔ مثلاً عورت سگریٹ کے اشتہارات میں ہر جگہ موجود ہے۔ جبکہ پوری دنیا میں عورتوں کی سگریٹ نوشی مردوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

یہیں پر بس نہیں ٹی وی، ریڈیو، سینما، سٹیج، ڈش، کیبل وہ کون سی چیز ہے جسے جنسی کشش کی بنیاد پر نہیں چلایا جا رہا۔ جگہ جگہ بیوٹی پارلر محض اس لیے بنے ہوئے ہیں تاکہ عورت کو ایک شو پیس کے طور پر مردوں کے لیے تیار کریں۔ یہ بات ۹۹ فیصد سے زیادہ صحیح ہے کہ دنیا بھر کی جتنی عورتیں خود کفیل ہیں یعنی ملازمت پیشہ یا کاروبار ہیں۔ وہ اپنی کمائی کا بڑا حصہ محض اپنی شخصیت کو پرکشش بنانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس طرح گویا وہ پھر مردوں کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔

دراصل جنسی تسکین حاصل کرنے کے بے شمار ایسے طریقے ہیں جن پر عام حالات میں ہماری نظر ہی نہیں پڑتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محض ٹیلی فون پر ہی کسی لڑکی کی آواز سن کر مردوں کے دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ ایک پاکستانی ماہر نفسیات "پروفیسر سرفراز" نے اپنا ایک تجربہ بیان کیا۔

"میں نے ایک کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں کو اچانک آ کر کہا۔ لڑکو! اونچی آواز میں اوٹ پٹانگ باتیں بند کرو۔ تم لوگوں کو معلوم نہیں اندر کمرے میں لڑکیاں بیٹھی ہیں بے ہودہ گوئی مت کرو۔"

لڑکے پروفیسر صاحب کی آواز سن کر خاموش ہو گئے پھر آہستہ آہستہ بولنے لگے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ "میں نے ان میں سے ایک دو لڑکوں کی نبض کا گہرا معائنہ کیا۔ ان کے خون میں ہونے والی گردش کی رفتار اور حدت یکسر بدل چکی تھی۔" پروفیسر صاحب نے کچھ دیر بعد لڑکوں کو بتایا "سوری دوستو! مجھے غلط فہمی ہوئی۔ کمرے میں تو کوئی نہیں ہے، کمرہ خالی ہے۔

لڑکے ریلیکس ہو گئے اور پھر پروفیسر صاحب نے لڑکوں کے دوران خون کا مطالعہ کیا۔ اب لڑکوں کے خون کی گردش میں واضح فرق آ چکا تھا اور خون میں حدت بھی نہیں تھی۔ محض یہ بات ہی کہ لڑکیاں اندر موجود ہیں۔ باہر بیٹھے ہوئے لڑکوں کے جنسی جذبے کی تسکین کا باعث بن گئی۔ بظاہر یہ کتنی غیر اہم اور معمولی بات ہے۔ لیکن حقیقت میں اتنا سا واقعہ بھی انسانی نفسیات پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ دہلی کے ایک مشہور نابینا حکیم صاحب کے ساتھ بھی ایک عجیب و غریب واقع منسوب ہے۔

حکیم صاحب کسی مریض کے ہاں تشریف لے گئے۔ گھر کے دروازے پر مریض کی نوجوان

لڑکی حکیم صاحب کو لینے کے لیے آئی۔ حکیم صاحب چونکہ نابینا تھے۔ لہٰذا صاحب خانہ کی جوان بیٹی نے حکیم صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور اوپر اپنے والد کے پاس چھوڑ کر چلی گئی، حکیم صاحب نے مریض کو دیکھا، مرض کی تشخیص کی، دوا تجویز کی۔ اس کام میں کوئی گھنٹہ بھر لگ گیا۔ ایک گھنٹہ بعد جب حکیم صاحب جانے لگے تو پھر اسی صاحب زادی کو بلایا گیا اور پھر صاحبزادی نے حکیم صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ واپسی کے راستے میں حکیم صاحب دہلیز تک آئے اور صاحبزادی سے کہنے لگے۔

"لڑکی! مجھے ایک بار پھر اپنے باپ کے پاس لے چلو مجھے ایک ضروری چیز یاد آ گئی ہے۔"

لڑکی حکیم صاحب کو واپس اوپر اپنے والد صاحب کے پاس لے آئی۔ حکیم صاحب نے لڑکی کو جانے کی اجازت دی اور اس کے والد سے کہا جو مریض تھا۔

"بھائی صاحب! ناراض مت ہونا، ایک بات کروں۔ جب تمہاری بیٹی پہلی بار مجھے لینے کے لیے آئی تھی تو کنواری تھی۔ لیکن اب جب ایک گھنٹہ بعد مجھے لینے آئی ہے تو کنواری نہیں رہی۔"

صاحب خانہ سمجھدار آدمی تھے۔ انہوں نے غصہ کرنے کی بجائے حکیم صاحب سے اس کی وجہ پوچھی تو حکیم صاحب فرمانے لگے۔

بھائی صاحب! تمہاری بیٹی نے میرا ہاتھ دو بار تھاما ہے اور دوران خون میں گردش کی تبدیلی سے میں نے یہ بات محسوس کر لی ہے۔"

اب حکیم نابینا صاحب دلی کے مشہور نباض تھے۔ صاحب خانہ کو ان کی بات کا یقین کرنا پڑا اور جب صاحب خانہ نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ صاحبزادی اس دوران جب حکیم صاحب اس کے والد کی تشخیص کر رہے تھے پچھلے کمرے میں اپنے آشنا کے ساتھ مصروف گناہ تھی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی لذت کے حصول کے دوران خون کی گردش میں تبدیلی کیونکر واقع ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کی کہانی میں تو چلو! صاحبزادی انتہائی سطح کا گناہ کر رہی تھی۔ لیکن پروفیسر سرفراز کے تجربے میں بظاہر تو سیکس کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی نوجوانوں میں جسمانی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ دراصل جنس مخالف کی کشش ہزاروں سال میں انسان کے اندر اپنے معیارات بدل چکی ہے۔ یہ معاملے جانوروں کو درپیش نہیں۔ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ جانور صرف افزائش نسل کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک خاص وقت میں ملاپ کرتے ہیں۔ باقی اوقات میں ایک دوسرے سے ایسے بے پرواہ ہوتے ہیں جیسے کبھی اس قسم کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

لیکن ان کے برعکس انسانوں نے اپنی شعوری کوشش کے ذریعہ اس جذبے کو اپنے اوپر اس شدت سے سوار کر لیا ہے کہ اس کے جینز میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور انسان سوتے جاگتے میں کسی لمحہ بھی جنسی لذت کے حصول سے غافل نہیں ہوتا۔ "ادبیات" میں شائع ہونے والا افسانہ جو یہاں مختصر کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ "شہوت" کے نفسیات پر گہرے اثرات کی عمدہ مثال ہے۔

"ہسپتال کی گیلریوں میں ہر طرف لوگ آ جا رہے ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر کا سب سے مشہور ہسپتال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ایک طرف ڈسپنسری کی کھڑکی کے سامنے دوائیں لینے والوں کی لمبی قطار لگی ہے۔ اس قطار میں ہر عمر کے آدمی کھڑے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کے لیے یا اپنے لیے دوائیں لینے آئے ہیں۔ اتنے میں ایک بیمار نوجوان ہاتھ میں ڈاکٹر کی پرچی لیے آتا ہے۔ اتنی لمبی قطار دیکھ کر اس کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کیونکہ بیماری کی وجہ سے اس میں لمبے انتظار کی سکت نہیں ہے اور نہ ہی وہ قطار میں لگ کر دھکوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ قطار کے آخر میں ڈھیلے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا جا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ مایوس چہرہ لیے قطار ختم ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ لیکن قطار شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر ادھر سے لوگ آ کر بغیر قطار کا لحاظ کیے زبردستی درمیان میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھڑکی کے پاس بھی بدنظمی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ بعض لوگ دھونس دھاندلی کے ذریعے سے سب سے پہلے دوائیں لے کر جا رہے ہیں۔ بیمار نوجوان بے حد مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ دوا لینے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی پرچی کو بیزاری سے دیکھتا ہے اور پھاڑ دیتا ہے۔ اب وہ بغیر دوا لیے ہی باہر جا رہا ہے واپس گھر۔ ہسپتال کے گیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھکتا ہے۔ اس کی نظر ایک خوبصورت دوشیزہ پر پڑتی ہے۔ جو گیٹ کا سہارا لیے مضمحل اور پریشان کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر حوروں جیسا حسن ہے اور فرشتوں جیسی پاکیزگی ہے۔ اس کے خدوخال ایسے ہیں کہ آنکھ ٹکتی نہیں۔ دوشیزہ بھی بیمار نوجوان کو دیکھ لیتی ہے۔ تھوڑا سا مسکرانے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے۔

"ذرا سنیئے!"

نوجوان ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ اس کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ وہ دوشیزہ کی جانب تیزی سے قدم بڑھاتا ہے۔

"دیکھئے! وہاں قطار بہت لمبی ہے اور دھکم پیل بھی بہت ہے- میری ماں بیمار ہے اور اس کے لیے دوا لینا ہے- لیکن میں لڑکی ہو کر مردوں کی قطار میں کیسے جا گھسوں- پلیز! مجھے دوا لا دیجیے-"

لڑکی بات کرتے ہوئے دوا کی پرچی نوجوان کی طرف بڑھاتی ہے- بیمار نوجوان لپک کر پرچی پکڑ لیتا ہے- کچھ دیر تک خالی نظروں سے خلا کو گھورتا رہتا ہے اور پھر تیزی سے ڈسپنسری کے سامنے لگی قطار کی طرف چل پڑتا ہے- اس کی چال میں توانائی آ چکی ہے- وہ تیز رفتار قدموں کے ساتھ ڈسپنسری کی کھڑکی کے پاس آ جاتا ہے- اس کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آ چکی ہے کہ اپنی بیماری کو خاطر میں لائے بغیر آناً فاناً اس دوشیزہ کے لیے دوائی حاصل کر لیتا ہے-"

انسانی فطرت میں سیکس کے معیارات دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اس قدر بدل چکے ہیں کہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ ناقابل تسخیر قوت انسانی مزاج پر اس حد تک غلبہ پا چکی ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ، کوئی حرکت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی- کاروبار ہو یا گھریلو زندگی، خلوت ہو یا محفل، آزادی ہو یا غلامی، جنسی رغبت نے ہر مقام پر انسانیت کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے-

بے چین روح

ہم پچھلے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ انسانی جینز کے ذریعے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں بھی اگلی نسل کو منتقل ہو جاتی ہیں- اگر والدین خود ذہنی مریض ہیں- ایک دوسرے کے ساتھ مزاجی ہم آہنگی نہیں رکھتے تو پیدا ہونے والے بچے پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں- جینز کے علاوہ بچے کی شخصیت پر ماں باپ کی طرز معاشرت کے بھی اثرات پڑتے ہیں- مثلاً ایک میاں بیوی محض جنسی حظ حاصل کرنے کی خاطر ہم بستر ہوتے ہیں تو ان کے بچے کی شخصیت پر بھی جنسی ہوس کے آثار پائے جاتے ہیں- بقول شاعر

"میں ہوں اک تجربہ
اپنے ماں باپ کا
جو زمانے کی اس تجربہ گاہ میں

ان سے سرزد ہوا
مجھ کو یوں رحم مادر میں پھینکا گیا
جیسے جلدی میں ہو
احسن الخالقین
جیسے تنگ آ رہی ہو
زمین پر زمیں
ایک مدت
غلاظت کے زندان میں
اپنی کمزور ماں کا لہو پی کے جیتا رہا
اور پھر ایک دن
تجربہ گاہ میں
حادثے کی طرح
رونما ہو گیا
باپ جابر تھا ماں میری کمزور تھی
روح دونوں کی اک دوسرے سے بڑی دور تھی
میری بے چینیاں
میری بے تابیاں
میری سیلانیاں
میری بے خوابیاں
یہ اسی دن سے ہیں
آج زندہ ہوں میں
ایک ناکام سے تجربے کی طرح
یا تو مجھ پہ یہ ساری زمین تنگ ہے

یا تو میں اس زمیں پر بہت تنگ ہوں

یا تو میں ہوں غلط فیصلے کی طرح

یا غلط ہے مقدر کا ہر فیصلہ

تجربہ ایک دن

یوں مکمل ہوا

میں جواں ہو گیا

میرے خالق کی محنت اکارت گئی

اور میں مفت میں رائگاں ہو گیا

آپ نے ملاحظہ فرمایا شاعر اپنے آپ کو ایک ''ناکام تجربہ'' کہتا ہے۔ سچ بھی یہی ہے کہ ہمارے معاشرے بلکہ پوری دنیا کے معاشرے میں ''ازدواجی جوڑے'' بنانے کے معیارات خالصتاً سیکس کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی تمدن ہو' مرد اپنے لیے رفیقہء حیات تلاش کرتے وقت حسن ظاہری' شباب اور جنسی کشش کو انتخاب کا اصول مان لیتا ہے۔ بعینہ اسی طرح عورت کے مدنظر بھی مرد کی وجاہت' قوت مردانہ' طاقت اور جنسی رغبت ہی ہوتے ہیں۔ گویا ہمارے معاشرے کی ازدواجی زندگیاں جنسی ہوس کی بنیاد پر مرتب ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح نئے پیدا ہونے والے بچوں کی ضرورتوں اور تعلیم و تربیت یا انسانیت کی ضرورتوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا اور ہوتا یوں ہے کہ پہلے ملاپ سے عرف عام میں شب وصال یا سہاگ رات کہا جاتا ہے' سے شروع ہو کر جب تک دونوں میاں بیوی کے درمیان جسمانی ملاپ ہوتا رہتا ہے۔ افزائش نسل کی ضرورتوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی یہ سوچا جاتا ہے کہ ان کی ہمبستری کے نتیجہ میں اگر عورت کو حمل ٹھہر جاتا ہے تو کیا ہوگا۔ بس فرض کر لیا جاتا ہے کہ اولاد ہو گی...... اور اس سے دو قدم آگے بڑھ کر یہ نہیں طے کیا جاتا کہ کس طرح کی اولاد ہو گی۔ بچے کی فطرت کیا ہونی چاہئے۔ بچے کی صحت اور مزاج کیا ہونا چاہئے اور یہ کہ کیا والدین اپنی عارضی ''لذت'' کے نتیجہ میں دنیا میں ''آ'' جانے والے نئے انسان کو سنبھالنے اور پرورش کرنے کے کسی حد تک اہل ہیں؟

آپ اس حقیقت پر اپنے انداز میں غور کریں۔

۱۔ کیا اس نئے انسان کے بارے میں جو ابھی تک دنیا کے معاشرے میں ظہور پذیر نہیں ہوا عارضی لذت کے وقت والدین نے غور کیا؟

۲۔ کیا والدین اس قابل ہیں کہ دنیا کو ایک نئے انسان کا تحفہ دے سکیں؟

۳۔ کیا وہ محض جنسی حظ اٹھانے کی خاطر تو ہم بستری نہیں کرتے؟

اگر وہ ایسا کرتے ہیں یعنی محض جنسی حظ کی خاطر ملاپ کرتے ہیں تو یہ بات طے ہے کہ جو بچہ پیدا ہوگا اسے بقول شاعر حادثہ ہی کہا جائے گا۔

''حادثے کی طرح رونما ہو گیا''

چونکہ وہ بغیر کسی ''پروگرام'' یا ''منصوبے'' کے ظہور پذیر ہوا اور حادثہ تو حادثہ ہوتا ہے۔ اچانک نتیجہ دینے والا ایک دم سے۔

بالکل اس شعلے کی طرح جو اچانک لپکتا ہے اور اپنے ماحول کو تپتے ہوئے جہنم میں بدل دیتا ہے۔ اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو خس و خاشاک میں بدل دیتا ہے۔ وہ بچہ جس کی پیدائش ایک حادثے کی صورت میں ہوئی معاشرے کے لیے اس بھڑکتے ہوئے شعلے کا کام کرتا ہے۔

شادیاں ہم محض اس لیے کرتے ہیں کہ جنس مخالف کے جسم کی لذت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس نتیجے سے بے پرواہ ہو کر کہ اس جنسی لذت کی ہمیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ہم اس انسانی معاشرے کو نئی نسل دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہم سماج کے سسٹم میں خالی آسامیوں پر نئی بھرتیوں کا موجب بنتے ہیں اور جنسی ہوس کی وجہ سے سماج کو ایسے ناکام انسانوں کا تحفہ دے جاتے ہیں جو انسانی معاشرے کو مزید پستی کی طرف دھکیلنے کا باعث بنتے ہیں۔

بغیر منصوبہ بندی کے پیدا ہونے والا بچہ دنیا میں آ کر بے قرار رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذمہ داروں نے اس کے لیے نفسیاتی منہاج مقرر کیے بغیر اسے جنم دیا۔ شادی دو جسموں کے ملاپ کا نام نہیں ہے۔ اگر محض دو جسموں کا ملاپ ہی شادی کا مقصد ہوتا تو انسان کو انسان بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ کام تو جانور زیادہ بہتر کر لیتے ہیں۔ انسان کو تحفہء شعور دینے کا مقصد ہی ایسا انسانی معاشرہ تخلیق کرنا ہے جو جنت نظیر ہو۔ جہاں انسانیت اور انسانیت کے زیر سایہ اللہ کی باقی مخلوق امن اور سلامتی سے رہتی ہو۔ جہاں خوف اور حزن نہ ہو۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ

من امن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم فلا

خوف" علیھم و لا ھم یحزنون٥

"جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت پر' اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے اللہ کے پاس اجر ہے (جو یہ ہے کہ) نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی حزن۔"

بظاہر یہ دو الفاظ "خوف" اور "حزن" انتہائی معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی تصویر ذرا غور سے دیکھی جائے تو پورا معاشرہ نظر آ جاتا ہے۔

"خوف" کا یہ عالم ہے کہ بدامنی' عدم تحفظ' جان و مال کا ڈر تو کجا ہم لوگ تو مسجد میں بھی داخل ہوتے وقت اپنے جوتے تک ساتھ لے جاتے ہیں۔ محض اس خوف سے کہ کوئی اٹھا نہ لے۔ پانی کی ٹینکی کے ساتھ گلاس کو بذریعہ زنجیر باندھ کر رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی چرا نہ لے اور حزن' درد' رنج' غم' افسوس' کرب یا دکھ کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی انسان کو نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔
جبکہ قرآن نے مومنین کے معاشرے کے بارے میں کہا ہے کہ "ان پر نہ خوف ہوگا' نہ حزن" لیکن کن پر......؟

ان پر جو اعمال صالحہ کریں گے۔ جو مسجود ملائک آدم کی سرشت اپنائیں گے۔ اس آدم کی جس کی ذہانت پر اس کے خالق کو اعتماد اور فخر تھا اور خالق نے ملائکہ کی فوج سے کہہ دیا تھا۔

"جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"

کیونکہ ملائکہ انسان کی حیوانی فطرت سے اور اس کی شعوری ترقی سے خوفزدہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گارے اور کیچڑ اور بے ضرر و بے جان مٹی سے پیدا ہونے والے اس حیوانی فطرت کے مالک انسان میں شعور کے اضافے نے بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک ایسا شعلہ ڈال دیا ہے جو ہر چیز کو راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اسی شعلے سے خوفزدہ تھے۔

شجر ممنوعہ

گویا انسانی فطرت میں نیکی اور بدی کی پہچان ڈال دی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس شعور کی دولت ہے...... اللہ نے انسان کو شعور دیا۔ وہ ممنوعہ پھل جس نے اس کے کندھوں پر تسخیر کائنات کی ذمہ داری ڈال دی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جنسی جذبہ کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ انسان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اس پر لذت کام سے اجتناب کر سکے۔ اس معاملہ میں جانور انسان سے بدرجہا بہتر ہیں۔ درندے' پرندے' چرندے جو کوئی بھی ہیں۔ جنس کے معاملہ میں قدرت کے ایک لگے بندھے قانون کے پابند ہیں۔ ان کے جوڑوں میں ایک خودکار عمل کارفرما رہتا ہے۔ جب انہیں افزائش نسل کی ضرورت ہوتی ہے تو مادہ کے جسم سے ایک خاص بو خارج ہوتی ہے جس بو کو سونگھنے سے نر ہوشیار ہو جاتا ہے اور مادہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دونوں ملاپ کرتے ہیں۔ تاوقتیکہ مادہ کو حمل ٹھہر جاتا ہے......اور جب مادہ کو حمل ٹھہر جاتا ہے تو کوئی نر مادہ کے قریب نہیں پھٹکتا۔ ایک ہی جگہ پر گھاس چرتے رہتے ہیں لیکن کسی نر کے اندر یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ساتھ چرتی ہوئی جوان مادہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ مخلوقات جنس کے معاملہ میں انسان سے اس لیے بہتر ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ

خلق فسویٰ٥ والذی قدر فھدیٰ٥

"انہیں برابر برابر پیدا کیا اور ان کے لیے ہدایت مقرر کر دی۔"

ایک لحاظ سے خوش نصیب ہوئے جانور اور پرندے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا ہوتے ہی ہدایت دے دی۔ انہیں خوش نصیبوں کو دیکھ کر ہی تو "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ" نے فرمایا تھا

"اے کاش!...... میں صرف ایک چڑیا ہوتا"

جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں۔ آپ دیکھئے...... بطخ کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے اور مرغی کے بچے کو پروں کے نیچے چھپنا...... لیکن انسانی بچہ نہ آگ کی پہچان رکھتا ہے نہ بچھو کی۔ کیونکہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے یک طرفہ طور پر ہدایت مقرر نہیں فرمائی۔ اسے "نیک اور بد" کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے کی سزا ملی ہے۔ نیک و بدی کی پہچان کا درخت جسے بائبل اور قرآن دونوں نے آدم کے تمثیلی واقعہ میں بیان کیا ہے...... یہ پھل کیا تھا......؟ یہ پھل شعور تھا...... شعور...... کارل مارکس نے کہا تھا۔

"شعور انسان کے خلاف مادے کی منظم سازش ہے"

اور وہی ہوا۔ انسان جب پرندے کی طرح جیتا تھا تو ایک گھونسلے پر اکتفا کرتا تھا اور اب اس

کی ہوس مخلوقات میں ضرب المثل بن گئی ہے۔ جب حیوانات کے درجے میں تھا تو ''توکل'' کا قائل تھا۔ لیکن اب آنے والے کل کے لیے ذخیرہ کرنا اس کی عادت ہوگئی ہے۔ جب الٰہی ہدایت کے تابع تھا تو صرف افزائش نسل کی غرض سے مادہ کو چاہتا تھا اور اب...... نئے نئے ذائقے چکھنا اس کی فطرت ہوگئی ہے۔ ہاں!...... یہ ہے وہ شعور جس نے انسان کو اشرف المخلوقات سے گرا کر ارزل المخلوقات بنا دیا۔ قرآن میں ہے کہ

''کالانعام بل ھم اضل سبیلا''

''جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ''

اور ہاں!...... یہی ہے وہ فردوسی پھل جسے کھا کر انسان نے اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لی اور اب...... انسان کی فطرت ہزاروں سال کے گناہوں کے بوجھ تلے دب کر تار تار ہو چکی ہے۔ اب وہ لوٹنا چاہتا ہے۔ اس فردوس بریں میں...... لیکن اب لوٹنا اسے اپنے بس سے باہر معلوم ہوتا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ ''شعور'' کے اضافے سے قبل انسانی نیچر جنسی حوالہ سے ایسی نہیں تھی۔ انسان عام جانوروں کی طرح نسلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک خاص نظام الاوقات کے تحت نر اور مادہ کا ملاپ کرتا تھا۔ لیکن شعور مل جانے کے بعد انسان کو جنسی اعضاء کی پہچان ہوگئی اور اس پر واضح ہوگیا کہ اس عمل میں وقتی لذت' حظ اور لطف ہے۔ لیکن یہ ابتدا کا زمانہ تھا۔ یعنی انسانی شعور کی ابتدا کا...... لہٰذا انسان نے خصوصاً جنسی حوالہ سے وہ وہ غلطیاں کیں جن کی تلافی اب تک نہیں ہو پا رہی اور یوں دھیرے دھیرے انسان نے محض بھولپن میں اس غیر فطری ملاپ کو اپنے جینز کا حصہ بنا لیا۔ گویا اپنی فطرت ثانیہ بنا لیا۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ انسان اپنی اس غلطی کی سزا سے کبھی بھی نہ نکل سکے۔ قرآن نے ایک مکمل پروگرام دیا ہے اور آفاق میں سے مثالیں دے کر یقین دلایا ہے کہ اس پروگرام پر عمل کر کے انسان اپنی فطری خامیوں اور ضرورتوں کے باوجود ایک خوبصورت معاشرہ تخلیق کر سکتا ہے۔ یعنی اب ہونا یہ چاہئے کہ اللہ کے بندے اپنے مالک کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ تا کہ یہ کرۂ زمین ایک مثالی جنت بن سکے جہاں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن لیکن پھر بقول اقبالؒ

''جنسی ضبط نفس ہی خودی کی تربیت کا اولیں مرحلہ ہے''

لہٰذا خودی کی تربیت یا کامل انسان بننے کی صلاحیت انسان میں پیدا ہو سکتی ہے تو صرف اسی صورت میں کہ اپنے جنسی رجحانات پر نظر ثانی کرے اور باقاعدہ اپنی شعوری کوشش کے ذریعے سے اپنی ہوس کو ''صرف ضرورت'' میں بدل دے۔ تا کہ ایک دو نسلوں میں ہی اس کے جینز میں تبدیلی آ جائے اور اس کی جنسی رغبت ہوس سے کم ہو کر محض افزائش نسل تک آ ٹھہرے اور ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ کیونکہ انسان نے ''ایسا'' کچھ کیا ہی شعوری کوشش کے ذریعہ سے ہے۔ یہ جنسی کوشش اور رغبت جواب انسان میں موجود ہے' فطرت نہیں۔ لہٰذا جنسی ضبط نفس کوئی غیر فطری عمل نہیں۔

باب ۷

موجودہ اقوام کی شعوری حالت

بظاہر دنیا کے ترقی یافتہ لوگ جو مشرق سے شفق پار براعظم یورپ اور امریکہ میں بستے ہیں' اس وقت آدمیت کے حوالے سے کس مقام پر کھڑے ہیں- جن کے جام سے دو گھونٹ پینے کا شوق اقوام عالم کو دیوانہ کیے ہوئے ہے- جن کی تہذیب کرۂ ارض کے چپے چپے کو اپنی گرفت میں لینے والی ہے- جن کا مادی عروج کمال سات آسمانوں سے بلند ہو کر دوسری کائناتوں کی دہلیزیں چھو رہا ہے- جن کی طاقت سے انسانیت مرعوب اور خوفزدہ ہے- قوت اور حشمت کے مالک وہ اہل یورپ اس وقت تک آدمیت کے حوالے سے دنیا کے سامنے اپنے کردار کا کیا مظاہرہ کر چکے ہیں-

کیا زمین پر حشرات الارض کی طرح رینگتے ہوئے اور کتوں کی طرح ایک ایک لقمے کو ترستے ہوئے پسماندہ ملکوں کے لوگوں کا حال اور مستقبل برباد کرنے کا ذمہ دار یورپ نہیں ہے؟ کیا کرۂ ارض پر جگہ جگہ اپنی ہی نوع کے افراد کا قتل کرنے والے قاتلوں کے ہاتھ میں ہتھیار یورپ نے نہیں تھمائے؟ کیا بدامنی' انتشار' عدم تحفظ' بھوک' بے چینی اور اضطراب کی فصل یورپ نے نہیں بوئی؟

کون ہے جو ان حقائق سے انکار کر سکتا ہے- اہل یورپ کا یہ طرز عمل ان کی کم ظرفی کی علامت ہے- وہ ''جدید افکار'' کے دعویدار ہیں- انہیں تو چاہیے تھا کہ وہ آدمیت کا مقام بلند کرتے' اپنے طرز عمل اور رویے سے ثابت کرتے کہ وہ اس دور کے بہترین لوگ ہیں- انہوں نے نیک نامی کی بجائے بدنامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالا- لیکن کیا ایسا انہوں نے دانستہ کیا؟ یا یہ بری شہرت نادانستگی میں اپنے سر ڈال بیٹھے- جواب یہ ہے کہ ان کے پاس نظام نہیں تھا- انہوں نے اپنے تئیں کوشش بہت کی- ارسطو' افلاطون' ہیگل' مارکس وغیرہ کون تھے- نیٹشے (۹۷) کا دردمند دل کس فکر میں کڑھتا تھا- یہ مغرب کے مایہ ناز مفکرین تھے- انہوں نے انسانیت کی بھلائی کے لیے ہی سوچا- لیکن افسوس! کہ ان کی نگاہیں مادے کی دیوار سے پار دیکھنے سے معذور تھیں- انہوں نے قرآن حکیم جیسی انقلابی کتاب کو مذہبی صحیفہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور عمر بھر حقیقت کی تلاش میں ناکام رہے- جس

کا نتیجہ ہے کہ آج اہل یورپ کے دل پتھروں سے زیادہ سخت (او اشد قسوہ) ہو چکے ہیں- اب ان کے ہاں محبت' مروت اخوت اور صلہ رحمی مفقود ہو چکی ہے- نت نئے ناموں سے دکھاوے کی بیہودی انجمنیں حقوق انسانیت' حقوق حیوانات' تحفظ ماحول وغیرہ کے ذریعے اپنی سنگ دلی اور سرد مہری کو چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں- لیکن اپنی ان خالی خولی آئیڈیالوجیوں کا آج تک کوئی مثبت نتیجہ اہل یورپ نے نہیں دیکھا- ان کا معاشرہ اور تہذیب جسے وہ طرح طرح کے بے وزن اور سستے دلائل سے دنیا کی عظیم تہذیب ثابت کرنا چاہتے ہیں- حقیقت میں ان کی اپنی نظر میں باعث شرم وندامت ہے- ان کے ہاں پائے جانے والی یہ بے ذائقہ اور بے کیف زندگی لذت و سرور کے حصول کے لیے شراب و شباب کا سہارا لیتی ہے- لیکن اس طرح وہ جس قباحت کی وجہ سے اس گہرے دلدل میں گرے ہیں- پھر وہی قباحت ان پر مسلط ہو جاتی ہے اور یوں ابلیسیت کا دائرہ ان کے گرد مزید تنگ ہو جاتا ہے اور وہ پھر اسی شیطانی گرداب کا شکار ہو جاتے ہیں- یورپ کو اگر اہل دنیا پر حکمرانی کرنی ہے اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی نظر میں ان کا وقار بلند ہو تو انہیں چاہیے کہ وہ انسانیت کے اصل مقام اور مرتبے کو پہچانیں- سادہ سی بات ہے کہ روئے زمین پر پیدا ہونے والے ہر جاندار کو ''اپنی زندگی'' جینے کا حق ہے- اپنی زندگی سے مراد یہ ہے کہ اسے اپنی طبعی عمر گزارنے اور فطری موت مرنے کی آزادی ہونی چاہیے- فطری موت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے میں نے یہ احتیاط کی ہے کہ درندوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے وہ سبزی خور جانور جو گوشت خوروں کی خوراک بن جاتے ہیں...... بھی اس ضمن میں شامل ہو جائیں- کیونکہ چوہے کا بلی کے ہاتھوں مرنا چوہے کی زندگی کا معراج ہے- یہی اس کی شہادت اور یہی اس کا شرف ہے...... لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم انسانی فطرت کے اس خودکار نظام میں منفی دخل اندازی کریں...... یعنی فطرت سے ناجائز سبق لیں اور یہ فرض کر لیں کہ چونکہ بلی چوہے کو کھا جاتی ہے اور بڑی مچھلی چھوٹی کو تو لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدرت کا عالمگیر نظام ہی تخریبی رجحانات کی تبلیغ کرتا ہے- جیسا کہ یورپ کی مشہور زمانہ ''تحریک دہریت'' یعنی ہپی ازم نے کیا اور جس کے اثرات آج یورپ کی اجتماعی سوچ پر حاوی ہو چکے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is Right) کے کلیے پر عمل پیرا ہیں- یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ مذہب کی اخلاقیات

سے بیزار اور مادہ پرستی کے راستے پر گامزن ہیں- اہل یورپ کو چاہیے کہ اگر وہ سچے دل سے دنیا میں ممتاز اور معزز ہونا چاہتے ہیں تو زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کی فطری اور جبلی ضروریات کا احترام کریں اور اپنے عمل سے ثابت کریں کہ وہی خلافت اللہ فی الارض کے اہل ہیں- جیسا کہ اسلام نے خلفائے راشدین کے دور میں ثابت کیا- حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب مشہور روایت ہے...... جب آپؓ نے فرمایا کہ دریائے دجلہ کے کنارے اگر ایک کتا بھی مر گیا تو اس کی پرسش بروز حشر مجھ سے ہوگی-" لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ اہل یورپ اپنے طرز عمل سے پوری دنیا کو ناراض کیے ہوئے ہیں- یہ دراصل نتیجہ ہے "یہود" کی اس سوچ کا جو انہیں ورثے میں ملی اور جس کے مطابق انہیں ساری دنیا پر حکمرانی کرنی ہے- سوچنے کا مقام یہ ہے کہ یہود کی یہ دقیانوسی سوچ جدید زمانے کے ساتھ کیوں نہ بدل سکی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہود اپنے قدیم مذہبی احکامات پر جو بعد میں مبینہ تحریف کیے گئے- پوری سنجیدگی کے ساتھ عمل پیرا ہیں- ان کے مذہب میں غیر مذہب کے فرد کے ساتھ شادی منع ہے- وہ اپنی نسل کے خالص ہونے کا احساس تفاخر سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں- ہاں کبھی کبھی کسی بڑے مقصد کے لیے اہل یہود کی نوجوان لڑکیاں دوسرے مذاہب کے افراد کے عقد میں آتی رہتی ہیں- ایک بات ان کے مذہب میں یہ ہے کہ کوئی غیر یہودی اپنے ارادے اور مرضی سے یہودی ہونا چاہے تو وہ اسے اپنے مذہب میں بطور یہودی داخل نہیں کرتے- ہاں البتہ اسے کچھ شرائط کے ساتھ دوسرے درجے کے یہودی کی حیثیت سے قبول مذہب کی اجازت دی جاتی ہے- اہل یہود کی یہی خاصیت کہ وہ خالص النسل ہیں' انہیں ساری دنیا سے متعصب کیے ہوئے ہے- اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ کے بڑے ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ وغیرہ میں معاشیات پر یہودیوں کا غلبہ ہے- اسی وجہ سے انہیں اعلیٰ حکومتی اداروں اور سیاست میں بھی اچھا خاصا دخل ہے- یورپ میں یہودیوں کی یہ بالادستی ان تحریکوں' نظریات یا اشخاص کو کامیاب نہیں ہونے دیتی جو انسانیت کی برابری کی بات کرتے ہیں- تاریخ شاہد ہے کہ یورپ نے اشتراکیت پسندوں کے ساتھ کیا کیا- دنیا جانتی ہے کہ اہل یورپ نے یہودی افکار کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام اپنا رکھا ہے- کیونکہ یہودی ایک تاجر' سوداگر اور ایک سود خور کاروباری کی حیثیت سے سارے عالم میں مشہور ہے- یورپ کا سودی معاشی نظام یہودیوں ہی کے قبضے میں ہے- جو کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ انسانی مساوات کا کوئی علمبردار کھلی فضا میں سانس لے سکے-

اس مقصد کے حصول کے لیے متعصب یہودیوں کا اقوام عالم کو نشہء غلامی میں غرق کرنا ضروری ہے-

"تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی"

ایسا نشہء جس میں آزاد کلچر کا زہر ہلاہل بھی شامل کر دیا گیا- اس وقت یہودیوں کی ترتیب دی ہوئی ثقافت کا نصاب دنیا بھر کی ہر قوم اور ہر تمدن پر یلغار کیے ہوئے ہے-- جس کا سب سے بڑا ہتھیار انسان کے جذبہء شہوت کا استیصال ہے- یورپ نے اب تک اپنے مجموعی رویے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک جنسی ہوس کی ماری ہوئی قوم ہے-- جس تہذیب کا سب سے بڑا امین یعنی پریذیڈنٹ آف امریکہ اپنے دور کے بدنام ترین جنسی سکینڈل (۹۸) کا شکار ہوتا ہے- اس تہذیب کے عامۃ الناس کا ذکر محض وقت کا زیاں ہوگا- یورپ میں جنسی حوالے سے ہونے والے واقعات قتل کی تعداد سب سے زیادہ ہے-

اگر اہل یورپ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ نیچر کی بالادستی کے قائل ہیں اور ریشنالسٹ (Rationalist) ہیں تو انہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ ان کے جنسی افعال سب کے سب اس حد تک غیر فطری ہیں کہ ان کی مثال حیوانات میں بھی نہیں- ہوموسیکس یعنی ہم جنس پرستی' کم عمری میں اختلاط گینگ ریپ' شراب نوشی کی حالت میں' کال گرلز کے ساتھ فحاشی کے مظاہرے' جانوروں کے ساتھ جنسی عمل کے واقعات کا بیان ایک الگ کتاب کا متقاضی ہے-

ایک سروے کے مطابق امریکہ کی ۱۳ فیصد عورتیں اور ۳۷ فیصد مرد انزال کی حد تک ہم جنس پرستانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں-- ۳ فیصد عورتیں اور ۸ فیصد مرد جانوروں کے ساتھ جنسی اختلاط کرتے ہیں- ۵۸ فیصد عورتیں اور ۹۲ فیصد مرد مشت زنی کے ذریعے "خلاص" ہوتے ہیں- (۹۹)

امریکی ریاست "کیلی فورنیا" کے شمالی شہر "سان فرانسسکو" کے بلدیاتی قانون ساز ادارے نے اپنی نوعیت کا پہلا قانون منظور کیا ہے...... کہ ہم جنس پرست جوڑوں کے لیے بھی...... جو شادی کے بغیر ساتھ رہتے ہیں سرکاری دفتر میں "جیون ساتھی" کی حیثیت سے اپنی رجسٹریشن کرانے کی اجازت ہے- امریکہ کے عام لوگ ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے لوگ...... مثلاً جج' ڈاکٹرز' کھلاڑی' سیاست دان' پادری...... الغرض ہر شعبہ کے معروف افراد بھی اس شیطانی مرض کا شکار

ہیں-

امریکی دانشور چارلس مرے (Charles Murray) کے مطابق:

"امریکہ برائیوں کی دلدل میں دھنس چکا ہے- بڑھتے ہوئے جرائم' منشیات' غربت' ناخواندگی وغیرہ اس وقت امریکہ کے بڑے مسائل ہیں- لیکن ایک مسئلہ ایسا ہے جو ان سب سے زیادہ شدید اور نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ہے- اس لیے کہ اس برائی سے تمام برائیاں جنم لیتی ہیں اور یہ ہے ناجائز بچوں کا روز افزوں اضافہ- ۱۹۹۱ء میں بارہ لاکھ ناجائز بچے پیدا ہوئے-"

حالانکہ یہ وہ ملک ہے جہاں کی ہر خاتون اپنے حمل کو روکنے کے طریقوں سے بخوبی آگاہ ہے...... اگر ان میں وہ بچے شامل کر دیئے جائیں جو بچے روکنے والی ادویات کے ذریعے پیدا ہی نہیں ہونے دیئے گئے تو امریکی معاشرے میں فحاشی اور زنا کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے- لیکن یہاں ان کے بدافعال کا محض ایک کرشمہ یعنی خاندانی منصوبہ بندی ہی ان کی شرمناک جنسی وحشت کا منہ بولتا ثبوت ہے- صاف ظاہر ہے...... اولاد روکنے کے لیے مختلف اقسام کی ادویات کی ترغیب سے ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اہل یورپ اور ان کے چاہنے والے غیر فطری سطح پر محض جسمانی لذت کے لیے جنس مخالف کے ساتھ مباشرت گویا زنا کرنا چاہتے ہیں- اپنی بدنی خواہشات کی اس حد تک غلامی کی بدولت اہل یورپ کا پورا معاشرہ ذہنی طور پر منکر خدا' منکر اخلاقیات اور منکر انسانیت ہو چکا ہے- اب جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حقوق انسانیت تو کیا حقوق حیوانات کے بھی محافظ ہیں تو ان کی یہ بات ایک خالی خولی بڑھک اور کذب بیانی سے زیادہ کچھ نہیں لگتی- ان کی بے جان تنظیمیں جو دنیا بھر میں این جی اووز کے نام سے کام کر رہی ہیں محض لایعنی دکھاوا ہیں-

بلاشبہ یورپ نے مواصلات میں بے پناہ ترقی کر لی ہے- لیکن پھر اسی مواصلات کو انہوں نے دنیا بھر کا اخلاق تباہ کرنے پر استعمال کیا- ڈش یا انٹرنیٹ کے ذریعے یورپ کی جنسی بے راہ روی کے مظاہرے پوری دنیا کے انسان نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ نادان عوام اسی تکلیف دہ اور غیر متوازن تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں-

اس مضمون میں ہمارے سامنے یورپ کی شعوری حالت کا تذکرہ درپیش ہے- حقیقت یہ ہے کہ اہل یورپ کے پاس چند سو برس قبل نہ تو کوئی تہذیب تھی اور نہ سماج- وہ اس وقت کی ترقی یافتہ

م یعنی اٹلی' سپین اور ترکی کے مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ اور کمتر محسوس کرتے تھے- یہ وہ ر تھا جب سیاست' حکومت' سائنس اور ثقافت کے لحاظ سے مسلمان دنیا کے جدید ترین افکار کے ک لوگ تھے...... پھر یوں ہوا کہ اہل یورپ نے عیاش اندلسی مسلمانوں سے یورپ کا ایک بڑا ہ یعنی ہسپانیہ لے لیا...... تو یورپ کی آنکھیں کھل گئیں- مسلمانوں کی عزت اور بالادستی اپنے ام کی بدولت تھی- انہوں نے نظام کو چھوڑا تو خود بھی مٹ گئے- لیکن یورپ کے پاس تو نظام تھا نہیں جسے وہ اپناتے یا چھوڑتے- ان کے پاس مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی تہذیب کے بچے کھچے ثار اور کچھ علوم و حقائق کے سوا کچھ نہیں تھا- اپنی ازلی بدفطرتی اور جہالت کے زیر اثر رہتے ہوئے ہوں نے جب قوت اور دولت حاصل کر لی تو بے لگام ہو گئے- تاریخ کی مستند اور مشہور روایت ہے کہ......

> کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور اپنے وطن جو اس وقت کا ترقی یافتہ ملک تھا- یعنی "اندلس" جا کر امریکہ کی دریافت کی خوشخبری سنائی- یہ وہ وقت تھا جب اندلس کا مشہور عیسائی فاتح فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ ازابیلہ غرناطہ کے تخت پر مسلمانوں کی شکست کے بعد متمکن تھے اور ہزاروں مسلمان ان کی سفاک تحریک (Enquesition) اصطباغ کی نذر ہو کر پابہ جولاں امریکہ لائے گئے- جنہوں نے اپنی باقی زندگی غلامی میں گزاری- اس کے بعد یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ امریکہ کے اولیں باشندے وہ جرائم پیشہ عناصر تھے جنہوں نے اپنے کیریئر کے تحفظ کے لیے اس عظیم جزیرے کو مستقل اڈا بنایا اور سب سے زیادہ یہ بات اور روایت مشہور زمانہ ہے کہ دنیا بھر کے یہودی تاجر اس نئے ملک کو اپنے مذہب کے لیے محفوظ ترین مقام سمجھ کر یہاں ہجرت کر آئے-

چونکہ یہ روایات درست ہیں- لہٰذا امریکہ کی موجودہ تہذیبی حالت کی تاریخ اور اسباب پر غور کرنے کے لیے کسی گہری بصیرت کی ضرورت نہیں- امریکہ کے بعد بہترین تہذیب کا دعویدار برطانیہ ہے- لیکن کون نہیں جانتا کہ برطانیہ کی موجودہ صحت مند ہستی ہندوستان کی سونے کی مرغی نڑ کھانے کا نتیجہ ہے اور یہ بھی نہیں...... کہ برطانیہ یہاں سے جانے کے بعد اہل ہند کا پیچھا چھوڑ

چکا ہے- برطانیہ ہو یا امریکہ یا دوسرے یورپی ممالک جن کی سرپرستی اہل یہود کے ہاتھوں میں ہے، کبھی بھی انسانی مساوات کے سچے علمبردار نہیں ہو سکتے- لیکن ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ یورپ کے مفکرین بالخصوص علماء سائنس اور نفسیات نے انسانیت پر احسانات کیے-

مغربی ثقافت کے دنیا پر اثرات

اب تک ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مذہب کی اخلاقیات ہوں، مفکرین کی فلسفیانہ نقطہ طرازیاں ہوں یا تہذیب و تمدن کی چیرہ دستیاں- ہر وہ طرز زندگی جسے انسانی شعور نے جنم دیا ہے اول و آخر سیکس ہی کا طواف کرتا ہیں- گویا سیکس ایک ایسی ناقابل تسخیر قوت ہے جس کے ہاتھ بہت لمبے اور دائرۂ عمل بہت وسیع ہے- تمدن جس کا سب سے بڑا روپ ثقافت ہوتی ہے- شہوانیت کے زیر سایہ تربیت پاتا ہے تو معاشرہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے- اس کی عملی تصویر ہم پچھلے ابواب میں انسانی تاریخ اور فکر کے حوالے سے پیش کر آئے ہیں- اب دیکھنا یہ ہے کہ ثقافت (Culture) کس طرح جذبۂ جنس کے بطن سے نکل کر معاشرے میں نمو پاتی اور افراد کے مزاج استوار کرتی ہے- موجودہ زمانے میں ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پا کر ایک عفریت کی صورت نمودار ہوئی ہے- سائنس سے اپنی سہولت کے لیے جتنی مدد ثقافت نے لی ہے اتنی کسی اور نے نہیں- پرانے زمانے میں کسی بڑے شہر میں ایک آدھ تماشہ گھر ہوتا تھا- جہاں شہر کے چیدہ چیدہ لوگ بازیگروں، گیت کاروں یا داستان گوؤں کے فن پارے ملاحظہ کرتے- اس طرح پارچہ جات، ہنر پاروں اور میناکاری کے شاہکار بھی آج کل کی طرح نمائشوں میں سجانے کا رواج نہ تھا- رسوم اگرچہ زیادہ فرسودہ ہوتیں تاہم ان میں اخلاقی روایات کا بھرپور خیال رکھا جاتا- اس کے برعکس آج میڈیا کی بدولت اخلاقیات سے زیادہ جنسی تسکین حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور یہ میڈیا ہی ہے جس کے ذریعے یورپ کی غیر انسانی ثقافت دوسری اقوام کی اپنی انفرادی ثقافتوں کو ہڑپ کرتی جا رہی ہے- شروع سے زمانے کا یہ دستور چلا آیا ہے کہ طاقتور اقوام کی ہر حرکت اور ہر ادا کو ترقی یافتہ سمجھ لیا جاتا- یہ دراصل مرعوبیت کے سوا کچھ بھی نہیں- لوگوں میں ایسے سمجھدار افراد کی کمی نہیں ہوتی

جو طاقت کی بجائے علم و عقل کو قابل تقلید سمجھتے ہیں- لیکن اکثریت طاقت ہی سے مرعوب ہو جاتی ہے- اگرچہ علم و عقل بھی ایک قسم کی طاقت ہی ہیں- لیکن شروع سے کسی قوم کی جنگی قوت ہی ان کی حکمرانی کا باعث رہی ہے- جیسے اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بے پناہ جنگی قوت اقوام عالم پر دہشت اور دھاک بٹھائے ہوئے ہے اور اسی طاقت سے مرعوب ہو کر ایک زمانہ ہے کہ امریکہ کی تہذیب اور ثقافت کو اپنا امام سمجھتا ہے- حالانکہ امریکہ ابھی دنیا کے نقشے پر محض پانچ سو سال کا ایک نومولود بچہ ہے- اس کے برعکس وہ قومیں جو ہزارہا سال سے تجربوں پہ تجربے کرتی چلی آ رہی ہیں اور جو زیادہ بہتر طور پر جانتی ہیں کہ ان کے لیے کون سا تمدن باعث عزت اور سلامتی ہے...... اپنے معاشرے کو بھی جدید ثقافت کے منہ زور سیلاب سے نہیں بچا سکیں- آج دنیا کی ہر قوم سورج کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مغرب میں ڈوب جانا چاہتی ہے- لیکن افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ مغرب (یورپ) جس کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ دنیا کی زیادہ تر اقوام کر چکی ہیں- ایک انتہائی غیر انسانی حتیٰ کہ غیر حیوانی بلکہ یوں کہیے کہ غیر فطری ثقافت کا علمبردار ہے- دنیا میں قوموں کا عروج و زوال تو ہوتا ہی رہتا ہے- لیکن تاریخی حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ وہی قومیں فردوس ارض کی لذتوں سے زیادہ سرشار ہوتی ہیں اور زیادہ عرصہ تک اقوام کی زمام رہبری تھامے رکھتی ہیں جن کے اخلاقیات میں جنسی اعمال کے لیے متوازن اقدار مقرر کی گئی ہوں- کرۂ ارض کی دس ہزار سالہ انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ متوازن معاشرہ مسلمانوں کا رہا ہے اور جب تک ایسا رہا ہے مسلمان تہذیب و تمدن، علم و ادب، سائنس اور اخلاقیات میں سارے عالم کے استاد رہے- امریکہ کو دنیا والوں کا آقا بنے ہوئے ابھی صرف پچاس سال ہوئے اور اس کے اس پچاس سالہ دور حکمرانی کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی بھی صاحب بصیرت شخص آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ قوم زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی- کیونکہ تاریخی حقائق نے یہ ثابت کیا ہے کہ اخلاقی پستی کا وہ مقام جہاں امریکہ کھڑا ہے قوموں کو اٹھا کر چاہ بابل کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے- آج امریکہ، یورپ اور ان کے حاشیہ نشین ممالک کا یہ عالم ہے کہ انسانیت ایک مردار کے گوشت کی طرح متعفن ہو چکی ہے- یورپ کی باعث شرم و عار جدید، تہذیب پوری انسانیت کی بے چینی کا باعث بن چکی ہے- چاہیے تو یہ تھا کہ مادی ترقی کے بام عروج پہ پہنچا ہوا

یورپ انسانیت کو انصاف اور امن کا راستہ دکھاتا اعلیٰ اخلاقی روایات کا مظاہرہ کرتا اور دیر تک کرۂ ارض پر حکمرانی کا لطف اٹھاتا۔

اہل یورپ کی ثقافت...... جوان کی وحشیانہ جنسی بے راہ روی کے بطن سے نمودار ہوئی ہے۔ انسانی تاریخ کی بدترین تہذیب اور ثقافت ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک میں حیوانوں سے بدتر شہوانی خصلتیں اس نوبت تک پہنچ چکی ہیں کہ شہوت زدہ جوڑے ایک دوسرے کے اعضا کو چاٹتے...... حتیٰ کہ ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب تک کر دیتے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ ان کے جنسی اختلاط کے مظاہرے کھلے پارکوں کی حد تک عام ہو چکے ہیں۔

مشہور زمانہ ''میڈونا''...... کی جنس پر لکھی ہوئی کتاب میں ایک تصویر شائع کی گئی ہے جس میں دو ہم جنس پرست ایک دوسرے کے کھلے ہوئے منہ میں پیشاب کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ادھر اہل مذہب کا یہ عالم ہے کہ بقول فادر اینڈریو ایم...... گریلے...... گزشتہ بیس برسوں میں کم از کم پچیس ہزار پادریوں نے ایک لاکھ معصوم بچوں کو جنسی وحشت کا نشانہ بنایا۔

آج دو ملین امریکی ایڈز کا شکار ہیں۔ امریکیوں کی یہ منحوس بیماری دیگر ممالک تک پھیل چکی ہے اور اس وقت پوری دنیا میں ایڈز کے مریض پائے جاتے ہیں۔ جبکہ خود امریکی ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اہل یورپ خصوصاً امریکیوں کی انتہا درجہ کی بڑھی ہوئی جنسی ہوس ہی اس خطرناک بیماری کی پیدائش کا سبب بنی ہے۔ جنسی امراض کے شکار لوگ غیر فطری راہوں پہ چلتے ہوئے اس مقام پر آ جاتے ہیں جہاں پاکیزگی، نفاست اور تہذیب سربگریباں ہو جاتی ہے...... جنسی جوڑے ایک دوسرے کے اعضاء، خصوصاً اندام نہانی اور مقعد کو چاٹتے ہیں...... مقعد کے داخلی حصے، مرد کے عضو تناسل کے سوراخ، منہ اور حلق کے اندر اسفنج جیسی تہیں ہوتی ہیں انہیں میوکس ممبرین کہا جاتا ہے۔ ان کے نیچے لہو کی شریانیں ہوتی ہیں جب جنسی جوڑے بے راہ روی کا ارتکاب کرتے ہیں تو ان مقامات کی ساخت کی بدولت ان کے خون میں ایڈز کا وائرس داخل ہو جاتا ہے...... ایڈز کے علاوہ اور بہت سی بیماریاں ہیں جو امریکیوں کی جنسی وحشت کی بدولت انسانیت کی روح کو چاٹتی جا رہی ہیں۔

اہل یورپ اجتماعی طور پر جنسی غلاظت کے اندھے کنوئیں میں گر چکے ہیں...... ناپاک حرکات نے ان کی تمام تر ثقافت کو بھی ناپاک کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کا میڈیا، خصوصاً ٹی وی، فلم اور میوزک

وغیرہ...... بھی سرتاسر اس غلاظت سے آلودہ ہو چکے ہیں۔

اس وقت دنیا بھر کی ثقافت یورپی میڈیا سے متاثر ہو کر چوں چوں کا مربہ بن چکی ہے۔ اہل مشرق کی موسیقی جو اپنے دس ہزار سالہ تجربے کی بدولت اس وقت ساز و آواز کے حوالے سے انتہائی ترقی یافتہ اور مکمل ہے اور جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں نہیں ملتی۔ یورپ کی اندھی تقلید کرنے والے احمقوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ موسیقی جو توازن کا انتہائی نازک کھیل ہے۔ بے ہنگم اور بے ربط ہاؤ ہو تک محدود ہو چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ماضی بعید کا غاروں میں رہنے والا وحشی انسان خوشی کے موقع پر اچھل کود کرتا تھا۔ لگتا ہے یورپ کی نومولود تہذیب موسیقی کے حوالے سے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے اور ابھی اس وحشی انسان کو بے ہنگم اچھل کود اور ہاؤ ہو سے نکل کر راگ رنگ کے تمام ارتقائی مراحل طے کرنا ہیں۔ اس کے برعکس مشرق کی موسیقی خصوصاً برصغیر کی موسیقی وہ تمام مراحل طے کر چکی ہے جن کی اکملیت اور توازن کا اہل یورپ نے ابھی تک خواب بھی نہیں دیکھا۔ راگ، سر، ساز، آواز جو اہل ہند کے مذہب کا حصہ تھے...... اور جنہیں مسلمان صوفیاء نے ایک نئی روح عطا کی...... برصغیر میں بتدریج اپنے ارتقاء کے کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں جہاں اب ہیں۔ جب کہ اہل یورپ نے ابھی اس فن کا آغاز کیا ہے۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری قوم اس وقت یورپ کی بے ہنگم موسیقی کی نہ صرف دلدادہ ہے بلکہ اس اچھل کود اور شور شرابے میں ان سے بھی آگے نکل جانا چاہتی ہے۔ موسیقی کے بعد ثقافت میں سب سے نمایاں چیز لباس ہے اور یہ ثقافت کا وہ مرغوب شعبہ ہے...... اہل جہاں جس کی آخری رسوم ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اہل یورپ کا لباس جس میں عورتوں اور مردوں کے جنسی اعضاء خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وقت اہل مشرق کا پسندیدہ پیراہن بن چکے ہیں۔ ہمارے ہاں کا شلوار قمیص میں ملبوس نوجوان نہ جانے کیوں انگلش سوٹ میں پھنسے ہوئے نوجوان سے شرم اور کمتری محسوس کرتا ہے اور یہی عالم دوسری اقوام کا بھی ہے۔ اس سے آگے چلیے تو تقریبات شادی بیاہ کی رسوم، علاقائی تہوار اور دیگر ثقافتی سرگرمیاں بھی اہل مغرب کی شرمناک ثقافتی یلغار کا شکار ہو چکی ہیں۔ پتنگ بازی اور ہیپی نیو ائیر (Happy New Year) کے بہانے سے ہمارے ہاں بے حیائی کے تہواروں کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس کا انجام

اہل بابل کے انجام سے مختلف نہ ہوگا-

یورپ کی تہذیب یا یورپ کی تہذیبیں جس بری طرح جنسی بے راہ روی کا شکار ہو چکی ہیں ان کی مثال ماضی میں بھی نہیں ملتی- آج انگلینڈ' امریکہ' اٹلی' فرانس' جرمن' آسٹریلیا وغیرہ ایسے ممالک ہیں جہاں ہر طرح کے جنسی ملاپ کی آزادانہ اجازت ہے- لندن کے قانون میں ہے کہ کوئی نوجوان جوڑا سرعام بوس و کنار اور خشک مباشرت تو کر سکتا ہے لیکن جب وہ ایسا کر رہے ہوں تو لڑکی کو دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں' مبادا خشک مباشرت سے آگے بڑھ کر ''تر مباشرت'' کی نوبت آ جائے- آسٹریلیا میں بعض مقامات پر عوام کے لیے کھلم کھلا مباشرت گاہیں بنا دی گئی ہیں- امریکہ کا تو یہ عالم ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو ہم جنس پرستی تک کی عام اجازت ہے- انتہائی بے ہودہ طریقے سے کیے گئے جنسی ملاپ کی امریکی فلمیں ہمارے ہاں بھی عام دستیاب ہیں- اخبارات اور رسائل اس پر مستزاد ہیں- ایک تحقیق کے مطابق امریکہ کے کسی سکول میں کسی کلاس کے بچوں سے ان کے والدین کے نام پوچھے گئے اور یہ دیکھ کر ماہرین تعلیم کو حیرت ہوئی کہ ستر فیصد سے زائد بچے اپنے باپ کا نام نہیں جانتے تھے- اٹلی کے ننگے ساحل اپنی جنسیت کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہیں- گلوبلائزیشن (Globlization) کا نام نہاد نعرہ لگا کر بہت سے ممالک نے ٹی وی کے ایسے چینل کھول رکھے ہیں جن پر دکھائی جانے والی فلمیں شہوانیت کے حوالے سے لشکر شیاطین کو بھی مات دیتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کا بھی ایک بہت بڑا پڑھا لکھا طبقہ ''نیچرل ہسٹری'' کے نام سے یورپ کی اس تحریک کا حمایتی ہے-

نیچرل ہسٹری

وہ نیچرل ہسٹری جسے عقل و شعور کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو انتہائی غیر نیچرل ہسٹری ہے- ہمارے جدید طبقے میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہی ہے- نیچرل ہسٹری پر ٹی وی اور ڈش کے نیٹ ورک کے ساتھ ساتھ بے شمار رسائل اور جرائد بھی دستیاب ہیں جن میں نیچرل ہسٹری سے متعلق ایک آدھ جملہ تحریر ہوتا ہے اور باقی صفحے پر زنا کرتے ہوئے جوڑے کی عریاں تصویر ہوتی ہے- انسانوں پر ہی کیا موقوف اہل مغرب جانوروں کے ساتھ جانوروں کی حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ

انوں کے جنسی ملاپ کی ایسی غلیظ اور شرمناک فلمیں نیچرل ہسٹری کے عنوان سے پیش کرتے جن کی مثال روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھی گئی اور نتیجہ ان اعمال کا یہ نکلا ہے کہ ایڈز (Adds) سی خوفناک بیماریاں اہل یورپ کے رگ و پے میں اتر گئی ہیں- یہ بات پوری تحقیق کے بعد منے آ چکی ہے کہ ایڈز کا جرثومہ پہلی بار عورت اور بندر کے جنسی ملاپ سے وجود میں آیا اور اب تو گزشتہ دس پندرہ سال سے انٹرنیٹ نے جو اودھم مچا رکھا ہے اس نے گزشتہ تمام ریکارڈز توڑ دیئے- حالانکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جدید دور کی ایک انتہائی فائدہ بخش ایجاد ہے- اس سے جہاں بے پناہ فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں وہاں جنسی بے راہ روی کی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعلیم بھی دی جا رہی ہے- انٹرنیٹ کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا اور مقبول ترین شعبہ ''چیٹنگ'' ہے اور جو غالب اکثریت کے لحاظ سے ایک خالص جنسی پروگرام ہے- چیٹنگ زیادہ تر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں مقبول ہے- جو ایک دوسرے کے ساتھ اپنا نام اور مقام بدل بدل کر فلرٹ کرتے اور جنسی طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں- ماہرین نفسیات کی یہ رائے ہم پہلے بھی پیش کر چکے ہیں کہ جنسی تسکین کے لیے دو جسموں کا ملاپ ضروری نہیں- محض جنس مخالف کا تصور کافی ہے اور انٹرنیٹ پہ بھی یہی ہوتا ہے- یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ چیٹ پروگرام میں فلرٹ کرنے والی لڑکی جس نے اپنی عمر اٹھارہ سال بتائی ہے' لڑکی ہی ہے- وہاں بھی تو صرف تصور ہوتا ہے- حالانکہ ہو سکتا ہے اٹھارہ سال کی وہ لڑکی حقیقت میں لڑکا ہو- لیکن چیٹنگ کرنے والا نوجوان محض اس کا تصور کر کے نفسیاتی طور پر اپنی جنسی ہوس کی تسکین کرتا ہے- انٹرنیٹ میں صرف یہی کچھ ہوتا تو اتنی زیادہ بری بات نہ تھی- اصل میں انٹرنیٹ تباہ کن اس لیے ہے کہ انٹرنیٹ پہ بھی نیچرل ہسٹری کے نام سے بے اندازہ ناجائز پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور پھر ان پروگراموں کو انٹرنیٹ میں اس حد تک داخل کر دیا گیا ہے کہ آپ کسی بھی قسم کا جاب (Job) سرانجام دے رہے ہوں فحش اور ننگی فلموں کا آپشن آپ کے سامنے وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے- آپ جب چاہیں ایک بٹن کلک کریں اور نیچرل ہسٹری کا مطالعہ فرمائیں- اہل مشرق تو کیا مغرب کے بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جو انٹرنیٹ کی اس قباحت سے نالاں اور بیزار ہیں- لیکن دوسری طرف انٹرنیٹ ہر ادارے حتیٰ کہ ہر گھر کی ضرورت بنتا جا رہا ہے- ایسی صورت میں کسی گھر یا ادارے کے افراد کے لیے اس کی غلاظتوں سے بچ جانا معجزے سے کم

نہیں اور یہ صورت حال دانشوروں کے لیے خاصی پریشان کن ہے۔ کیونکہ ساری دنیا کا جنسی ہوس زدہ ہو جانا بہرحال ایک تباہ کن صورت حال ہے۔ ایک طرف میڈیکل سائنس اور طب یونانی کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ جنسی بے راہ روی سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما رک جاتی ہے۔

نیچرل ہسٹری کا مطالعہ کرنے کے شوقین حضرات کو مغربی اصطلاح میں مباشرت بین (Voyeurist) کہا جاتا ہے۔ اس مطالعہ کے شوقین لوگ محض جنسی ہیجان سے شروع ہو کر انزال تک جاتے ہیں۔ ''مباشرت بین'' موقع ڈھونڈ کر دوسروں کو عریاں دیکھتا ہے۔ اس دوران اس کی اپنی جذباتی کیفیت میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور آخر کار وہ مشت زنی کے ذریعے انزال کی لذت تک جا پہنچتا ہے۔ مفکرین یورپ اپنی عادت کے مطابق اس موضوع پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مباشرت بینی بھی قدیم مرض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کنعانی لوگ برہنہ ہو کر اپنے جنسی اعضاء کی کھلم کھلا نمائش کیا کرتے تھے۔ بعض سفید فام امریکی مباشرت بینوں نے اس مرض کے ڈانڈے حضرت نوحؑ کے بیٹے ہام کے ساتھ جا ملائے ہیں...... کیونکہ بائبل میں ہے کہ

''ہام نے اپنے باپ نوح کو برہنہ دیکھ لیا تھا اور اپنے باپ کی برہنگی سے لطف اندوز ہوا تھا''

علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ جو والدین اپنے شیر خوار بچوں کے سامنے لباس تبدیل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لاپرواہ لوگ اپنے بچوں کے سامنے ''باقاعدہ'' جنسی عمل بھی کرنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ننھے بچے ان کی برہنگی کو نہیں دیکھ رہے۔ جبکہ عہد طفولیت میں بچے پر پڑنے والے ہر تاثر کی بڑی اہمیت ہے۔

علمائے نفسیات نے عضویاتی طور پر غیر ترقی یافتہ یا کم ترقی یافتہ اعضاء جنسیہ کے حامل افراد کو بھی اس جنسی بیماری کا شکار بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی کمزوری کے احساس کی تلافی کے لیے فرد پوشیدہ طور پر دیگر افراد کو برہنہ یا حالت مباشرت میں دیکھ کر تسکین پاتا ہے۔ چنانچہ دور حاضر میں نیچرل ہسٹری کے نام پر بننے والی تمام فلمیں اسی جنسی بیماری کا نتیجہ ہیں۔ دور قدیم میں تو امراء اور نواب لوگ مخصوص خوبصورت لڑکوں کو برہنہ پریڈ کروایا کرتے ہیں۔ قدیم دیوتا...... عموماً زمین پر اتر کر تالاب میں نہاتی ہوئی برہنہ لڑکیوں کو چھپ چھپ کر دیکھتے تھے۔

مشہور فرانسیسی ادیب ''روسو'' نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''اعترافات'' (Confessions) میں لکھا ہے کہ......

''اپنے شباب کے اولین دور میں میں کنویں کے قریب سے گزر رہا تھا...... کہ وہاں پانی بھرتی ہوئی نوجوان لڑکیوں کے نظارے نے میرے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے اور آخر کار میں نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر اپنے کپڑے اتار دیئے اور اپنے عضو تناسل کی نمائش کی...... مجھے دیکھ کر چند لڑکیاں مسکرانے لگیں، کچھ شرمانے لگیں اور کچھ مجھے گالیاں دینے لگیں۔''

چنانچہ یورپی مفکرین کی رائے ہے کہ جنسی اعضاء کی نمائش یا ان کا نظارہ کرنا ایک جنسی بیماری ہے اور اس بیماری میں مبتلا لوگ ''مباشرت بین'' کہلاتے ہیں۔ انہی مباشرت بینوں کو ''نیچرل ہسٹری'' دیکھنے کا خواہش مند بھی کہا جاتا ہے۔

جنسی ہوس ایک صلاحیت کش عامل

یہ بات بار بار کے تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ جنسی ہوس کی زیادتی، کثرت جماع اور مادۂ منویہ کے بلاضرورت اخراج سے ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ حافظہ کمزور ہوتا ہے، توجہ قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر وقت غائب دماغی کی سی کیفیت طاری رہتی ہے اور انسان کوئی بھی کام دل لگا کر نہیں کر سکتا اور یوں ایک اچھا بھلا انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ گویا جنسی بے راہ روی قاتل ذہن ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جنسی لذت کا محض خیال ہی انسان کی کیفیت موجود کو یکسر بدل دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جو اکیلا بیٹھا ہے اور کسی دلچسپ کتاب کا بغور مطالعہ کر رہا ہے۔ اگر کسی اچانک آ جانے والے خیال سے وقتی طور پر بھٹک گیا اور اس کے خیال کی رو جنسی لذت کی طرف مائل ہو گئی تو یہ یقینی بات ہے کہ وہ کافی دیر تک سنبھل نہیں سکے گا۔ نسبتاً اس کے دوسرے خیالات اور پھر خواہشات کا حملہ اتنا شدید نہیں ہوتا اور اس کے تجربات آسانی سے کیے جا سکتے ہیں۔ ان سے بالآخر یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنسی ہوس کی شدت صلاحیتوں کی قاتل ہے۔ ماہرین نفسیات فرائڈ اور واٹسن وغیرہ بلکہ عام مفکرین اور دانشور بھی اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ جنسی جذبہ پر کنٹرول یعنی قابو پانا ایک باصلاحیت انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ بات بھی عام تجربے

میں آئی ہے کہ بڑے بڑے لوگ جن کے نام صدیوں تک لوگوں کی زبان کی زینت بنے رہے ہیں-اگر اپنی صلاحیتوں کی بدولت ترقی کے بام عروج پر پہنچے تو اس کے پیچھے ان کی اس مستقل مزاج طبیعت کا ہاتھ ہے جس نے انہیں جنسی یا شہوانی جذبات سے محفوظ رکھا-شیکسپیئر کے بارے میں بڑی دلچسپ کہانی مشہور ہے- کہتے ہیں شیکسپیئر عین اس وقت فرار ہو گیا تھا جب اس کی دلہن سج دھج کر چرچ میں پہنچ چکی تھی اور یہی وہ شیکسپیئر ہے جس کا ایک ایک جملہ اہل یورپ میں ضرب الامثال کی طرح مشہور ہے- اگر چہ سیکس سے مکمل طور پر فرار بھی درست نہیں اور اس سے بھی صلاحیتوں پر منفی اثر پڑتا ہے-لیکن اس کی ایسی ہوس جو فی زمانہ دیکھنے میں آ رہی ہے بھی انسانیت کی قاتل ہے- نبی کریمؐ کا ایک ارشاد ہے کہ **خیر الامور اوسطھا**

ترجمہ: بہترین کام میانہ روی ہے-

اس حدیث کی روشنی میں یا پھر انگریزی کی وہ کہاوت جس میں ہر چیز کی زیادتی (Excess of every thing is bad) بری سمجھی گئی ہے-معروف ادیب قدرت اللہ شہاب قوت شہوانیہ کے اعتدال کو عفت کا نام دیتے ہیں- گویا قوت جنسیہ کی میانہ روی عفت یعنی پاکیزگی ہے-

نبی کریمؐ پر ایک اعتراض کا جواب

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک نمونہ ہے- نبی کریمؐ پر غیر مسلموں کی طرف سے ایک اعتراض یہ وارد کیا جاتا ہے کہ آپ نے گیارہ یا تیرہ شادیاں کر کے جنسیت پسند ہونے کا ثبوت دیا ہے-لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے اور اعتراض کرنے والا حقائق سے بے خبر ہونے کی وجہ سے یا پھر جان بوجھ کر گمراہ ہوتا ہے- حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام شادیاں قطعاً جنسی تقاضے کے تحت نہیں ہوئیں-مثلاً آپ نے سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تو اس وقت آپ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی- کون کہہ سکتا ہے کہ پچیس سال کا خوبصورت جوان ایک چالیس سالہ بیوہ عورت کو جنسیت پسندی کی وجہ سے اپناتا ہے- ظاہر ہے کوئی بھی ایسا نہیں کہے گا- کیونکہ فطری نقطۂ نگاہ سے ایک نوجوان مرد کو ایک نوجوان عورت میں ہی کشش محسوس ہوتی ہے- جبکہ یہاں معاملہ الٹ ہے اور پھر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے جب

تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں دوسری شادی نہیں کی اور حضرت خدیجہؓ کے ہمراہ اپنی جوانی کے تمام دن گزار دیئے- جس وقت حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی آپؐ کی عمر پچاس سال تھی- گویا آپ نے اپنی زندگی کے پچیس بھرپور سال اپنی ایک ہی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزارے- اس کے بعد آپؐ نے جو دوسری شادی فرمائی- اس کا حال دیکھ کر تو کم عقل سے کم عقل آدمی بھی نہیں کہے گا کہ آپؐ جنسیت پسند تھے- کیونکہ آپ کی دوسری شادی حضرت سودہؓ...... سے ہوئی اور جس وقت ہوئی اس وقت حضرت سودہؓ کی عمر ۶۵ برس تھی- گویا حضرت سودہؓ...... ایک ضعیف العمر خاتون تھیں- ظاہر ہے یہ شادی آپؐ نے حضرت سودہؓ کو سہارا دینے کے لیے کی اور پھر یوں ہوا کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ بیاہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر چلی گئیں- حضرت فاطمہ کے بعد گھر میں نبی کریمؐ اور حضرت سودہ رہ گئے- ظاہر ہے حضرت سودہؓ کے حصے کا کام کاج بھی نبی کریمؐ کو کرنا پڑتا ہوگا- ان حالات میں پرانے دوست حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے رشتے کی پیشکش کی اور جو آپ کو خصوصاً دینی مصروفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قبول کرنا پڑی- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی شادیاں بھی اسی قسم کی مصلحتوں کے زیر اثر طے پائیں- گویا یہ کہنا درست نہیں کہ مسلمانوں کے نبی محمدؐ...... شہوانیت پسند تھے- یہ سراسر بہتان اور بد دیانتی ہے- آپؐ نے تو اپنے کردار سے ثابت کیا کہ شادی محض دو جسموں کے جنسی ملاپ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا بندھن ہے جس میں دو ذہن ایک دوسرے کے قریب آ کر اکٹھے زندگی گزارنے کا معاہدہ کرتے ہیں اور اس طرح نبی کریمؐ نے یہود و نصاریٰ کی پھیلائی ہوئی اس غلط روش کا بھی محاسبہ کیا جس کے تحت وہ پادری اور راہب بن کر انسان کو جذبۂ شہوت کے استعمال سے روکتے ہیں اور یہ نظریہ یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے-مختصر الفاظ میں یوں کہنا مناسب ہے کہ انسانی شعور کی نشوونما جذبۂ جنس پر جائز کنٹرول سے ہی ممکن ہے-

آج کل کچھ لوگ (۱۰۱) ''خصوصاً ہندوستان'' میں پرانے اور استعمال شدہ افکار کو نئے پیرائے میں بیان کر کے انسانوں کو Intellectual سطح پر گمراہ کر رہے ہیں- گرو رجنیش کا یہ کہنا ہے کہ ''جنسی لذت (۱۰۲) کی انتہا یعنی وقت انزال وہ لمحہ ہے جب ذہن بالکل خالی ہو جاتا ہے اور یہی وہ لمحہ ہے جب خالی ذہن میں خدا داخل ہوتا ہے-'' اور یوں گرو رجنیش پڑھے لکھے خدا پسند طبقہ

کو ایک غلط کام پر لگا دیتا ہے- حالانکہ یہ بات سمجھنے کے لیے کسی گہری بصیرت کی ضرورت نہیں کہ جسمانی لذت جو محسوس اشیاء کی بدولت نصیب ہوتی ہے اور باطنی لذت...... جو غیر محسوس اشیاء کی بدولت نصیب ہوتی ہے- ایک دوسرے سے باہم متصادم نہیں تو متضاد ضرور ہیں- سادہ سی بات ہے ہم اپنے جسم کو توانائی بخشنے کے لیے اچھی خوراک فراہم کرتے ہیں- اس کے برعکس روح یا باطن کو تقویت دینے کے لیے اپنے حصے کی خوراک بھی ضرورت مند کو دینا پسند کرتے ہیں- جس سے ہمیں سرشاری نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ وقت ہے جب ہم خدا سے ملتے ہیں- اسلامی زبان میں کہا جائے تو یوں ہے کہ تقویٰ اللہ کے نزدیک لے جاتا ہے اور ظاہر ہے تقویٰ یا پرہیز گاری جسمانی لذت سے تو حاصل نہیں ہوتی- بلکہ تقویٰ کی دولت مادی دولت خرچ کر دینے سے نصیب ہوتی ہے-

شہوت پسندوں کی یہ غلط منطق جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں- اس نظریے سے بھی زیادہ خطرناک ہے جو یورپ کے فطرت پسندوں یعنی ہپیوں نے اختیار کیا تھا- ہپیوں کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کو اپنے ماضی قدیم میں لوٹ جانا چاہیے- یعنی ہر لحاظ سے جانوروں کی طرح زندگی گزارنی چاہیے اور وہ اس طرح انسانی شعور کے آہنی پنجے سے نکل کر ایک بار پھر حیوانی فطرت میں گم ہو جانا چاہتے تھے- ہپی تحریک ۱۹۷۱ء کے آس پاس اٹھی اور بہت جلد دور دور تک پھیل گئی- لیکن چونکہ ان کا نظریہ حد سے زیادہ غلط تھا لہٰذا...... تحریک فنا ہو گئی- ان کے برعکس جدید شہوت پسندوں کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب شہوانیت ہی خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے- وہ محبت کے جنسی معنوں پر اکتفا کرتے ہیں اور محبت میں انا کو ناجائز دیوار سمجھتے ہیں- ان کا خیال ہے کہ پھول میں انا نہیں ہوتی- حالانکہ یہ بات فی نفسہ غلط ہے- کانٹوں کے محافظ دستے کے درمیان پھول کی انا ضرب المثل ہے- پھول کی یہ انا ہے کہ اس کے آس پاس کانٹے ہیں- گویا وہ اپنے ہونے کا، اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے-

ایک گروہ وہ بھی ہے جو انسان کی اہمیت کا منکر ہے- ان کا خیال ہے کہ کسی بھی شخص کا اپنے آپ کو اہم سمجھنا نقصان دہ ہے- ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو عام آدمی سمجھے- یہ بات بھی درست نہیں- کائنات کی قوتیں گواہ ہیں کہ انسان کی منفرد حیثیت مسلم ہے- ایک مخلوق کی حیثیت سے اگرچہ عام ہونا ہی ضروری ہے- لیکن ایک انسان کی حیثیت سے جسے ایک خاص چیز یعنی ''ذات'' نے ممتاز کر دیا ہے- اس بات کا یقین ہونا ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی سطح پر انتہائی اہم ہے-

شخص حقوق کے حوالے سے تو عام آدمی ہی ہے- البتہ فرائض کے حوالے سے دنیا کا ہر شخص اپنی جگہ انتہائی اہم ہے- یہاں تک آنے کے بعد ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انا کی دیواریں ایک زندہ قوم کے لیے انتہائی ضروری ہیں- بشرطیکہ انا کو تکبر کے معنی میں نہ لیا جائے- شہوت پسندوں کا یہ خیال کہ دو انسانوں کے مابین جنسی ملاپ کے راستے کی سب سے بڑی دیوار انا ہے...... لہٰذا انا نہیں ہونا چاہیے اور جب انا نہ ہوگی تو ذات صفر ہوگی- گویا خالی...... اور یوں فریقین کے افکار باہم متصادم نہیں ہوں گے- لہٰذا خدا کا ظہور ہوگا' بالکل غلط اور غیر ریاضیاتی ہے- کیونکہ صفر + صفر = صفر ہی ہوتی ہے- صفر + صفر = خدا نہیں ہو سکتا-

یہ ہیں جدید دور کے وہ نظریات جو فطرت پسندوں اور شہوت پسندوں کے ذریعے پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچے اور جنہیں نام نہاد مذہبی طبقہ سے پذیرائی ملی- اشتراکیت بھی اس طرح کی آزادی دینے کے حق میں ہے اور یہی اشتراکیت کا مائنس پوائنٹ ہے- موجودہ دور کی نام نہاد جمہوریت نے بھی آزادی نسواں کا نعرہ مار کر جنسی بے راہ روی کی کھلی اجازت دے رکھی ہے- ایک شہری یا ایک ووٹر جس کی عمر اٹھارہ سال سے زائد ہے- نظام جمہوریت کے تحت معاشرے کا آزاد شہری ہے اور جنس مخالف کے ساتھ پارٹنر شپ (Partnership) کی زندگی گزارنے کے لیے بااختیار ہے- اہل یورپ نے جمہوریت کے اس نادرست طرز عمل سے جو نقصان اٹھایا- اس کے لیے ان کی عدالتیں گواہ ہیں- جہاں پارٹنر شپ کی شادیوں اور طلاقوں کے مقدمے ہزاروں کی تعداد میں ہیں- اب تو ہمارے ہاں بھی جمہوریت کے یہ ثمرات اکثر دکھائی دیتے ہیں اور ہماری عدالتوں میں بھی نوجوان لڑکی اور لڑکے کی اپنی مرضی سے شادی کے مقدمات اکثر ان کے حق میں طے ہوتے ہیں اور جمہوریت جو انسانی فطرت کے احترام کی قائل ہے' اتنا بھی نہیں دیکھتی کہ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں محض جنسی حظ اٹھانے کے لیے ایک دوسرے کو پسند کرتے اور جذبات کے طوفان کی زد میں آ کر گھر سے بھاگ نکلتے ہیں- تو پھر...... یہ تو خالص حیوانی فطرت ہوئی- کیا جمہوریت بھی فطرت پسندوں یعنی ہپیوں کے خیالات کی حامل ہے- حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اشرف المخلوقات کے مرتبے اور منزلت کا خیال رکھا جاتا اور محض جنسی لذت کے حصول کے پیش نظر ہونے والی شادیوں کو غیر انسانی اور گھٹیا فعل قرار دیا جاتا- انسان تو حیوانات سے بالاتر ہے- اس کے پاس

شعور ہے- اسے چاہیے کہ شادی کے وقت مستقبل کی منصوبہ بندی پر نظر رکھے اور اپنے ماضی کی کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے اس پڑھے لکھے دور میں انسانی سنجیدگی کا مظاہرہ کرے- تاکہ شادی کے وقت ذہنی طور پر ہم آہنگ جوڑے سامنے آئیں اور معاشرے کو بے چین اولادوں کے عذاب سے نجات مل سکے-

زنا یا مباشرت

میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت کی جائے' زنا نہ کیا جائے- بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اپنی بیوی کے ساتھ زنا کیسے ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیوی جو آپ کی زندگی کا ساتھی ہے اور جس کے ساتھ مل کر آپ نے معاشرے کو نئی نسل فراہم کرنی ہے بازاری عورت نہیں کہ اس کے ساتھ محض تھکن دور کرنے اور جنسی حظ حاصل کرنے کے لیے ہم بستری کی جائے- بلکہ بیوی تعمیر قوم کے سلسلے میں آپ کی معین و مددگار ہے- ہم جب اپنی بیوی کے ساتھ بغیر کسی مقصد' پروگرام یا منصوبے کے ہم بستری کرتے ہیں تو یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم کسی پیشہ ور عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرتے ہیں- اس کے برعکس ہم جب اچھی اولاد پیدا کرنے کی غرض سے اپنی بیویوں کے ساتھ ہم بستری کرتے ہیں تو اس وقت ہم ایک عظیم الشان نیک کام سر انجام دیتے ہیں- اسی متوازن بات کو بیان کرنے کے لیے میں یوں کہا کرتا ہوں کہ اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت کیا کرو زنا نہ کیا کرو-

بظاہر یہ الفاظ سخت اور قابل مباحثہ ہیں- لیکن مذاہب کی روایت پسندی سے بالاتر خالص انسانی سطح پر آ کے سوچا جائے تو یہی بات اشرف المخلوقات کا خاصہ نظر آئے گی- اشرف المخلوقات تو کیا اس بات کا خیال دوسری مخلوقات بھی رکھتی ہیں کہ جنسی ملاپ افزائش نسل کے لیے کیا جائے- حالانکہ یہ ہے...... مشکل بلکہ ناممکن کے قریب یا پھر ناممکن بھی کہہ دینا غیر درست نہیں- کیونکہ انسانی دماغ پر سب سے زیادہ حملہ آور ہونے والی قوت ''شہوت'' ہی ہے- پیٹ میں روٹی کا لقمہ اترنے کی دیر ہے کہ بدن کی تمام جنسی حسیں بیدار ہو جاتی ہیں- عام استعمال کی کہاوت ہے کہ زیادہ اناج کھاتا ہے تو شغل (شہوت) بھی کرتا ہو گا-

اس پر دماغ...... یہ کارنامہ سرانجام دیتا ہے کہ اس برانگیختہ قوت کو سلامتی کی راہ سجھانے کی بجائے وقت بے وقت کی جنسی سرگرمی پر آمادہ کرتا ہے- خالی خولی مادۂ منویہ بہا دینا جرم' بددیانتی اور خیانت ہے- قدرت نے مرد کے مادہ منویہ میں کروڑوں کی تعداد میں سپرم پیدا کیے ہیں جو ایک زندہ مخلوق ہیں- سانس لیتے ہیں' خوراک کھاتے ہیں' فضلہ خارج کرتے ہیں اور حرکت کرتے ہیں- جب مادہ منویہ بلاضرورت بہا دیا جائے تو ظاہر ہے ان جرثوموں کو بے موت مار دیا جائے گا اور یہ قانون قدرت کی سراسر خلاف ورزی ہے کیونکہ دوسری مخلوقات میں اس طرح کا جرم رائج نہیں- اسی طرح عورت کے ایک ماہواری چکر کے دوران ایک یا دو انڈے پیدا ہو جاتے ہیں اور محض جنسی لذت کے شوق میں عورت اپنے قیمتی انڈے جو انسانیت کی امانت تھے خواہ مخواہ ضائع کر دیتی ہے- جدید فکر کے علمبرداروں کو یہ سوچنا چاہیے کہ نیچر تو جنسی بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتی- نیچر تو مقصدیت کی قائل ہے اور یہی سبق دیتی ہے کہ جنسی ملاپ افزائش نسل کے لیے ہی ہونا چاہیے-

منصوبہ بندی یا فیملی پلاننگ

یہاں ایک سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ کثرت آبادی اجناس ارض کی قلت کا باعث ہو گی- یعنی مرد اپنے سپرم اور عورت اپنے انڈے کام میں لائے تو آبادی بڑھ جائے گی اور آبادی بڑھ گئی تو خوراک کی کمی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا- لیکن حقیقت ذرا مختلف ہی ہے اور یاران جہاں کے لیے ناخوش گوار بھی- آبادی کا مسئلہ انڈوں یا سپرم کا نہیں اور نہ ہی خوراک کی قلت کا باعث ہے- یہ مسئلہ تو ہے ان لوگوں کا پیدا کردہ جو زمین کی مشترکہ دولت اپنی ناجائز عیاشی اور ظلم کے لیے غصب کیے بیٹھے ہیں- وہ پیداوار جو سب اہل زمین پر مساوی تقسیم ہونی چاہیے- چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور یوں تمام اہل زمین کو ان کا پورا حق نہیں مل پاتا- جس سے خوراک کی کمی کا مسئلہ جنم لیتا ہے- انتہائی حیرت انگیز بات ہے کہ موجودہ زمانے میں پیدا ہونے والے ایشو (Issue) کو امی لقب نبیؐ نے آج سے سوا چودہ سو سال پہلے وحی کی زبان میں بیان فرمایا- قرآن حکیم میں ہے کہ

ولا تقتلوا اولادکم من خشیۃ املاق

ترجمہ: اور اپنی اولاد کو رزق کی کمی کے ڈر سے قتل مت کرو

ذرا ملاحظہ کیجیے! آج سے سوا چودہ سو سال پہلے جب نہ سپرم کو کسی نے دیکھا تھا اور نہ ہی انڈے کو اور نہ ہی زائیگوٹ (جفتہ) کے بارے میں تحقیقات ہوئی تھیں اور اس وقت قرآن نے اولاد کے قتل (ضائع) کرنے کی ممانعت کی ہے- ورنہ ایسی تو کوئی بات نہ تھی کہ اہل عرب رزق کے ڈر سے بچے مارتے- ہاں البتہ آبرو اور غیرت کے نام پہ بچیوں کو قتل کرنے کے واقعات موجود تھے...... تو پھر قرآن نے کس کے لیے یہ حکم صادر کیا- یقیناً اللہ کی بڑی آنکھیں ماضی حال اور مستقبل کی محتاج نہیں اور اب تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کا تولیدی خلیہ (سپرم) اور عورت کا تولیدی خلیہ (انڈا) نہ صرف زندہ مخلوق ہیں- بلکہ آپس میں ملنے کے بعد ایک بڑا زندہ خلیہ زائیگوٹ (جفتہ) بناتے ہیں- جو ایک نئے انسان کا اولین روپ ہوتا ہے-

اس تشریح کے بعد یہ بتانا مشکل نہیں کہ زمین پر موجود خوراک کے کم ہو جانے کے ڈر سے منصوبہ بندی (فیملی پلاننگ) کرنا اولاد...... قتل کرنے کے برابر ہے- جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے-

آج اہل یورپ جو سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار ہیں اور جہاں دولت' امیروں' جاگیرداروں' تاجروں اور صنعت کاروں کے قبضے میں رہتی ہے اور جہاں جنسی بے راہ روی عروج پر ہے' جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے آزادانہ ملاپ کی عام اجازت ہے- وہاں اولاد کے بڑھ جانے اور رزق کے کم ہو جانے کا اندیشہ کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے- لیکن کیا اس کا یہ حل ہے کہ مصنوعی طریقوں سے اولاد کی پیدائش کو روکا جائے' یقیناً نہیں- اس کا حل تو یہ ہے کہ نظام میں تبدیلی لائی جائے- ایک تو یہ کہ روٹی کپڑا اور مکان جو انسان کی بنیادی ضروریات ہیں ہر سطح پر برابر مہیا کی جائیں اور دوسرے یہ کہ جنسی بے راہ روی اور شہوانی آزادی پر قابو پایا جائے- افزائش نسل کے قدرتی طریقے اپنائے جائیں اور حیوانی سطح سے بلند ہو کر کسی پروگرام کے تحت بچے پیدا کیے جائیں-

آج کی یہ فیملی پلاننگ جو ہمارے ہاں بھی رائج ہے غیر قدرتی اور ناروا طرز عمل ہے- کیونکہ ایک نوجوان جوڑا جو شادی شدہ تو نہیں لیکن چھپ چھپ کے ملتا ہے بے خطر جنس اختلاط کا عمل محض اس لیے کر لیتا ہے کہ وہ فیملی پلاننگ کی ادویات کے ذریعے بچے کی پیدائش کو روکنا جانتا ہے- اس طرح گویا معاشرے میں زنا کو ترقی ملی ہے- پھر یہ بھی ہے کہ فیملی پلاننگ کے ذریعے بچے روکنا

بلکہ ایک قطعی غیر فطری اور غیر قدرتی عمل ہے- لہٰذا ان ادویات کے ذریعے عورت اور مرد کا کسی نہ کسی درجہ میں بیمار ہو جانا لازمی بات ہے- چاہے وہ بیماری محض نفسیاتی دباؤ ہی کیوں نہ ہو- اس طرح جان بوجھ کر پورے معاشرے کے والدین کو اور پھر ان کی اولادوں کو بیمار کیا جا رہا ہے- یہ صورت حال بڑی دردناک ہے- دردناک اس لیے کہ ہمارا معاشرہ جسے اسلامی ہونا چاہیے تھا...... بھی اس قباحت سے بچ نہیں سکا اور یہاں بھی بڑے زور شور سے اس شیطانی کام کی تبلیغ کی جاتی ہے- علامہ اقبال سے سپین کے فرمانروا نے جو اس وقت علامہ صاحب کا میزبان تھا- آبادی کے مسئلے پر مشورہ مانگا اور وہ یہ سن کر حیران رہ گیا کہ علامہ صاحب نے اسے آبادی کنٹرول کرنے کی بجائے نئے شہر بسانے کا مشورہ دیا- قدرت نے عورت کی جسمانی ساخت میں ایسا نظام رکھا ہے جس کی بدولت عورت جب تک بچے کو دودھ پلاتی رہتی ہے اسے حمل نہیں ٹھہرتا- بعض عورتوں کا معاملہ ذرا اس سے مختلف بھی ہوتا ہے- لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کا معاملہ بگڑا ابھی فطرت جنسیہ کے بار بار غلط استعمال سے ہے- ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب تک بچہ دودھ پیتا رہتا فریقین کے درمیان قصد مباشرت ہی نہ ہوتا- لیکن چونکہ فی زمانہ ایسا ممکن نہیں رہا- لہٰذا کم از کم اس بات کا تو خیال رکھا جائے کہ دوران حمل مباشرت سے اجتناب کیا جائے- ہاں البتہ بچے کی پیدائش کے بعد نیچر کی طرف سے بھی کسی حد تک مباشرت کا جواز نکالا جا سکتا ہے- لیکن پھر فیملی پلاننگ کی ادویات کے ذریعے بچے کی پیدائش روکنا تو بالکل غیر فطری عمل ہے-

جذبہء جنس کے ہاتھوں انسانیت کی یہ بے عزتی جو خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے جاری ہے صرف اسی دور کا المیہ ہے- جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور جنسی بے راہ روی میں تمام ادوار سے آگے نکل گیا ہے-

باب ۸

انسان کا جنسی استحقاق

عجیب بات ہے کہ یہ واحد انسان ہی ہے جسے اپنا جنسی استحقاق متعین کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے- ورنہ دوسری مخلوقات تو اس مسئلے سے مستثنیٰ اور بے پرواہ ہیں' ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ انسان کے پاس عقل کی لازوال دولت ہے- جوں جوں عقل آتی گئی- فطرت کی اطاعت کا خودکار نظام انسان سے دور ہوتا چلا گیا- بھینس گوشت نہیں کھاتی- بھیڑیا سبزی پسند نہیں کرتا- مچھلی چلنا نہیں جانتی- گدھا گیت نہیں گا سکتا- بکری وزن نہیں اٹھا سکتی- کہا جائے گا کہ ان کی جسمانی ساخت کا تقاضا ہی ایسا ہے- بکری کی ریڑھ کی ہڈی وزن اٹھانے کے لیے موزوں نہیں- اسی طرح گدھا بلبل کی طرح شاخ در شاخ چہکتا نہیں پھرتا- بھینس کا معدہ گوشت ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور بھیڑیے کو جگالی کرنے کے غدود عطا نہیں کیے گئے- یقیناً ان مخلوقات کی تمام صلاحیتیں انسان میں آ کر اکٹھی ہوئیں- انسان کے معدے میں گوشت اور سبزی کو بہ یک وقت ہضم کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور بلبل کی طرح دلکش نغمے الاپنے کی مہارت بھی- وزن اٹھانا چاہے تو گدھے کو بھی مات دے دیتا ہے- تیرتا ہے تو لگتا ہے کہ مچھلی کا بھی استاد ہے- سانپ کی طرح ہوشیار' کوے کی طرح محتاط' بلی کی طرح خوشامد پرست' طوطے کی طرح بے مروت' عقاب جیسا تیز نظر' شیر جیسا دلیر' بھیڑیے جیسا خونخوار' گھوڑے جیسا متکبر' لومڑی جیسا چالاک' ہاتھی جیسا جسیم' چیونٹی جیسا قبیلہ پرست' مگس جیسا نظام پسند' پروانے جیسا جانثار' الو کی طرح دانا' گدھے کی طرح بیوقوف' کتے کی طرح ذمہ دار' چیتے جیسا چست' خنزیر کی طرح بدخصلت اور ریچھ جیسا شہوت پسند ہے- قصہ مختصر کہ جب ایسا ہے کہ اس میں تمام مخلوقات کی تمام صفات ایک خاص تناسب کے ساتھ پائی جاتی ہیں- تو پھر اسے ہر حیوانی خصلت کی حدود متعین کرنا لازمی ہو جائیں گی- لہٰذا صرف جنسی استحقاق ہی نہیں جس کی حدود کا تعین کرنا ہے- بلکہ اسے اپنے تمام فطری تقاضوں کو دیکھ بھال کر چند پابندیوں کا عادی کرنا ہوگا- چنانچہ اس کے پاس عقل ہے اور وہ ایسا کر سکتا ہے-

لیکن یہاں ہم اس کے صرف جنسی استحقاق کا جائزہ لینا چاہ رہے ہیں- کیونکہ اس بات کا
ن بہت مشکل ہے کہ انسان کے جذبۂ شہوت کی فطری حاجت کہاں تک پھیلی ہوئی ہے- بعض
وں کا خیال ہے کہ انسان کو شہوت کی فطری حاجت ہی نہیں ہوتی- جس طرح کہ دوسرے
وروں میں ہوتا ہے- وہ اپنے موقف کے حق میں یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ جانوروں میں
ئش نسل کے ایک خاص موسم میں بلا ارادہ اور خود بخود جنسی خواہش پیدا ہو جاتی ہے جبکہ انسان
ں ایسا نہیں ہوتا اور انسان جب چاہتا ہے اپنی مرضی سے اپنے اندر یہ خواہش پیدا کر لیتا ہے اور اگر
پیدا کرنا چاہے تو اس بارے میں نہ سوچے خیال میں نہ لائے اور یوں وہ اس کام سے بچا رہ سکتا
(۱۰۳)- ان لوگوں کا خیال ہے کہ انسان روٹی نہ کھائے' آرام نہ کرے تو زندہ نہیں رہ سکتا-
ن اگر جنسی تسکین حاصل نہ کرے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے- لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں-
دی طور پر درست ہے- اتنا درست ہے کہ انسان اس قسم کی خواہشات خیال میں نہ لائے تو واقعی
ے جسم میں شہوت کی تحریک نہیں پیدا ہوتی- لیکن یہ بات درست نہیں کہ انسان بغیر جنسی
ے کی تسکین کے زندہ رہ سکتا ہے- دراصل یہ بات انسانوں کی اقسام پر منحصر ہے- بعض لوگ
ات کی طرح وحشیانہ اور شعلہ مثال فطرت کے مالک ہوتے ہیں- ان کے مقابلے میں بعض
ل فطری طور پر جنسیت کی طرف کم میلان رکھتے ہیں- اب تجربات سے ثابت ہے کہ ایسے لوگ
ر زیادہ شہوانی جذبات کے مالک ہیں- اگر جنسی جذبے کی تسکین سے دور رہیں تو زندہ نہیں رہ
ئے- ان کے لیے شہوت پسندی روٹی کی طرح ضروری ہے- باقی رہی یہ بات کہ سیکس فطرت نہیں
لہ اسے "توجہ" یا "دھیان" کی اصلاح سے ترک کیا جا سکتا ہے- بالکل اسی طرح ہے جیسے ذرا
تلف الفاظ میں بائبل اور ویدانت کے نظریات ہیں جو لوگ ترک دنیا کرتے ہیں- وہ بنیادی طور
ر ترک جنس ہی کرتے ہیں- کیونکہ وہ اپنی تربیت کے اولین مرحلے میں جنسی ضبط نفس ہی کرتے
ہیں- دراصل کسی چیز کے ترک کرنے کا ارادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ چیز استعمال کی جائے-
رک شہوانیت اصل میں اسی بات کی علامت ہے کیونکہ انسان چھوڑے گا تو وہی کچھ جو اس کے
پاس ہوگا لیکن یہ کام ہے بہت مشکل- وہ لوگ تو یقیناً خوش قسمت ہیں جو اپنے اس قسم کے ارادے
میں کامیاب ہو جاتے ہیں- لیکن وہ لوگ جن کا گیان دھیان پروان نہیں چڑھتا اور ادھورے راستے

سے پلٹتے ہیں- اتنی زیادہ شدت سے پلٹتے ہیں کہ الامان' الحفیظ

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

اور پھر ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں جو اپنے پریشان خیالات پر کنٹرول کے ذریعے جذبہء جنس پر قابو پا لیں- وہ نصیحت بے معنی ہے جس پر عمل ممکن نہ ہو- ہاں البتہ یہ بات درست ہے کہ اس قسم کے معاملات میں میانہ روی کا شعار اپنایا جائے- دونوں انتہا پر دباؤ ڈالنے سے "فانہ" الٹ جاتا ہے- توازن بگڑتا ہے اور سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے- نہ تو یہ انتہا اپنائی جائے کہ غیر معقول قسم کی قدغنیں لگائی جائیں اور نہ یہ کہ بے راہ روی اختیار کی جائے- درمیان کا راستہ ہی انسانیت کی ناؤ کو جذبات کے سمندر سے پار لے جا سکتا ہے-

زندہ اشیاء کے بنیادی حقوق

ہمیں انسان کا جنسی استحقاق صحیح طور پر متعین کرنے کے لیے تمام مخلوقات کے بنیادی حقوق پر نظر کرنا ہو گی- اس لیے کہ ہر ذی روح کو کرۂ زمین پر رہتے ہوئے اس کے حقوق ملنے چاہئیں اور اگر ہر ذی روح کو ملنے چاہئیں تو پھر انسان نے کون سا قصور کیا ہے کہ اس سے چھین لیے جائیں- ہاں! انسان نے قصور کیا ہے- اس نے عقل استعمال کی ہے اور یہی اس کا قصور ہے- لہٰذا اس قصور کی سزا کے طور پر اس سے حقوق چھینے تو نہیں جائیں گے- البتہ ان کی حدود متعین کی جائیں گی اور یہ ایسی سزا ہے جو اللہ رب العزت کی صفت جباری کے ماتحت دی گئی ہے اور انسان کے لیے مفید ہے- اللہ تعالیٰ کی صفت "جباری" انسانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتی ہے جو انسانوں کے لیے مفید اور نفع بخش ہوتی ہیں- "سیکس" کی اصلاح سے نفع کیا ہے یہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے- یہاں ہم باقی مخلوقات کے حقوق پر سرسری سی نظر ڈالتے ہیں تاکہ ہر قسم کا موازنہ کرتے وقت آسانی رہے-

کرۂ زمین پر بسنے والا ہر ذی روح جو سانس لیتا ہے' غذا کھاتا ہے' حرکت اور افزائش نسل کرتا ہے اہل زمین میں سے ہے- زمین سے پیدا ہوا ہے- زمین کی اولاد ہے- زمین پر ہی مرے گا اور گل سڑ کر زمین میں ہی مل جائے گا- سیارۂ زمین کی بقاء اسی میں ہے کہ اس کی رواں دواں زندگی قائم رہے- زندہ اشیاء کو پہنچنے والا ہر نقصان دراصل پورے کرۂ زمین کا نقصان ہے- مثال کے طور

پر درختوں کے کٹ جانے سے آکسیجن کی پیداوار کم ہو جاتی ہے جو آکسیجن (O_2) حاصل کرنے والے تمام جانوروں کی موت ہے- جانوروں کے ختم ہو جانے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) کی پیداوار ختم ہو جائے گی جو نباتات کی موت ہے- سمندر نہ ہوں تو ان کے آبی بخارات سے بادل نہیں بنیں گے' بارش نہیں برسے گی- بارش نہ برسے تو سبزہ نہیں اگ سکتا- مرکز زمین میں ملنے والے زندہ اجسام زمین کو کیمیائی مواد فراہم نہ کریں تو مٹی بھوکی پیاسی رہ کر سوکھ جائے گی- چوہا نہ ہو تو بلی کا زندہ رہنا مشکل ہے- چھوٹی مچھلی نہ ہو تو بڑی بھوک سے مر جائے- بھیڑ سبزے کو کھاتی ہے- شیر بھیڑ کو نگل کر زندہ رہتا ہے- مکڑیاں مکھی کو کھا جاتی ہیں- سانپ مکڑیوں کو کھا جاتا ہے- شکرا سانپ کو کھا جاتا ہے- عقاب شکرے کو نوچ لیتا ہے- گویا زندگی کے لیے موت انتہائی ضروری ہے- کسی کی زندگی کسی کی موت سے وابستہ ہے اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک خاص تواتر اور توارد سے جاری ہے- ہوا اگر سانس کے لیے ضروری ہے تو سانس بھی ہوا کے لیے ناگزیر ہے- پودے سانس لیں تو جانور جیتے ہیں- جانور سانس لیں تو پودوں کو زندگی ملتی ہے- روشنی پتوں کی خوراک ہے- پتے سبزی خوروں کی خوراک ہیں- پھول کھلتا ہے تو پودا اپنے دامن میں نئے پودوں کی نوید لے کر آتا ہے- پھول کے سینے سے پھل جنم لیتا ہے- پھل کی مٹھاس اور ذائقہ خوراک کے متلاشیوں کو مائل کرتا ہے اور کھانے والا پھل کھا کر بیج پھینک دیتا ہے- بیج مٹی میں پہنچتا ہے تو خوشی سے پھول جاتا ہے- نیا پودا جنم لیتا ہے اور قدرت کی یہ کہانی پھر سے چلنے لگتی ہے- یہ نظام جو بظاہر ایک کی موت اور دوسرے کی زندگی نظر آتا ہے- بعض کوتاہ نظروں کو ظالمانہ محسوس ہوتا ہے- بعض اسے بے رحم تقدیر کا نام دیتے ہیں- بعض اس کے بنانے والے کو تخریبی قوت سمجھتے ہیں- لیکن وہ کیا جانیں کہ بقاء موت سے شروع ہوتی ہے- مرنے والا فنا نہیں ہوتا- مر کر زندگی کو ایک اور مہمیز لگا جاتا ہے- نظریہء جبر کے مارے اور (Might is Right) "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے قائل لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جاندار اشیاء کی موت ان کی اپنی نوع کی بقاء کی ضامن ہے- مسلمان ہر سال لاکھوں بکرے ذبح کر دیتے ہیں- لیکن اگلے سال اس سے دگنے بکرے پھر موجود ہوتے ہیں- کیا بکروں کی بقاء یہ تھی کہ وہ زمین پر کم تعداد میں بے شک ہوتے لیکن ذبح نہ کیے جاتے یا یہ ہے کہ ان کی نسل کو ابد الآباد تک کی زندگی عطا کر دی گئی اور اس کے

بدلے میں انہیں اپنے لہو کا نذرانہ دینا پڑا۔ بقول اقبالؒ

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

یا یہ کہ

صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

کیا یہ بے وقوفی نہ ہوگی کہ قربانی نہ دی جائے اور فنا ہونا قبول کر لیا جائے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ جان دے دی جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لی جائے۔ اس نظریے کا اطلاق اگرچہ جانوروں پر محض اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ جب قربانی دیتے ہیں تو ان کی نسل کو دوام ملتا ہے۔ جیسے شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔ لیکن انسانوں میں جان کی قربانی اس سے بھی ارفع مقاصد کے لیے مختص ہے۔ انسان جان کا نذرانہ دے کر محض اس دنیا میں ہی اپنی نسل کو دوام نہیں بخشتا بلکہ اپنے لیے مرنے کے بعد بھی ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک لمحے کو ٹھہریے! یاد رہے کہ ان خیالات کو تمکن فی الارض (Survival of the fittest) کا نظریہ نہ سمجھ لیا جائے۔ ایک لطیف سا فرق جو ان خیالات اور نظریہ تمکن فی الارض کے درمیان بعد المشرقین ڈال دیتا ہے۔ ہے کہ کسی کو مار کر زندہ رہنا اور بات ہے اس کے برعکس خود مر کر زندہ رہنا اور بات ہے۔ ''نظریہء تمکن فی الارض'' یہ ہے کہ جو طاقت ور ہے وہ زندہ رہے گا اور نظریہء دوام یہ ہے کہ جو جان کا نذرانہ دے گا وہ زندہ رہے گا۔ بظاہر ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے مسلمانوں کی ''عیدالضحیٰ'' پر بکروں کی قربانی کی مثال دی ہے۔ لاکھوں بکرے ہر سال قربان ہوتے ہیں لیکن ان کی نسل فنا نہیں ہوتی بلکہ ان کو ذبح کرنے والا انسان خود ان کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کا بندوبست کرتا ہے اور یوں قدرت نے انہیں ان کی ایک دائمی زندگی بخش دی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ درخت اپنے پھلوں کا نذرانہ دے کر اپنے ایک ایک پھل سے کئی کئی نئے درخت پیدا کرنے کا اہتمام کر لیتا ہے۔ اس نظریے کو ''طاقت'' کا نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اسے کائنات کا انتہائی مثبت اور تعمیری پہلو سمجھا جانا چاہیے۔ ہر نوع میں یہ نظام پایا جاتا ہے کہ اس کے افراد جتنے جان دیتے ہیں وہ نوع اس سے ہزاروں گنا بڑھ کر انڈے پیدا کرتی ہے۔ یہی ہے قرآن کا ایک کے بدلے سات سو عطا کرنے کا نظریہ۔ گندم کا ایک دانہ اپنے تنے پر سات سو سے زیادہ دانوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک مثبت عمل کے سات سو پھل

ہیں۔ گندم کا وہ دانہ جو مٹی میں مل کر معدوم ہو گیا۔ سات سو سے زیادہ دانوں کی صورت میں دنیا میں دوبارہ پیدا ہوا۔ کیا اسے طاقت کا نظریہ کہا جائے گا۔ یہ طاقت کا نہیں ایثار کا قدرتی نظریہ ہے۔

زمین پر بسنے والا ہر ذی روح زندہ رہنے کا حقدار ہے۔ لیکن اس کو زندہ رکھنے کے لیے قدرت نے یہ نظریہء ایثار عطا کر کے بقائے حیات کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہ تھا۔

لہٰذا زندہ اشیاء کے بنیادی حقوق میں سے سب سے زیادہ اہمیت ''حق موت'' کی ہے۔

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

قرآن حکیم میں ہے ''خلق الموت و الحیات --- موت و حیات کو تخلیق کیا گیا۔'' موت و حیات دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔ زندہ رہنا ضروری ہے تو مرنا بھی بہت ضروری ہے۔ چنانچہ زندہ رہنا بھی ہر جاندار کا بنیادی حق ہے اور مرنا بھی بنیادی حق۔ زندہ رہنے کا حق چھین لیا جائے تو بھی ظلم ہے۔ اسی طرح موت کو فنا کر دیا جائے تو بھی جاندار اشیاء کے ساتھ زیادتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان میں آکسیجن (O_2) پانی (H_2O) خوراک اور عمل تناسل شامل ہیں اور موت کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان میں بقائے دائمی حاصل کرنے کا جذبہ ایثار، جستجو اور جنون کی ضرورت ہے۔ گویا جن چیزوں کی ضرورت زندہ رہنے کے لیے ہے۔ وہ آرام، راحت اور سکون بخش ہیں اور مرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ متحرک کر دینے والی اور آگے سے آگے بڑھانے والی ہیں۔ بقول اقبالؒ ''زندگی ایک جوئے رواں ہے جو آگے سے آگے بہتی چلی جا رہی ہے۔'' ہر نئی نسل پچھلی نسل سے زیادہ زندگی کی آب و تاب لیے ہوتی ہے۔

زمین پر بسنے والی ذی روح مخلوقات سب کی سب زمین کے ہر انعام کی برابر برابر مستحق ہیں۔ وہ انعام جنم لینا بھی ہے۔ اچھل کود کر زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی۔ انواع و اقسام کے ذائقے چکھ کر زندگی کے مزے اڑانا بھی اور اپنی نسل بڑھانے کے لیے جنسی ملاپ کرنا بھی نئی نسل کے روپ میں دوبارہ ظہور پذیر ہونا بھی، مر کر لذت وصال کا ذائقہ چکھنا بھی۔ یہ سب زمین پر بسنے والی مخلوقات کے بنیادی حقوق ہیں اور کسی مخلوق کا حق سلب کرنے کی اجازت کسی دوسری مخلوق کو

نہیں دی جا سکتی- یہ جو انسان تمام جانداروں سے فائدے اٹھاتا ہے- تو یہ حقیقت میں انسان کی زیادتی نہیں بلکہ ان مخلوقات کی خوش بختی ہے- جو انسان کے ہاتھوں استعمال ہوتی ہیں-

معراج حیات

درخت پہ پھل پکتا ہے اور شاخ کے ساتھ لٹکا ہوا بڑا حسین دکھائی دیتا ہے- لیکن ایک ہاتھ آتا ہے جو اسے شاخ سے توڑ لیتا ہے- کیا یہ ظلم ہے؟ نہیں! یہ درخت کی زندگی کا معراج ہے- کیونکہ اس پھل کو قدرت نے ذائقہ ہی اس لیے بخشا ہے کہ دوسری مخلوقات کے دل میں اسے توڑنے کی تحریک پیدا ہو- تاکہ وہ اسے توڑیں اور اس کے پیٹ میں موجود بیج زمین پر بکھر جائے اور اس بیج سے نئے درخت پیدا ہوں- گویا بیج کا مٹی میں مل جانا بیج کی معراج ہے- جب بھی کوئی زندہ چیز اپنی زندگی کے معراج کو پہنچتی ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے- بھیڑیے کے منہ میں آنے والی بھیڑ اپنی زندگی کے معراج کو پہنچتی ہے اور بلی کے پنجوں میں جان دینے والا چوہا اپنا مقصد حیات پالیتا ہے- انسان کے ہاتھوں استعمال ہونے والی مخلوقات ظلم کا شکار نہیں ہوتیں- بلکہ اپنی زندگی کا مقصد اصلی گویا معراج حیات حاصل کر لیتی ہے- گھوڑا خالی پیٹھ خوشی سے نہیں اتراتا- لیکن جب اس کی پیٹھ پر انسان سوار ہو جاتا ہے- تو وہ اٹھلاتے ہوئے مور کی طرح پیلیں ڈالنے لگتا ہے- مرغی انڈا دے کر نکلتی ہے تو اپنی خوشی سے گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کرتی ہے کہ اس نے کارنامہ سرانجام دیا ہے- اس کا انڈا اٹھا لیا جائے تاکہ وہ اپنے معراج تک پہنچے- انسان کے ہاتھوں ذبح ہونے والے جانور ظلم کا شکار نہیں ہوتے بلکہ یہی ان کا زندگی گزارنے کا طبعی طریقہ ہے اور یوں ہی وہ اپنے مقصد حیات کو حاصل کرتے ہیں- یہ تمام مخلوقات انسان کے حضور سربسجود کروائی گئی ہیں- انسان کی اطاعت ہی ان کا فریضہ حیات ہے اور انسان جسے یہ تمام نعمتیں وافر مقدار میں عطا کی گئی ہیں- ان کے عوض اپنا معراج حیات حاصل کرنے کا پابند ہے- انسان جسے کسی دوسری مخلوق کی اطاعت کا فریضہ نہیں سونپا گیا اپنا مقصد زندگی کیسے حاصل کرے گا- انسان جسے الوہیاتی توانائی بخشی گئی ہے- عقل و شعور کی دولت عطا کی گئی ہے- کرۂ زمین پر چلتے ہوئے اس خودکار نظام میں ایک طرح کی مصنوعی تیزی پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے- اقبال نے کہا ہے۔

فطرت نہیں ہے اگرچہ بے ذوق
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

انسان جب اپنی زیر نگیں سلطنت کو اپنے استعمال میں لائے گا- اپنے حضور سجدہ ریز ملائکہ کو استعمال کر کے حیات نو فراہم کرے گا تو اس طرح وہ فطرت کے منصوبوں کی تیزی سے تکمیل کا باعث بن جائے گا- لیکن اسے عقل دی گئی ہے اور وہ ان اشیاء کا استعمال خودکار اطاعت کے سے انداز میں نہیں کرے گا- بلکہ اس کا ہر عمل اس کی ذاتی مرضی اور بے پناہ اختیارات کے تحت روپذیر ہوگا- باقی مخلوقات اس کی پابند ہیں- لیکن وہ کسی مخلوق کا پابند نہیں- وہ صرف اس نظام کا پابند ہے جو خالق کائنات نے اسے وحی کے ذریعے عطا فرمایا اور اس کے فرائض سرانجام دینے میں اسے بااختیار کر دیا- وہ جب اپنے فرائض...... عقل کو استعمال کرتے ہوئے دل و جان سے صحیح صحیح سرانجام دے گا- کائنات میں توازن قائم کرنے کا باعث ہوگا جس کے نتیجے میں کرۂ زمین پر ایک ایسی جنت تخلیق ہوگی جو اس جنت سے لاکھوں گنا خوبصورت اور دلکش ہے جس جنت سے انسان کو نکالا گیا-

افزائش نسل ایک ضرورت

افزائش نسل ہر مخلوق کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے- ہر مخلوق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نسل کو جتنا چاہے بڑھائے- لیکن انسانی معاشرے میں عقل کے غلط استعمال سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ارباب اختیار نے اہل دنیا کو گزشتہ کئی برس سے نسل کم بڑھانے کا حکم دے رکھا ہے- گویا انسان کا یہ بنیادی حق چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے- ہر طرف یہ شور ہے کہ بچے کم پیدا کیے جائیں کیونکہ ارباب اختیار کو یہ خطرہ ہے کہ کرہ ارض پر پیدا ہونے والا رزق انسانوں کے لیے کم پڑ جائے گا- حالانکہ ایسا نہیں ہے- اللہ نے زمین پر انسان سمیت جو جاندار اشیاء پیدا کی ہیں ان کے رزق کا بھی اہتمام کیا ہے- قرآن حکیم میں ہے-

" نحن نرزقکم" ہم تمہیں رزق دیتے ہیں-

رزق کی پیداوار انسان کی ذمہ داری نہیں بلکہ خالق فطرت کی ذمہ داری ہے- حتی کہ خالق

فطرت نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ وہ جس کو بھی رزق دیتا ہے بغیر حساب کے دیتا ہے- قرآن حکیم میں ہے-

واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب o

اور پھر فیملی پلاننگ کے ذریعے قتل کیے جانے والے بچوں کے بارے میں قرآن کا یہ حکم موجود ہے-

ولا تقتلوا اولاد کم من خشیۃ املاک o

اور رزق کے کم ہو جانے کے ڈر کی وجہ سے اپنی اولادوں کو قتل مت کرو-

افزائش نسل انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور انسان کے ذمہ زمین پر پیدا کرنے کے بعد جو کام لگائے گئے ہیں ان میں ایک اہم ترین فریضہ نسل پیدا کرنا ہے- جو لوگ ایسا نہیں کرتے یا مختلف طریقوں سے اپنی نسل کو روکتے ہیں- نہ صرف یہ کہ غیر فطری کام کرتے ہیں بلکہ اہل زمین کا بہت زیادہ نقصان بھی کرتے ہیں- حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زمین کے نام نہاد مالکوں نے مخلوقات کا رزق چھین کر اپنی تجوریاں بھر رکھی ہیں اور اسی وجہ سے اہل زمین کو رزق کے کم ہو جانے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے- اگر ان کی تجوریاں اور گودام خالی کر کے اہل زمین میں برابر بانٹ دیے جائیں تو کسی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں- آبادی کے مسئلہ کو نئے شہر بسا کر حل کیا جا سکتا ہے اور بنجر زمینوں کو مفلوک الحال انسانوں میں بانٹ کر برابری کی فضا قائم کی جا سکتی ہے- نسل بڑھانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ زمین کو بسانے والوں میں نئے نئے ذہنوں کا اضافہ کیا جا سکے- تاکہ کارخانہ قدرت کو انسانی ذہن کی مہمیز لگا کر صبا رفتار بنایا جا سکے- افسوس کی بات یہ ہے کہ حیوانات' چرند پرند' درندے' حشرات الارض حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں تک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نسل بڑھائیں- لیکن انسان پر بے وقوف حکمرانوں کی غلطیوں کی وجہ سے یہ قدغن لگا دی گئی ہے کہ وہ بچے پیدا نہ کریں- بچے پیدا کرنا ایسا فریضہ ہے کہ اس سے معمولی سی پہلو تہی بھی جرم تصور کی جانی چاہیے- اس ضمن میں ''زمرمان'' اور ''سروینٹس'' نے اپنی تصنیف ''شادی اور خاندان'' میں نہایت صحیح لکھا ہے- اس کے الفاظ یہ ہیں کہ......

''طفل کشی' برتھ کنٹرول اور ہم جنس پرستی میں قریبی تعلق ہے- ایسا تعلق جو کسی معاشرے کی ابتدائی خواہش مرگ کا اعلان ہے- اس موقف سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی معاشرے میں عورت کو جنسی شئے کے طور پر رد کیا جاتا ہے تو وہ معاشرہ نفسیاتی اور حیاتیاتی سطح پر خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے-''

میرا بھی یہی خیال ہے یعنی اہل یورپ کا ہم جنس پرستی' جانوروں سے اختلاط اور دیگر شہوانی برائیوں میں مبتلا ہو جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ ''زن بیزار'' ہو چکے ہیں اور یہ بھی ایک طرح سے برتھ کنٹرول یا طفل کشی ہی کی مثال ہے- اہل مغرب کی یہ غیر فطری روش بھی ان کے منجمد عقائد کے بطن سے نمودار ہوئی ہے- کیونکہ عیسائیت ''زن بیزاری کا'' جو درس دیتی ہے- یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مجموعی طور پر عیسائی دنیا انتہا درجے کی بڑھی ہوئی ہم جنس پرستی کا شکار ہے- حالانکہ افزائش نسل جو انسان کی بنیادی فطری ضرورت ہے عورت کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں- اسلام نے عورت سے بیزاری کا درس نہیں دیا- بلکہ عورت کو مرد کا وہ جیون ساتھی کہا ہے جس کی معیت میں انسان...... انسانی معاشرے کو جنت نظیر بنا سکتا ہے- قرآن کریم میں ہے کہ

''اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں جیسے چاہو کھاؤ پیو-'' (البقرہ-۳۵)

پھر کہا......

''اہل ایمان کے لیے جنت میں پاک صاف بیویاں ہوں گی-'' (البقرہ ۲۵)

اسلام صرف اور صرف عورت کے ساتھ جوڑا بنانے کی اجازت دیتا ہے- اس کے برعکس عیسائیت عورت سے دور رہنے کا مشورہ دیتی ہے- عیسائیوں کے مذہبی پیشوا انجیل کے حوالے سے انسانوں کو عورت سے دور رہنے کا حکم دیتے ہیں- بائبل میں ہے کہ

''مرد کے لیے عورت کو نہ چھونا خیر ہے-'' (بائبل اکورنتھی ۱۲:۷)

یہی نہیں عیسائی علماء حضرت عیسیٰؑ کو زن بیزار انسان کے طور پر متعارف کرواتے ہیں- ان کی یہ شدید زن بیزاری دو ہزار سال بعد تھامس براؤن میں عود کر آئی ہے- وہ لکھتا ہے......

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں جنسی اختلاط کے بغیر ہی...... درختوں کی طرح بار آوری کرنی ہوگی یا اس گھٹیا اور بے ہودہ طرز وصال کے بغیر ہی دنیا کو جاری رکھنے کا کوئی (۱۰۴)

عورت، ابلیس اور خدا

راستہ تلاش کرنا ہوگا-"

عیسائیت اور اسلام کا یہ فرق دراصل ان کے بنیادی فلسفے کی بدولت ہے- اسلام زمین کو جنت بنانے کا آرزو مند ہے- جبکہ عیسائیت کرۂ زمین کو دارالعذاب شمار کرتی ہے- چنانچہ وہ لوگ جو انسان کو تجرد کا مشورہ دیتے ہیں- حقیقت میں جنسی بے راہ روی کا مشورہ دیتے ہیں- اسی طرح جو لوگ برتھ کنٹرول یا فیملی پلاننگ کا مشورہ دیتے ہیں- وہ بھی دراصل جنسی بے راہ روی کا مشورہ دیتے ہیں-

لیکن یہاں ایک مسئلے کی وضاحت بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ کیا جانوروں کی طرح اندھا دھند اولاد کی بھیڑ لگا دی جائے؟ یا احتیاط کے ساتھ سوچ سمجھ کر ایسے بچے پیدا کیے جائیں جن کی انسانی خطوط پر تربیت کی جا سکے- بات یہ ہے کہ دنیا کی آبادی میں اس وقت اکثریت ان لوگوں کی ہے جو جانوروں کی طرح اندھا دھند اولاد پیدا کرنے کے قائل ہیں- تو کیا اس کا یہ طریقہ ہے کہ ان کو اولاد پیدا کرنے سے روک دیا جائے' نہیں یہ طریقہ غلط ہے- وہ لوگ جو ہزاروں سال سے اسی طرح اولاد پیدا کرتے آ رہے ہیں اور جب تک نظام نہیں بدلتا اسی طرح پیدا کرتے رہیں گے تو پھر کوشش کے باوجود بھی ان کو اولاد پیدا کرنے سے روکا نہیں جا سکتا- لیکن فرض کر لیں کہ اگر یہ سیانے لوگ انہیں روک بھی لیں تو کیا دنیا کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ قطعاً نہیں- الٹا انتہائی موذی بیماریاں پیدا ہوں گی اور زمین پر جو تھوڑے سے بچے کھچے انسان رہ جائیں گے- ذہنی طور پر کمزور' لاغر' بیمار اور سست الوجود ہوں گے- ہاں اگر دیہاتیوں کی طرح دھڑا دھڑ بچے پیدا ہوتے رہیں اور قدرتی انتخاب کی چھلنی سے گزرتے رہیں تو یہ پھر بھی اولاد روکنے والوں کے فیملی پلان سے بہتر ہے- لیکن دیکھا جائے تو یہ دونوں باتیں دو انتہائیں ہیں- جس بھی انتہا پر دباؤ بڑھے گا توازن بگڑ جائے گا- جبکہ اس مسئلے کے حل کے لیے وحی کی ابدی ہدایت موجود ہے-

اسلام کا نظریۂ عفت وعصمت

"طلوع اسلام" کے بانی "غلام احمد پرویز" صاحب نے اپنی کتابوں میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر "جے ڈی انون" کی ایک کتاب "سیکس اینڈ کلچر" کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور بعض

اقتباسات دیے ہیں- "پرویز صاحب" اس کتاب کی تعریف و توصیف میں بہت زیادہ رطب اللسان ہیں- ہمیں بہت زیادہ تلاش کے باوجود بھی یہ کتاب نہیں مل سکی- لہٰذا ہم نے پرویز صاحب کے پیش کردہ اقتباسات کا ہی سہارا لیا ہے تاکہ کسی حد تک اپنا مؤقف واضح کر سکیں- پرویز صاحب کے بقول ڈاکٹر انون نے دنیا میں مختلف حصوں میں بسنے والے ۸۰ غیر مہذب قدیم قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے- اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اپنے نتائج کو اپنی کتاب "سیکس اینڈ کلچر" میں پیش کیا ہے- اس کتاب کا پہلا جملہ یہ ہے کہ

> "دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے- اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تحقیق کی جائے-"

اسی موضوع پر ایک کتاب "پیٹرنز آف کلچر" (Patterns of Culture) مشہور امریکی ماہر نفسیات "رتھ بینی ڈکٹ" کی لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود ہے- ہم نے زیر نظر کتاب کے باب "قدیم اقوام کے ابلیسی مذاہب" میں اس سے مدد لی ہے- "رتھ بینی ڈکٹ" اور ڈاکٹر انون کے نتائج تقریباً ایک جیسے ہیں- ڈاکٹر انون اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

> "اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے- ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسری وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بناء پر حاصل ہوتی ہے- جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں-"

اسی کلیہ کو ڈاکٹر انون نے اصل کتاب میں یوں بیان کیا ہے-

> "کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مقرر کیے-"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یوں رقم طراز ہیں-

''اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گرگئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر انون اپنے نتائج کو مزید وضاحت سے یوں بیان کرتے ہیں۔

''جس گروہ نے کنوارپن کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھا۔ جن قبائل میں زمانہء قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں تمدنی سطح کے درمیانی درجہ پر تھے۔ تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت بکارت کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہء قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک شادی سے پہلے زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے اور ان کے رشتہء نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے تو شادی کا یہ طریقہ ''مطلق وحدت زوج'' کہلاتا ہے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے جسے ''ترمیم شدہ وحدت زوج'' کہا جاتا ہے...... کہ رشتہء نکاح عمر بھر کے لیے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ شادی کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی رہے۔ لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس طریقے کا نام ''مطلق تعدد ازواج'' ہے۔ ایک چوتھا طریقہ بھی اقوام عالم میں رائج ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مرد دوسری عورتوں سے تعلق قائم کرے تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔''

ڈاکٹر انون کے یہ نتائج جو انتہائی عرق ریزی سے اخذ کیے گئے ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیقات کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں تمدن کے حوالے سے وہی قوم سرفراز رہ سکتی ہے جس میں شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلق اجازت نہیں ہوتی اور شادی کے بعد فریقین

کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہنا چاہیں تو الگ ہو جائیں۔ گویا جنسی تعلق صرف اور صرف میاں بیوی کے رشتے میں موجود رہے۔ ڈاکٹر انون کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے اسلامی تہذیب بھی گزری۔ کیونکہ مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم میں جنسی تعلقات قائم کرنے کے لیے جو ہدایات موجود ہیں وہ بھی شادی سے پہلے لڑکی اور لڑکے دونوں کو عفت اور عصمت کے تحفظ کا حکم دیتی ہیں۔ ''خطبہء حجتہ الوداع'' میں نبی کریمؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تمہاری عورتوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ باحیا ہوں۔ اسی طرح قرآن حکیم میں ہے کہ

''ھن لباس لکم و انتم لباس لھن''

تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اپنی عورتوں کا لباس ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ

''والحفظین فروجھم والحفظت مغفرۃ اجراً عظیماo

اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔''

اسی طرح کی بے شمار آیات قرآن حکیم میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ جن میں انسانوں کو عفت و عصمت کے محفوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن نے جنسی جرم کے لیے زنا کا لفظ استعمال کیا ہے اور زنا کو بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم نے کہیں بھی عیسائیوں یا ہندوؤں کی طرح شادی کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے برعکس قرآن حکیم نے شادی کرنے اور اولاد پیدا کرنے کے عمل کو انسانی معاشرے کی زینت قرار دیتا ہے۔

''زین للناس حب الشھوات من النساء البنینo''

انسانوں کے لیے زینت ہے شہوات کی محبت عورتوں اور بچوں سے۔''

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''النکاح سنتی'' نکاح میری سنت ہے۔''

لہٰذا قرآن حکیم نے اعتدال کی راہ بتائی ہے اور وہ یہ کہ شادی ضرور کرو، بچے ضرور پیدا کرو، لیکن عفت و عصمت کا دامن نہ چھوڑو۔

ڈاکٹر انون کی تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر عفت وعصمت کو محفوظ رکھ کر جنسی تعلقات بذریعہ شادی قائم کیے جائیں تو انسانی تمدن مثالی بن سکتا ہے۔ بصورت دیگر "حد سے گزرنے والوں" پر بقول قرآن .....اللہ تعالیٰ لعنت اور تباہی کے پتھر برساتا ہے۔ گویا معاشرہ اور تمدن فنا ہو جاتا ہے۔

زنا کی حقیقت

ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ قرآن حکیم نے ناجائز تعلقات کو زنا کے نام سے پکارا ہے۔ جنسی تعلقات کی خواہش چونکہ انسانی فطرت ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہود و ہنود کے مذاہب کی طرح انسان پر کوئی ایسی پابندی نہ لگائی جائے جو خلاف فطرت ہو۔ قرآن نے "فانکحوا" کے الفاظ استعمال کر کے شادیاں کرنے کا باقاعدہ حکم دیا ہے اور اس عفت و عصمت کی قرآنی ہدایت پر عمل نہ کرنے والوں کو "اثاما" کہا ہے۔ یعنی جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔ "اثاما" یا "اثم" کا لفظ قرآن میں گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک آیت میں ہے۔

"ان بعض الظن اثم" بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

ملاحظہ کیجیے! ایک طرف گمان جیسی عام چیز کو بھی گناہ کہا دوسری طرف زنا جیسی بڑی چیز کو بھی۔ اثم یعنی گناہ کہا۔ اللہ رب العزت کو معلوم تھا کہ انسان کے لیے اپنی فطرت پر کنٹرول کسی قدر وقت طلب ضرور گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زنا کے جرم کو ان جرائم جیسا سنگین نہیں بتایا جن کا انسان اپنی جھوٹی انا اور غیر فطری خواہشات کے لیے ارتکاب کرتا ہے۔ مثلاً غیبت کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ اسے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر بتایا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کو بھی انتہائی سخت جرم کہتے ہوئے قرآن نے کاذبین کے لیے عذاب الیم کی خبر سنائی ہے۔ لیکن ان کے برعکس زنا کو "اثم" کہا ہے اور اس کی سزا سو کوڑے بتائی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

"الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة"

"زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو"

اور یہ سزا بھی انسانی عدالت کے ذمے لگائی گئی ہے جبکہ جھوٹ اور غیبت کی سزا اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے رکھی ہے۔ ظاہر ہے انسانی سزا کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی سزا زیادہ دردناک ہے۔ اس کے برعکس جن مذاہب نے جنسی تعلقات پر بے اعتدالی کی حد تک بڑھی ہوئی پابندیاں عائد کی ہیں۔ مثلاً "بائبل" یا "ہندومت" میں جنسی خواہش پوری نہ کرنے کو اچھا بتایا گیا ہے۔ تو ان مذاہب نے سزائیں بھی انتہائی سخت اور غیر فطری عائد کی ہیں۔ مثلاً بائبل میں ہے کہ بدکاری کرنے والی عورت کو پتھروں سے سنگسار کیا جائے۔

"اور یسوع کے پاس ایک بدکاری کرنے والی عورت کو لایا گیا اور یسوع نے کہا کہ تم میں سب سے پہلے وہ پتھر مارے جس نے خود گناہ نہیں کیا اور یہ سن کر وہ سب لوگ چلے گئے اور یسوع نے بھی اسے معاف کر دیا اور کہا کہ آئندہ ایسا مت کرنا۔"
انجیل

حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے اہل بائبل کو سمجھ جانا چاہئے تھا کہ زنا کا گناہ ہر انسان سے سرزد ہو سکتا ہے اور انہیں چاہیے تھا کہ وہ اس سے یہ نتیجہ مستنبط کرتے کہ زانی اور زانیہ کو سنگسار نہ کیا جائے۔ انہوں نے اس کے برعکس وہی پرانا حکم نافذ رکھا۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے اسلام کے ساتھ کی جانے والی دوسری شرارتوں کے ساتھ اپنا یہ غیر فطری حکم بھی اسلامی کتب احادیث میں کسی نہ کسی طرح داخل کر دیا۔ قرآن کی تجویز کردہ سزا کے ہوتے ہوئے کسی حدیث سے اخذ کردہ سزا نافذ نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ قرآن کا حکم بہرحال ہر کسی کے حکم پر فوقیت رکھتا ہے۔ قرآن نے انسان کی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے زنا کی سزا تجویز کی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن نے انسان کو جنسی تعلقات قائم کرنے کی رعایتیں دی ہیں۔ دراصل قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ اخلاقی جرائم اور معاشرتی جرائم کو الگ الگ طریقے سے ڈیل کرتا ہے۔ جھوٹ یا غیبت اخلاقی جرائم ہیں جبکہ زنا ایک ایسا معاشرتی جرم ہے جس کی بدولت معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ قرآن نے اسلامی عدالتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایسے مجرموں کو سو کوڑے ماریں تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت حاصل ہو اور کوڑے کھانے والوں کو ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس طرح انسان کو سب کی نظروں میں گرانے سے اور

شرمندہ کرنے سے قرآن کا یہ مقصد ہے کہ وہ آئندہ کے لیے اس قسم کا گناہ نہ کرے۔ سنگسار ہونے والے زانی یا زانیہ میں سے ۹۹ فیصد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اسلام میں سزائے موت صرف قاتل کے لیے ہے۔ لہٰذا سنگسار کی سزا جو بعض احادیث سے بھی ثابت ہے قرآن کی واضح اور روشن آیت

"الزنیة والزانی فاجلدو اکل واحد منهما مائة جلدة"

"زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو" کی رو سے غیر قرآنی ہے۔ لہٰذا فقیہان ملت کو یہ چاہیے کہ وہ قرآن کی اس زندہ و جاوید آیت کو مردہ تصور کرنے کا جرم نہ کریں۔

جنسی لذت قدرت کا تحفہ

زنا کے عادی افراد اس لذت سے بے خبر ہیں جو حیاداری کے دائرے میں رہتے ہوئے خالص انسانی طریقے سے جماع یا مباشرت کرنے میں پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں جنسی لذت اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ وہ شوق سے اولاد پیدا کرنے کے عمل میں دلچسپی لیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح درخت کے پھل میں ذائقہ رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس کو کھانے کا شوق درخت کے عمل تناسل کا باعث بنے۔ اگر جنسی عمل میں لذت نہ ہوتی تو ہر کوئی اس کام سے اکتاہٹ اور بوریت کی وجہ سے زیادہ تر اجتناب کرتا۔ نتیجتاً نسلیں آگے نہ بڑھ سکتیں۔ چنانچہ اس عقیدے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جنسی لذت قدرت کا تحفہ ہے۔ قدرت کے اس عطیے کی بدولت انسان اپنی نسل کو آگے بڑھاتا ہے اور زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن اس تحفے کا ناجائز استعمال جو صرف انسان کرتے ہیں۔ اس وقت روئے زمین کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ جنسی لذت حاصل کرنے کے لیے بے شمار مصنوعی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں اور دنیا بھر کا میڈیا اسی لذت کے حصول کے لیے طرح طرح کے فحش اور غلیظ پروگرام پیش کرنے پر لگا ہوا ہے۔ جنسی لذت کا یہی غلط استعمال تھا جو ماضی کی اقوام کی تباہی کا باعث بنا اور جنہیں اللہ نے مخاطب کر کے کہا تھا۔

بل انتم قوم" مسرفون ٥

بلکہ تم حد سے گزرنے والے ہو۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر دنیا کو خالق کائنات کی عطا کردہ اس اخلاقیات کی طرف مائل کریں جس کے نتیجہ میں اس لذت سے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

جنسی لذت کا معراج وقت انزال ہے۔ جب جسم سے مادۂ منویہ خارج ہوتا ہے تو ریڑھ کی ہڈی سمیت پورے بدن میں انتہائی مختصر وقت کے لیے ایک بے پناہ قسم کی تسکین اور سرور محسوس ہوتا ہے۔ یہ لذت انسان کے لیے اتنی من پسند ہے کہ باقی کسی حس کو ملنے والی لذت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اگر میٹھے پھل سے لطف اندوز ہونا یا خوبصورت منظر سے فرحت حاصل کرنا عطیہ خداوندی ہو سکتا ہے تو بدنی طور پر انزال کی لذت حاصل کرنا بھی عطیہ خداوندی ہی ہے۔ لیکن جس طرح ایک ہی پھل کا بار بار حد سے زیادہ استعمال کم لذیذ اور ضرر رساں ہے اسی طرح شہوت کا ناجائز استعمال بھی کم لذیذ اور ضرر رساں ہے۔

عورتوں اور مردوں کے جنسی حقوق

قرآن حکیم میں ہے کہ

"نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انیٰ شئتم"

"تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں انہیں جب چاہو کھیتیوں کی طرح استعمال کرو"

کھیتیوں کی طرح استعمال کرنے کی ہدایت ہی صاف بتا رہی ہے کہ عورت اور مرد کو بلاضرورت اور بے وقت جنسی ملاپ کا عادی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ کھیتی میں بیج ڈالنے کا ایک وقت ہے۔ پھر فصل پکنے اور کٹنے کا بھی ایک مخصوص وقت ہے۔ مردوں کو چاہیے کہ وہ شادی ضرور کریں ایک سے زیادہ کر سکتے ہیں تو ایک سے زیادہ کریں۔ دو کر لیں، تین کر لیں یا چار کر لیں۔ بشرطیکہ ان میں اپنی بیویوں کے درمیان عدل کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی اہلیت ہو۔ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ مذکورہ آیت کی روشنی میں دوران حمل ہم بستری نہ کریں اور ہم بستری جب بھی کریں نیک اور صالح اولاد کی نیت اور غرض سے کریں۔ اسلام نے عورتوں کو بھی جنسی حقوق دیئے ہیں۔ کیونکہ فطرت بھی انہیں جنسی حقوق عطا کرتی ہے۔ عورت کو چاہیے کہ وہ رشتۂ ازدواج میں بندھے جانے سے پہلے اپنے پردۂ بکارت کی حفاظت کرے تاکہ معاشرے میں بگاڑ پیدا نہ ہو اور اپنے شوہر کے

ساتھ جس کے ساتھ شادی سے پہلے ذہنی ہم آہنگی ہونے کی تسلی کرلی جائے، وفادار رہیں- عورت کے لیے نو ماہ تک حمل اٹھائے رہنے کا عمل- پھر دو سال تک بچے کو دودھ پلانے کا عمل قدرت کی طرف سے اس کے لیے صرف ایک شوہر رکھنے کا ثبوت ہے- کیونکہ یہ تینتیس ماہ کا عرصہ جو ایک طویل عرصہ ہے اسے ایک ہی مرد کے بچے کو سنبھالنے کے لیے دیا گیا ہے- حمل سے پہلے عورت کو بھی بھرپور حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ اولاد پیدا کرنے کے لیے جنسی ملاپ کرے اور لطف اندوز بھی ہو...... تاکہ وہ قدرت کا عطیہ یعنی عارضی جنسی لذت سے بھی سرشار ہو اور معاشرے کو نئی نسل دینے کا اہتمام بھی کرے-

ہیجڑوں کے جنسی حقوق

یہ سوال اپنی نوعیت کا انتہائی منفرد، بحثیں پیدا کرنے والا اور اچھوتا سوال ہے- ہیجڑے جو نہ مرد ہوتے ہیں اور نہ عورت- جنہیں مخنث بھی کہا جاتا ہے- کیا جنسی حقوق رکھتے ہیں؟ اور اگر نہیں تو کیا یہ ان کی حق تلفی نہیں کہ مرد اور عورت کو تو انزال کی عظیم ترین لذت دنیا میں بخشی جائے اور ان کو محروم رکھا جائے- لیکن اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہے تو پھر ان کے لیے کون سا ذریعہ ہے کہ وہ اس لذت سے لطف اندوز ہوں- جبکہ ان کے پاس وہ جنسی اعضاء بھی نہیں ہیں جو انہیں انزال کی لذت فراہم کرسکیں- ان اعضا کا نہ ہونا حقیقت میں تو "معذوری" ہے- بالکل اسی طرح جس طرح بعض لوگ ہاتھ، پیر، کان یا آنکھ سے معذور ہوتے ہیں- بالکل اسی طرح ہیجڑوں کو جو جنسی اعضاء سے محروم ہیں معذور ہی کہا جائے گا- وہ نہ مرد ہوتے ہیں اور نہ عورت- ہیجڑوں کی دو قسمیں زیادہ تر دیکھنے میں آتی ہیں اور تحقیق بھی یہ بتاتی ہے- ایک قسم وہ ہے جس میں ہیجڑا جسمانی ساخت کے لحاظ سے ماسوائے جنسی عضو کے...... مردوں جیسا ہوتا ہے- اس کا قد کاٹھ مردوں کی طرح ہوتا ہے- بھاری بھرکم وجود اور بھاری آواز اور اس میں کام کرنے کی صلاحیت بھی مردوں جیسی ہوتی ہے- بلکہ رتھ بنی ڈکٹ کی تحقیق کے مطابق ان میں کام کرنے کی صلاحیت مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے- اس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل کے ہاں مخنثوں کو ایسے افراد قرار دیا جاتا ہے جو خصوصی

طور پر ذہین اور قابل ہوتے ہیں- وہ دراصل جسمانی اور ذہنی لحاظ سے بڑے قوی ہوتے ہیں- کچھ عرصہ قبل قبیلہ زونی کا سب سے معروف برداشی (ہیجڑہ) اس کے اپنے دوست مسٹر سیٹونس کے بقول قبیلہ زونی کا سب سے قوی شخص تھا- ذہنی لحاظ سے بھی اور جسمانی لحاظ سے بھی (۱۰۵)-"

اس مردوں سے ملتے جلتے ہیجڑے کی رانوں کے درمیان مردانہ عضو تناسل نہیں ہوتا- بلکہ وہاں ایک چنے کے دانے سے لے کر آدھ انچ کی لمبائی کا حامل ایک چھوٹا سا عضو ہوتا ہے- جسے چھوٹی پیشاب کے لیے استعمال کرتا ہے- اس کے سینے اور کندھوں پر مردوں کی طرح بال ہوتے ہیں اور چہرے پر داڑھی اور مونچھیں بھی اگتی ہیں-

دوسری قسم ان ہیجڑوں کی ہے جو عورتوں سے مماثل ہوتے ہیں- ان کا جسم عورتوں کی طرح نرم و نازک اور لچکدار ہوتا ہے- ان کے چہرے پر داڑھی مونچھیں نہیں آتیں- سینے پر چھوٹے چھوٹے پستان ابھر آتے ہیں- البتہ ان کی رانوں کے درمیان عورتوں جیسی اندام نہانی نہیں پائی جاتی- وہاں صرف ایک سوراخ ہوتا ہے کسی قدر بڑا- جہاں سے وہ چھوٹی پیشاب کرتے ہیں- ان کی باقی زندگی بھی نارمل ہوتی ہے بلکہ عام عورتوں کے مقابلہ میں ان کی گھریلو کام کاج یا دوسری زنانہ صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں- بقول رتھ بنی ڈکٹ-

"وہ امور خانہ داری میں عورتوں سے بھی زیادہ مہارت اور نفاست دکھاتے ہیں اور عورتوں کی گھریلو دستکاریوں میں خاص کاریگری کا مظاہرہ کرتے ہیں (۱۰۶)-"

یہ دونوں قسم کے افراد ہیجڑوں کی قسم ہیں- لیکن یہاں ہمیں مسئلہ درپیش ہے کہ کیا فطرت انہیں جنسی لذت حاصل کرنے کے حقوق دیتی ہے- ظاہر ہے جواب یہ دیا جائے گا کہ نہیں اور دلیل یہ ہوگی کہ اس لیے نہیں کیونکہ ان کے جنسی اعضاء نہیں ہیں- لیکن یہ بات بھی عام دیکھی گئی ہے کہ ان لوگوں میں عام عورتوں اور مردوں کی نسبت جنسی ہوس زیادہ پائی جاتی ہے- یہیں ہمارے ہاں یعنی پاکستان میں یا ہندوستان میں جو ہیجڑے پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثریت "ہم جنسی پرستی" کا شکار ہے- یہ اپنے آپ کو مفعول کے طور پر پیش کرتے ہیں اور عام مردوں کے ساتھ انتہائی شوق اور رغبت سے ہم بستر ہوتے ہیں- بلکہ ہمارے ہاں تو یہ لوگ اپنی اس خواہش کا برملا اظہار

کرتے اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ نوجوانوں کو کھلم کھلا پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں- اگرچہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے برصغیر میں جو پیشہ اپنا رکھا ہے وہ بھی انہیں اس طرح کے مواقع فراہم کرتا ہے- کیونکہ یہ لوگ برصغیر میں عام شادی بیاہ کے ''ڈانسرز'' کی حیثیت سے اجرت لے کر آتے ہیں اور رات رات بھر عورتوں کا لباس پہن کر اور میک اپ کر کے رقص کرتے ہیں- اس کے علاوہ کسی کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہو تو یہ لوگ از خود پہنچ جاتے ہیں- ڈھول بجانے والا ڈھولچی ان کے ہمراہ ہوتا ہے اور یہ گھر کے اندر بے دھڑک داخل ہو کر ''بیٹے'' کی خوشی کے گیت سناتے ہیں- اہل محلہ اور اہل خانہ ان کو دھتکارنے یا منع کرنے سے خوف کھاتے ہیں- کیونکہ ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہیجڑوں کی دی ہوئی بددعا آسمانوں کو چیرتی ہوئی عرش معلیٰ تک پہنچ جاتی ہے- یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور انہیں بیٹے کی پیدائش پر گھر کا ہر فرد اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ دیتا ہے-

ایک اور بات جو ہیجڑوں میں دیکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ عام معاشرتی لین دین اور معاملات کے سلسلے میں عورتوں اور مردوں کے مقابلہ میں انتہائی صاف ستھرے اور نیک خصلت ہوتے ہیں- میں نے اس کتاب کے سلسلہ میں جو تحقیقات لاہور، قصور اور لوئر پنجاب کے ہیجڑوں کے بارے میں کی ہیں تو مجھے یہ بات عام لوگوں نے بھی بتائی ہے کہ ناچنے گانے کی وجہ سے اگرچہ انہیں معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا...... کیونکہ مسلمانوں کے ہاں ناچنا گانا گناہ ہے- لیکن پھر بھی ان لوگوں کے بارے میں عوام ناپسندیدہ خیالات نہیں رکھتی اور خاص خاص موقعوں پر لوگ ان سے دعائیں کرواتے ہیں تاکہ جلد قبول ہوں-

لیکن جنسی طور پر یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ جنسی اعضاء کی غیر موجودگی کے باوجود ان لوگوں میں شہوت پسندی انتہا درجہ کی پائی جاتی ہے- ظاہر ہے انہیں اس کام میں لذت محسوس ہوتی ہے تو وہ ایسا کرتے ہیں- حالانکہ ماہرین جنسیات اس بات پر متفق ہیں کہ بعض مردوں یا عورتوں میں جنسی رغبت قدرتی طور پر کم یا بہت کم پائی جاتی ہے اور ایسے لوگ اس لذت کے حصول کا شوق ہی نہیں رکھتے- زیادہ تر اپنی مرضی سے مجرد زندگی گزارنے والوں میں یہی نفسیاتی بیماری پائی جاتی ہے- لیکن ان کے برعکس ہیجڑے تو جنسی اعضاء سے ہی محروم ہوتے ہیں- پھر ایسا کیوں ہے کہ ان میں جنسی لذت کے حصول کا شوق، ہوس کی حد تک موجود ہے- اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے

کہ جب انسان کسی چیز سے محروم ہوتا ہے تو اس کے حصول کی شدت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے- ظاہر ہے ایک اندھے کو جس قدر آنکھیں حاصل کرنے کا شوق ہوگا آنکھوں والے کو نہیں ہو سکتا- محاورہ بھی ہے کہ ''اندھا کیا مانگے دو آنکھیں'' ہو سکتا ہے جنسی اعضاء کی محرومی ان لوگوں کو اور زیادہ شدت سے اس طرف مائل کرتی ہو- پھر جو بات زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کیا ان کے بدن میں وہ خاص قسم کے ''ہارمونز'' ہوتے ہیں جو جنسی عمل کے دوران خون میں شامل ہو کر انسان کو لذت بہم پہنچاتے ہیں- کیونکہ جانوروں میں دیکھا گیا ہے کہ وہ جانور جو جنس اعضاء سے محروم ہوتے ہیں جنس لذت کی خواہش سے بھی قطعی طور پر محروم ہوتے ہیں- مثلاً خچر ایک ایسا جانور ہے جس کے جنس اعضاء نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنی نوع میں اپنی نسل بڑھاتا ہے- بلکہ گدھے اور گھوڑی کے جنسی ملاپ سے خچر پیدا ہوتے ہیں-

لیکن اگر ایسا ہے کہ ہیجڑوں کی فطری جنسی خواہش نہیں ہوتی اور وہ محض اعضاء سے محرومی کی وجہ سے ایک خاص قسم کے ذہنی دباؤ کے تحت ایسا کرتے ہیں تو پھر انہیں کسی قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے- شاید جسمانی ''لمس'' اور ''رگڑ (۱۰۷)'' ہی ان کی جنسی لذت ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ انہیں معاشرے کا عمدہ نظام اور عزت نفس کی دولت دے دی جائے تو وہ اس قبیح فعل سے باز آ سکتے ہیں اور شاید پھر ان کے اندر بھی جنسی تحریک جسے نقلی یا جعلی تحریک کہا جانا چاہیے خچر کی طرح مفقود ہو جائے گی-

زنانے یا مورتیں

ہیجڑے تو خیر اپنی محرومی کو جواز بنا کر بہت سی رعایتیں حاصل کر سکتے ہیں- لیکن ایک اور طبقہ ہے جو ہیجڑوں کے طبقے سے زیادہ حیران کن بلکہ پریشان کن ہے اور اس طبقے کے افراد دنیا کے ہر خطہ میں پائے جاتے ہیں اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی محقق نے ان لوگوں کو اپنی تحقیق کا موضوع نہیں بنایا- مجھے آج سے دس بارہ سال قبل معاشرے میں ان لوگوں کی موجودگی کا علم ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی- دراصل آج سے دس بارہ سال قبل روزنامہ جنگ نے اپنے رنگین ایڈیشن میں ایک فیچر ''زنانوں یا مورتوں'' کے حوالے سے شائع کیا تھا- جو خاصا پر مغز تھا- بعد میں

پاکستان فلم انڈسٹری نے ایک فلم جس کا نام غالباً ''شادی میرے شوہر کی'' یا ''شادی مگر آدھی'' تھا اس موضوع پر بنائی- لیکن فلم چونکہ کمرشل تھی لہٰذا ان لوگوں کا اس میں خوب مضحکہ اڑایا گیا اور پھر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ برصغیر کے تقریباً ہر شہر میں تو پائے جاتے ہی ہیں- یورپ' عرب اور امریکہ میں بھی ان کی ایک پوری کمیونٹی ہے اور یہ بھی نہیں کہ ہیجڑوں کی طرح اکا دکا ہیں بلکہ چھوٹے شہروں سے لے کر بڑے شہروں تک بیسیوں نہیں بلکہ ہر شہر میں سینکڑوں کی تعداد میں یہ موجود ہیں- عام لوگ انہیں بھی ہیجڑا ہی سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ہیجڑے نہیں ہوتے- حتیٰ کہ ہیجڑے ان سے نفرت کرتے اور انہیں برا سمجھتے ہیں- کیونکہ یہ مکمل مرد ہوتے ہیں ان کا عضو تناسل عمل تناسل کے صرف قابل ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی گھریلو زندگی میں باقاعدہ شادیاں کرتے اور بچے پیدا کرتے ہیں- میں خود ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو شادی شدہ اور بال بچے دار ہیں لیکن زنانے ہیں-

انہیں زنانے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مرد ہونے کے باوجود بالکل عورتوں جیسی زندگی گزارتے ہیں- بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دیوانگی کی حد تک عورت بننے کے شوقین ہوتے ہیں- پاکستان میں عموماً ان کے اہل خانہ ان کی شرمندہ کر دینے والی حرکات سے تنگ آ جاتے ہیں- انہیں مارتے پیٹتے ہیں اور بالآخر اکثر کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے- لیکن گھروں سے نکل کر یہ پریشان نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے ہیں اور یوں اپنی باقاعدہ جمعیت کے ساتھ جا ملتے ہیں- لاہور کے قریب قصور شہر میں ان کا ہر سال بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے جہاں پورے برصغیر سے زنانے آتے ہیں اور کئی دن تک بڑی حویلیوں میں رہتے اور اپنے مسائل کا اجتماعی حل تلاش کرتے ہیں- گھروں سے فارغ ہونے والے زنانے عموماً میلوں اور سرکسوں میں عورتوں والے کپڑے پہن کر ڈانس کرنے کا کام کرتے ہیں اور ''موت کے کنویں (۱۰۸)'' میں تماشائیوں کو فلمی گیتوں پر ناچ دکھا کر محظوظ کرتے ہیں- یہی ان کا پیشہ ہے ان کے علاوہ وہ زنانے جنہیں گھروں سے فارغ نہیں کیا جاتا عموماً عورتوں والے پیشے اپنا کر معاشرے میں رہتے ہیں- مثلاً ان کی اکثریت درزیوں والا کام کرتی ہے یا پھر سلائی کڑھائی وغیرہ-

عجیب بات ہے کہ مکمل مرد ہونے کے باوجود یہ ہر وہ کام پسند کرتے ہیں جو عورتیں کرتی ہیں- مثلاً اپنے نام عورتوں کی طرز پر بگاڑ لیتے ہیں- فرض کریں کہ ایک زنانے کا نام ہے ''شمس'' تو وہ

اپنے آپ کو ''شمو'' کہلانا پسند کرتا ہے- اسی طرح اشرف ''اچھو'' شبیر ''شبو'' اور منیر ''مینا'' یا ''منی'' بن جاتا ہے- داڑھی مونچھیں اکثر صفا چٹ رکھتے ہیں اور طرح طرح کے میک اپ کر کے اپنے آپ کو دلکش بنانے کی کوشش کرتے ہیں- ہر شہر میں ان کے بڑے بڑے اڈے ہیں- جہاں یہ روز اکٹھے ہوتے اور معاملات روز کے روز ڈسکس کرتے ہیں- ان کی جمعیت بڑی مضبوط اور منظم ہے- ہر شہر میں ان کا ایک سربراہ یا حاکم ہوتا ہے جسے یہ گرو کہہ کر پکارتے ہیں- گرو کا حکم ہر مورت یا زنانے کے لیے حرفِ آخر ہوتا ہے اور جو زنانہ گرو کی بات نہ مانے اس کے ساتھ انتہائی سخت قسم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے- گرو کے ماتحت تمام زنانے چیلے کہلاتے ہیں- یہ اپنے لوگوں میں ایک خاص قسم کی پراسرار زبان بولتے ہیں جو پورے برصغیر میں ان کی جمعیت میں بولی اور سمجھی جاتی ہے- میں نے انتہائی کوشش کے بعد اس زبان کے صرف چند الفاظ حاصل کیے ہیں- کیونکہ یہ ان کی خفیہ زبان ہے اور کسی غیر زنانے کو سکھانا سخت منع ہے- ان کی زبان کے جو الفاظ میں نے مختلف طریقوں سے معلوم کیے ہیں ان کی مثال یہ ہے-

زنانوں کی خفیہ زبان کا لفظ	اردو میں ترجمہ
۱- چیسا	خوبصورت
۲- بیلا	بدصورت
۳- ریشکا	بال
۴- لورا	خوبصورت لڑکا
۵- پھمنی	داڑھی
۶- گیٹی	عضو تناسل
۷- نکاتی کرنا	راز کھولنا
۸- جوبن	حسن
۹- سوتر چس	چھوٹی پیشاب
۱۰- گریا	شوہر
۱۱- واٹل	بڑی پیشاب کرنے کی جگہ

۱۲- پدنا — ہم بستری کرنا

۱۳- ڈنگور خانی — پولیس کے ڈنڈے کھانا

۱۴- کڑے کرا — دفع ہو

یہ تو چند الفاظ ہیں اس طرح کے عجیب وغریب الفاظ کا مجموعہ ان کی خفیہ زبان ہے- یہ اگر سادہ یعنی مردوں والے کپڑوں میں ہوں تو ان کی پہچان یہ ہے کہ یہ عورتوں کی طرح بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ لچک لچک کر چلتے ہیں اور ہاتھ لہرا لہرا کر باتیں کرتے ہیں- ہم جنس پرستی کا قبیح فعل جس منظم طریقے سے زنانوں میں رائج ہے کہیں بھی نہیں ہو سکتا- یہ آپس میں ہم "ہم جنس پرستی" نہیں کرتے کیونکہ آپس میں تو یہ ایک دوسرے کو عورت ہی سمجھتے ہیں- ہم جنس پرستی کا طریقہ ان میں یوں رائج ہے کہ ان میں جس "عورت" کی شادی تیار ہوتی ہے- ہاں! ان میں باقاعدہ شادیوں کا رواج ہے- یہ معاشرے میں موجود ان مردوں سے شادیاں کرتے ہیں جو لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کے شوقین ہوتے ہیں- ان میں جس مورت کی شادی تیار ہوتی ہے وہ اپنے لیے کوئی "غیر زنانہ" یعنی مرد پھانستا ہے- ان کی پوری جمعیت اس مرد پر نظر رکھتی ہے- شادی کا خواہش مند زنانہ اس مرد کو اپنے ناز و انداز سے لبھاتا ہے اور اسے اپنے رازوں میں شریک کرنے کے لیے طویل عرصہ محنت کرتا ہے- پہلے اس پر پیسے خرچ کیے جاتے ہیں اور بعد ازاں وہی مرد اپنی محبوب عورت کو قسم قسم کے کپڑے، میک اپ کا سامان، پرفیوم اور سینڈل خرید کر لے دیتا ہے- اسے کئی مدت تک طرح طرح سے آزمانے کے بعد گرو فیصلہ کرتا ہے کہ اب ان کی شادی کر دی جائے- کیونکہ اب یہ رازوں میں شریک ہونے کے قابل ہے- وہ مرد جو اپنی عام معاشرتی زندگی میں ایک مکمل مرد ہوتا ہے کاروبار یا ملازمت کرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بال بچے دار بھی ہو- پوری طرح ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے- وہ دن رات اپنی مطلوبہ مورت کے ساتھ بدفعلی کے خواب دیکھتا ہے- لیکن گرو کے حکم کے بغیر وہ اپنی معشوق مورت کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا- جب اچھی طرح یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ وہ مورتیوں کی جمعیت کا کوئی راز فاش نہیں کرے گا تو اس سے آخری حلف لیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں کی باقاعدہ شادی کی تاریخ رکھ دی جاتی ہے-

یہ شادی عام عورت مرد کی شادی جیسی ہوتی ہے- لڑکی والوں کی طرف سے مہندی کی رسم لڑکے والوں کی طرف سے الگ مکان یا کمرے، سیج، کپڑے، جوتے حتیٰ کہ مختلف قسم کے جنسی

آلات وغیرہ دیئے جاتے ہیں- لڑکے والے بھی گرو...... ہی کے ہرکارے ہوتے ہیں اور لڑکی والے بھی- پھر رخصتی والے دن باقاعدہ بارات آتی ہے جو بظاہر عام لوگوں کو زنانوں جنہیں وہ ہیجڑا سمجھتے ہیں کا کوئی فنکشن محسوس ہوتا ہے- لیکن حقیقت میں وہ شادی کی تقریب ہوتی ہے- رخصت ہونے والی مورت یا زنانے کو خوب بنا سنوار کر لڑکے کے ساتھ بھیج دیا جاتا ہے اور پھر اسی رات وہ اپنی ہونے والی مرد بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا گویا بدفعلی کرتا ہے- اس رات کو باقاعدہ سہاگ رات کا درجہ دیا جاتا ہے شوہر کو ان کی زبان میں گریا کہا جاتا ہے- اگلے دن بھی باقاعدہ عام شادیوں کی طرح رسمیں ہوتی ہیں- تحفے تحائف کے تبادلے اور کھانے کی دعوتیں ہوتی ہیں-

یہ تمام تفصیلات جو پاکستانی زنانوں کے بارے میں درج کی گئی ہیں- ۱۹۸۷ء میں بی بی سی لندن...... کی اس خبر کے بعد میں نے جمع کیں...... جب پنجاب کے ایک شہر خوشاب میں ان لوگوں کی کارروائیوں کا راز ایک ناراض گریے (شوہر) کی طرف سے فاش کیا گیا تھا- اس وقت خوشاب شہر کے تھانہ میں باقاعدہ کیس درج کیا گیا تھا اور لگ بھگ ۸۰ کے قریب اسی طرح کی شادیاں پکڑی گئی تھیں اور یہ عجیب بات بھی سامنے آئی تھی کہ علاقے کے بڑے بڑے رئیس بھی اس جرم میں بطور گریا شریک تھے-

ان میں ایک اور انتہائی تکلیف دہ اور دردناک بات پائی جاتی ہے اور وہ ہے "نربان" ہونا- نربان ہونا مورتیوں کی جمعیت میں ایک اصطلاح ہے- جو زنانہ حد سے زیادہ عورت بننے کا شوقین ہوتا ہے- وہ آپریشن کے ذریعے اپنا عضو تناسل کٹوا دیتا ہے- ان کے آپریشن کرنے کے لیے کئی بڑے بڑے ڈاکٹرز خفیہ طور پر ان کے ساتھ شامل ہیں اور بعض ڈاکٹرز تو خود زنانے ہیں یا پھر گریے- نربان ہونے کے بعد یعنی عضو تناسل کٹانے کے بعد ان کی داڑھی اور مونچھوں کے بال خودبخود گر جاتے ہیں اور پھر یہ اپنے آپ کو مکمل عورت سمجھنے لگتے ہیں- لیکن ان کی ہم بستری کا طریقہ پھر بھی وہ ہوتا ہے یعنی دبر (مقعد) کو انٹرکورس کے لیے استعمال کرتے ہیں-

سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر "لواطت بازی" کا یہ جو انتہائی گھناؤنا کام جاری ہے- آج تک ارباب حکومت یا اہل دانش کی نظر میں کیوں نہیں آیا اور ان مذموم اعمال کی سرکوبی کے لیے اقدامات کیوں نہ کیے گئے- اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انتہائی خفیہ طریقہ سے

اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ سینکڑوں سال سے جاری ہے- نہ صرف یہاں یعنی برصغیر میں بلکہ یہ کام دنیا کے ہر ملک میں اپنے اپنے انداز میں عرصہ سے جاری ہے- ڈاکٹر رتھ بنی ڈکٹ نے امریکی قبائل کی تحقیقات کے دوران یہ انکشاف کیا ہے کہ

> ''یہ دراصل پہلے مرد تھے- انہوں نے بالغ ہونے پر یا کچھ عرصہ بعد عورتوں کے سے کپڑے پہننے شروع کر دیے اور ان کے سے طور طریقے اور پیشے اختیار کر لیے- بعض اوقات وہ دوسرے مردوں کے ساتھ شادیاں کر لیتے تھے اور ان کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے- بعض اوقات یہ ایسے مرد ہوتے تھے جن میں ''انفعالیت'' تو نہ تھی البتہ وہ جنسی اعتبار سے بہت کمزور تھے- انہوں نے عورتوں کی تضحیک سے بچنے کے لیے انفعالیت کی روش اختیار کر لی (۱۰۹)-''

رتھ بنی ڈکٹ نے قدیم امریکی قبائل میں سے ''زونی'' قبیلہ کی روش بیان کی ہے اور رتھ کا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو بعض وجوہات کی بنا پر جنسی طور پر کمزور رہ گئے تھے- لہٰذا انہوں نے عورتوں کی طرف سے اپنی تضحیک کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے ''انفعالیت'' اپنالی- یہ رتھ بنی ڈکٹ کا خیال ہے یا انہوں نے وہاں یہی بات محسوس کی ہوگی- لیکن یہاں ان لوگوں کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہوئے مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ یہ جنسی طور پر کمزور مرد نہیں ہوتے- بلکہ وہ بچے ہوتے ہیں جو اپنے گھر کی عورتوں کی بطور ''ماڈل'' کے نقالی کرتے ہیں- میں اپنی بات کی مزید وضاحت کرتا ہوں- بعض خاندانوں میں یوں ہے کہ گھر کے مرد مردانے میں رہتے ہیں یا گھر کی عورتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے عادی نہیں ہوتے یا گھر میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے یا گھر کی عورتیں مردوں پر چھائی ہوئی ہیں یا گھر میں مرد ہے ہی نہیں، فوت ہو گئے ہیں یا پردیس میں ہوتے ہیں تو ایسے خاندانوں کے چھوٹے بچے اگر تو گھر سے باہر نکل کر کھیلنے کے عادی ہیں پھر تو وہ بچ جاتے ہیں- لیکن اگر وہ پابندیوں کی وجہ سے یا اپنی طبیعت کی وجہ سے گھر میں عورتوں کے ساتھ بند رہتے ہیں تو ان کے سامنے نقل اتارنے کے لیے اپنی بہنوں، ماں یا گھر کی دوسری عورتوں کا نمونہ ہوتا ہے- ماہرین اطفال کا خیال ہے کہ بچہ ہر بات نقل سے سیکھتا ہے- لہٰذا وہ بچے بھی اپنی ماں اور بہنوں کی چال ڈھال، رہن سہن بات کرنے کا انداز اور دیگر خصوصیات اپنا لیتے ہیں اور اس طرح جب وہ جوان ہوتے ہیں تو ان میں نسوانیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور ہمارے ہاں ایسے بچے اگر

بدنیتی سے مورتیوں کی تنظیم کے ہاتھ لگ جائیں تو خود بخود دل و جان سے ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں- کیونکہ ایسے بچے گھر سے باہر مردوں کے ماحول میں گھبراتے ہیں- جبکہ مورتیوں کے ماحول میں راحت محسوس کرتے ہیں-

بہر حال جو بھی ہو...... زنانے یا مورتیاں انسانی معاشرے میں ''ان فٹ'' ہیں- یہ ایک حیرت انگیز اور خطرناک مخلوق ہے- مرد کا مرد کے ساتھ ہم بستر ہونا انتہائی غیر فطری فعل ہے- انسانیت تو کیا مقام حیوانیت سے بھی گرا ہوا- کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی جانور حتیٰ کہ سور بھی ہم جنس پرستی نہیں کرتا- لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خیال ہے کہ جانوروں میں صرف سور ہم جنس پرست ہوتا ہے- (۱۱۰)

ہم جنسی پرستی

جنسی عمل اگرچہ فطری عمل ہے اور تمام مخلوقات اس کا ارتکاب کرتی ہیں- تاہم ہم جنس پرستی قطعی طور پر غیر فطری اور باشندگان زمین و آسمان کے لیے نامانوس ہے- یہ خالصتاً عقل و شعور کی سوچی سمجھی سازش ہے- جس نے نیک طینت انسان کی سیدھی سادھی فطرت کو پیچیدہ اور تکلیف دہ بنا رکھا ہے-

مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کے خیال میں......

> ''ہم جنس پرستی میں بنیادی کردار ''لاشعور'' ادا کرتا ہے- ہر انسان میں لاشعوری ہم جنسیت پائی جاتی ہے- لاشعوری ہم جنسیت، جنسی توانائی کی تشکیل میں اساسی حیثیت کی حامل ہے- اس کا مظاہرہ تین صورتوں میں ہوتا ہے- ایک ''مخفی ہم جنسیت''...... دوسری ''دبائی گئی ہم جنسیت'' اور تیسری ''آشکار ہم جنسیت''...... ان تینوں میں شدت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے- لاشعوری ہم جنسیت اگر کسی طرح پوری نہ ہو تو یہ مریضانہ صورت اختیار کر لیتی ہے-''

گویا فرائڈ کے نزدیک ہم جنس پرستی انسانی فطرت کا حصہ ہے- کیونکہ لاشعوری ہم جنسیت کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کی جڑیں ''جینز'' تک پھیلی ہوئی ہیں- ابھی ہم نے کہا تھا کہ حیوانات

میں ہم جنس پرستی نہیں ہوتی۔ لیکن فرائڈ کی تحقیق ہے کہ ہم جنس پرستی "فطری عمل" ہے۔ لہٰذا خود بخود ایک سوال سامنے آ جاتا ہے کہ جب ہم جنس پرستی جانوروں میں نہیں ہوتی تو پھر "فطری" کیسے ہوئی۔ اس سوال کا جواب تو ہم دو قدم آگے چل کر دیں گے۔ لیکن یہاں ہم اس سے متعلق ماہرین کی مزید تحقیق ملاحظہ کرتے ہیں۔ ماہرین سائنس، نفسیات اور حیاتیات نے ہم جنس پرستی سے متعلق اب تک جس قدر تحقیق کی ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ہم ان کے نتائج کے چیدہ چیدہ نکات پیش کرتے ہیں۔

"۱۔ ہم جنس پرستانہ روش کے فروغ و استحکام کے پس پردہ ایڈی پس کمپلکس بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ اپنی ہی جنس کے فرد سے محبت دراصل نرگسیت ہی کا شاخسانہ ہے۔

۳۔ ہم جنس پرستی کی طرف مائل کرنے والا ایک عامل "زن بیزاری" بھی ہے۔

۴۔ احساس عزت نفس کی کمی کا شکار لوگ ہم جنس پرست ہو سکتے ہیں۔

۵۔ تنہائی کا شکار لوگ بھی اس قباحت میں آسانی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۶۔ مردوں کی ہم جنس پرستی کو "ہوموسیکچوئیلٹی" اور عورتوں کی ہم جنس پرستی کو لزبائیت کہتے ہیں۔"

۷۔ پیدائش سے پہلے "جنین" میں انڈروجن کی مقدار کم ہو جانے سے بچے میں ہم جنس پرستی پیدا ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ہم جنس پرستی قانونی اعتبار سے ایک تسلیم شدہ معاشرتی تعامل بن گئی ہے۔ لوگوں کا رویہ بھی ہم جنس پرستوں کے ساتھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اب جنسی ترجیحات زیادہ کھلے بندوں زیر بحث آتی ہیں اور انہیں زندگی کی دوسری سرگرمیوں کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں "پیٹرنز آف سیکچول بی ہیوئیر" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب شائع ہوئی۔ اس میں ۷۶ انسانی معاشروں کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ ان میں سے دو تہائی معاشروں میں، بچپن اور بلوغت کے زمانے میں ہم جنس پرستی کو باقاعدہ رسوم کا جزو بنا دیا گیا تھا۔

ماہرین کی رائے ہے کہ پانچ برس کی عمر کے بچے جنسی اعضاء کے امتیاز سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بچپن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں اور کھیل کھیل میں "ماں باپ" بنتے ہیں......

عمومی طور پر ان کے ناٹک میں والد اور والدہ کا کردار ایک ہی صنف کے بچے ادا کرتے ہیں۔ یہیں سے ہم جنس پرستی کی کونپل نمودار ہوتی ہے۔

اس وقت دنیا بھر میں ہم جنس پرستی کے حوالے سے امریکہ بدنام ترین ملک ہے۔ امریکہ کے شہر "منی پولس" میں ہم جنس پرستوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس کا عنوان تھا۔ "ہم جنس پرست...... مردوں اور عورتوں کے نمائندوں کی قومی کانفرنس" اس کانفرنس میں امریکی کانگریس کے ارکان شریک ہوئے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے صدارتی امیدوار "جیکسن" نے جو پادری بھی ہیں۔ اس کانفرنس کے نام ہمدردی کا پیغام بھیجا۔ کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ ہم جنس پرستوں کے مطالبات ایک بل کی صورت میں سینٹ میں پیش کیے جائیں گے۔

مردوں کے ہم جنس پرستی کے مقابلہ میں عورتوں کی ہم جنس پرستی کو "لزبائیت" کہا جاتا ہے۔ مشہور ماہر جنسیات "کنسے (Kensay)" کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں مرد ہم جنس پرستوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ "لزبائیت" پرست عورتیں آزادی نسواں کی تحریک کی سرگرم رکن بن چکی ہیں۔ ایسی عورتیں پتلونیں پہنتی اور سگریٹ پیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ "ہم مردوں کے لیے کانچ کا کھلونا نہیں"۔ "لزبائیت" جزیرہ لیزبوس سے موسوم ہے۔ عورتوں کی ہم جنس پرستی کے حوالے سے جزیرہ لیزبوس کی بدنامی ایک عورت "سیفو" کی بدولت ہے۔ "سیفو" جزیرہ لیزبوس کی رہنے والی تھی اور ہم جنس پرست تھی۔ "سیفو" کے نام کی وجہ سے "لزبائیت" کو سیفوازم بھی کہا جاتا ہے۔ سیفو جزیرہ لیزبوس کی معروف شاعرہ تھی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کی یہ عورت "ہومر" اور ہسیاڈ کی ہم رتبہ شاعرہ سمجھی جاتی ہے۔ اس نے شاعری میں ۹ دیوان ترتیب دیے۔ سیفو کی زندگی پر تفصیلی معلومات کے لیے آرتھر وویگال کی کتاب "لیزبوس کی سیفو" خاصی مقبول ہے۔

سیفو، مردم بیزار تھی...... اور عورتوں کی عورتوں سے محبت کی قائل تھی اور یقیناً سیفو کے افکار مردوں کی روش کا ردعمل تھے۔ عورتوں میں اس انحراف کا سبب تلاش کرتے ہوئے امام علاالدین شہباز (امریکہ) نے لکھا ہے کہ......

"لڑکا اور لڑکی میں پیدائش کے بعد کوئی نمایاں اختلاف نہیں ہوتا، دونوں اپنی جنس

کے حوالے سے کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوتے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لڑکپن کا دور شروع ہوتا ہے...... تو لڑکے اپنے عضوِ تناسل پر فخر کرتے ہیں اور اس کا موازنہ اپنے ساتھیوں سے کرتے رہتے ہیں۔ اس موقعہ پر لڑکیاں اپنے پاس ویسا ہی فخر کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔"

اور پھر...... وہ ہم جنس پرستی' لزبائیت یا سیفو ازم میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ہم جنس پرست لڑکیوں کی پہچان یہ ہے کہ...... ایسی کوئی سی دو لڑکیاں جب اکٹھی ہوتی ہیں تو ان کا سرگوشیوں میں باتیں کرنا' چھپ چھپ کر بیٹھنا' بات بے بات ہنسنا' گھنٹوں کسی کمرے میں بند رہنا یا دوسرے افرادِ خانہ کی نگاہوں سے بچ کر کسی کونے کھدرے میں انجانے موضوعات پر گفتگو کرنا۔ "لزبائیت" کی علامات ہیں۔ ایسی رازدار سہیلیاں دور ہو جائیں تو ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھتی ہیں۔

عورتوں کی ہم جنس پرستی کا ایک سبب مردوں کی "بے رخی" ہے۔ یہ ان معاشروں کا المیہ ہے۔ جہاں مذہب "رہبانیت" کا درس اور مردوں کو "عورت" سے دور رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔

مردوں کی ہم جنس پرستی عورتوں کی نسبت زیادہ منظم ہے۔ کیونکہ ہم جنس پرست عورتیں "دخول" اور "خروج" سے محروم ہوتی ہیں۔ جبکہ ایسے مرد "مقعد" کے راستے باقاعدہ انٹرکورس کرتے ہیں۔ اس عمل یعنی "انٹرکورس" کو اصطلاح میں سدومیت کہا جاتا ہے۔

لوطؑ کے شہر کا نام بھی بائبل نے "سدوم" بتایا ہے۔ اسی نسبت سے بعض لوگ ہم جنس پرستی کو "لواطت" اور بعض لوگ "سدومیت" کہتے ہیں۔ بعض مؤرخین کی رائے میں اس کی ابتداء قدیم مصر سے ہوئی۔ جہاں دیوی آئسس کے مندر میں ہیجڑے پجاری تھے۔ جن سے زائرین جنسی تعلق قائم کرتے تھے۔ آئسس کے مندر سے یہ وباء جزیرہ کریٹ' فلسطین کنعان اور لبنان میں پھیل گئی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یونان کے نامور فلسفیوں نے انسان کی اس کج فطرتی کی بہت سرپرستی کی جن میں افلاطون سرِفہرست ہیں۔ افلاطون نے ہی سب سے پہلے لڑکے کے حسین جسم میں روح کی تلاش...... کی تھی۔ یونان کے دیوتا بھی ہم جنس پرست تھے۔ خداوند خدا "زیوس" کا...... "گنی میڈ" سے' اپالو کا "ہیاستھ" سے اور "ہرکولیس" کا "ہائی لیز" سے معاشقہ مشہور ہے۔ یونانیوں کا فلسفہ ہے کہ نوجوانوں کی باہمی محبت ان میں عزم و حوصلہ اور شجاعت پیدا کرتی ہے۔

مصر اور یونان کے بعد اہلِ کلیسا کا نمبر آتا ہے۔ بائبل کا یہ جملہ کہ "مرد کے لیے بہتر ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے۔" اہلِ کلیسا کی بے راہ روی کا باعث بنا۔ عیسائیوں نے اس جملے کا مطلب یہ لیا کہ مرد عورت کو تو نہ چھوئے لیکن مرد کو چھو لے تو کوئی حرج نہیں۔ بائبل میں پال کا یہ قول درج ہے۔

"آدمی کے لیے اچھا ہے کہ وہ کسی عورت کو نہ چھوئے تاکہ زنا سے بچ سکے"

اسی طرح عہد نامہ قدیم میں آیا ہے کہ

"جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے کو عورت سے بچائے گا۔ آدمیوں میں سے میں نے ایک کو خدا کا پیارا پایا ہے۔ لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو خدا کو پیاری ہوتی۔"

اہلِ کلیسا نے بائبل کے ان بیانات سے از خود یہ مطلب نکال لیا ہے کہ مرد کی مرد کے ساتھ جنسی وابستگی جائز ہے۔

صرف اسی پر بس نہیں بلکہ مسیحی مذہبی پیشوا تو اس سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔ آرچ بشپ آف کنٹربری کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ ہم جنسیت میں مبتلا تھے[۱۱۱]۔ (نعوذ باللہ)

امریکہ میں ۲۰ فیصد پادری کم سن بچوں سے بدفعلی کرتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۳ء تک امریکی کلیسا کو چار سو ملین ڈالر اس جرمانہ کے طور پر ادا کرنا پڑے جو کمسن بچوں اور بچیوں نے پادریوں کی طرف سے ہونے والے جنسی حملوں کے خلاف امریکی عدالت سے معاوضے کے طور پر طلب کیے تھے۔

قدیم تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہم جنس پرستی بھی انتہائی قدیم بیماری ہے۔ بائبل اور قرآن میں بھی ہم جنس پرستی کا باضابطہ تذکرہ موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ انسان نے یہ قبیح فعل کیوں اپنایا...... کیا یہ قباحت انسانی فطرت میں شامل ہے یا محض شعور کی کارستانی۔ تاریخ میں بڑے بڑے نامور لوگ اس عجیب و غریب عادت کا شکار رہے ہیں۔ بڑے بڑے امراء' وزراء' مفکرین' بادشاہ اور مشہور لوگ ماضی میں بھی اس بری روش کے دلدادہ تھے۔ مشہور کتاب

''تاریخ میں جنس اور قوت'' کے صفحہ نمبر ۱۰۵ پر درج ہے کہ......

''ہم جنس پرستی اس قدر غلبہ پا چکی تھی کہ سپارٹا میں عوامی تعلیم کا ایک جزو بن چکی تھی۔ یونانی افواج کی تشکیل میں ہم جنس پرستی ایک بنیادی عامل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یونان کی فوج کو دنیا کی سب سے بہترین آرمی تصور کیا جاتا تھا اور یہ ساری فوج ہم جنس پرستوں پر مشتمل تھی۔''

افلاطون جو ۴۲۸ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ ''کے جے ڈوور'' کے الفاظ میں

''اس کا ہم جنس پرستانہ جذبہ ابنارمل حد تک شدید اور مخالف جنس طرزِ عمل حد سے زیادہ سرد تھا۔''

''ہینڈسم'' کی اصطلاح سب سے پہلے یونانیوں نے استعمال کی۔ مشہورِ زمانہ ''جولیس سیزر'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''ہر شخص کی بیوی کا شوہر اور ہر عورت کے شوہر کی بیوی تھا۔'' لفظ ''رومانس'' تاریخی طور پر رومیوں کے سدومیت پرستی کے رجحان سے جڑا ہوا ہے۔ مشہور صلیبی بادشاہ رچرڈ شیر دل کو مؤرخین جہاں اس کی بہادری کی وجہ سے یاد کرتے ہیں وہاں اس کی سدومیت پرستی بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ پرنس ڈی لا روش اور جارج ایڈورڈ بھی پرلے درجے کے ہم جنس پرست تھے۔ ''لیوز'' کا پہلا بشپ ''فوٹینس'' نہ صرف ہم جنس پرست تھا بلکہ برہنگی پرست بھی تھا۔

تاریخی نوادرات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں لوگ جنسی اعضاء کی پرستش بھی کیا کرتے تھے۔ ان چیزوں میں سب سے زیادہ مردانہ عضوِ تناسل کو پوجا گیا۔

سپین کی غاروں میں ایسی مصوری کی دریافت ہوئی ہے جس سے مصوروں کے ذہنوں پر مردانہ عضوِ تناسل کا تسلط واضح طور پر جھلکتا ہے۔ قدیم یورپ کے لوگ جنہیں کاکیشیائی نسل کہا جاتا ہے اعضاء تناسل سے مشابہہ تعویذ پہنتے تھے۔ عیسیٰ کی آمد سے سات ہزار سال پہلے جسے میسولیتھک دور کہا جاتا ہے۔ اعضاء تناسل کی پرستش کا دور تھا۔ کانسی کے زمانے کے مجسموں میں اندامِ نہانی کی عکاسی کی گئی ہے۔ فرانس میں دریافت ہونے والی ''فرشتوں کی غار کی'' دیواروں پر نسوانی اعضاء تناسل کی تصویریں کندہ ہیں۔ یونانی جزیرہ ڈیلوس کا عظیم الجثہ پتھریلا مردانہ عضوِ تناسل انتہائی منفرد ہے۔ بائبل میں یہودیوں کے کچھ ایسے ستونوں کا ذکر ہے جو مردانہ عضو سے مشابہہ تھے۔ شام میں بلند قامت میناروں کا ایک مجموعہ تھا جو عضوِ تناسل کی شکل پہ تھا۔ قدیم یورپ میں عضوِ تناسل کے

اریوں کو عبادت میں شمولیت کرنے پر تھوڑا سا نمک اور ایک مصنوعی عضوِ تناسل عنایت کیے جاتے ے۔ یونان میں ایک دیوتا ''پرایاپس'' تھا۔ ''پرایاپس'' کا امتیازی نشان ایک عظیم الجثہ عضوِ تناسل ا۔ اس بت کو انگور کے باغوں کا سرپرست اور قبروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ بائبل میں حضرت مریم ے ساتھ جس مقدس روح کی مباشرت (نعوذ باللہ) کا اشارہ ملتا ہے وہ روح یونان کا یہی ''پرایاپس'' دیوتا تھا۔ روم میں بھی عضو کی پوجا کی جاتی تھی۔ روم کی کنواریاں، بچے، مذہبی پیشوا عضو تناسل کے چھوٹے چھوٹے مجسمے اپنے گلے میں اس طرح لٹکائے پھرتے تھے جیسے دورِ حاضر کے یسائی صلیبیں ڈالے پھرتے ہیں۔ روم اور یونان میں شہر کے دروازوں کے باہر عضو کے بڑے بڑے مجسمے نصب ہوتے جن کے نیچے یہ تحریر ہوتی...... ''مسرت یہاں مقیم ہے''۔ ماضی میں اہلِ کلیسا بھی عضو پرستی کا شکار تھے۔ جارج ریلی سکاٹ کے بقول......

''نسوانی اعضائے تناسل کی پیش کاری چرچ کے صدر دروازے کا بنیادی پتھر ہوا کرتی تھیں۔''

شمالی اٹلی کے قصبے ''کومو'' میں واقع ''سان مڈیلے'' کے چرچ کے دروازے کی پیشانی پر دائیں جانب ایک عجیب وغریب نقش تھا۔ اس نقش میں آدم اور حوا کو (معاذ اللہ) برہنہ دکھایا گیا تھا۔ مذہب پرست عیسائی بھی اعضاء تناسل کی شکل کے تعویذ پہنتے تھے۔ مثلاً ایک تعویذ میں عضو تناسل پر سوار ایک عورت کو دکھایا گیا تھا۔ ''بشپ فوٹینیس'' کے عضوِ تناسل کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس کے لکڑی سے تراشے گئے عضو کی پیشکاری قرونِ وسطیٰ کے چرچوں میں دریافت ہوئی ہے۔ ان اعضا کو کھرچا جاتا تھا۔ ان کی کھرچن پانی میں گرتی تھی اور وہ پانی بانجھ عورتیں اور کمزور مرد قوتِ باہ کے لیے پیا کرتے تھے۔ ''ویری لیس'' کے ایک چرچ میں مردانہ اور زنانہ اعضائے تناسل کے موی مجسمے نذر کیے جاتے تھے۔ چرچ میں ان اعضاء پر شراب ڈالی جاتی تھی اور پھر اس شراب کو شراب اولیاء کے نام سے پیا جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے رومی اور یونانی فحش شکلوں کی مٹھائیاں بنایا کرتے تھے۔ بائبل میں ایسے ہی کیک کا ذکر ہے جو تبرک کے طور پر گھر گھر بھیجا جاتا تھا۔ قدیم عیسائیت میں ''میٹونس'' ایک ایسا پتھر تھا جو چرچ کے باہر نصب ہوتا تھا اور جس کے ابھار پر نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں اُکڑ بیٹھتی تھیں اور اس کا مطلب تھا کہ ان کا کنوارہ پن سب سے پہلے خدا کی نذر ہوا۔ ''جے بی

کمپیگی اس' عیسائیوں کی فحش مٹھائیوں کے حوالے سے لکھتا ہے کہ......

''یہ آداب واخلاق کے تنزل کی علامات تھیں کہ عیسائی بذات خود اپنی غذاؤں تک میں ایسی فحش اشیا کو شامل کر کے لذت افروز ہوا کرتے تھے۔''

انسانوں میں اب بھی اعضا پرستی محض علامات کی صورت میں باقی ہے۔ اب بھی ایسی مٹھائیاں بنتی ہیں جنہیں کھا کر ''عضونوشی'' کا تصور ابھرتا ہے۔لپ اسٹک آج بھی مردانہ عضوتناسل کی شکل پر بنائی جاتی ہے اور جب اسے استعمال کیا جاتا ہے تو یہ مائل بہ طوالت ہونے لگتی ہے۔کیا یہ اتفاقی امر ہے یا جنسی کج روی کا ترقی یافتہ اظہار؟ بچوں کو ''لولی پوپ'' فراہم کیے جاتے ہیں تو ان کی شکل بھی عضو تناسل سے مشابہہ ہے۔ ڈکشنری میں پیسٹری کا مطلب لکھا ہے ''گوشت کی بوٹی [۱۱۲]''

ہم ذکر کر رہے تھے کہ دنیا میں بڑے بڑے لوگ ہم جنس پرستی کا شکار رہے ہیں۔''جولیس سیزر'' کی بطور مفعول سدومیت پرستی تو ضرب المثل ہے۔''کیوریو'' کے بقول......

''وہ ہر آدمی کی بیوی اور ہر عورت کا خاوند تھا''

بائبل میں ہے کہ......

''کالے آدمی اپنے عضوتناسل کی وجہ سے اعلیٰ مراتب پاتے تھے [۱۱۳]۔''

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ معاشرے کا ہم جنس پرستانہ رخ بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ کیونکہ بہت سے سدومیت پرست اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں......لیکن یہ خیال کبھی بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔''گبن'' تاریخ سلطنت روما میں لکھتا ہے کہ......

''روم کے اولین پندرہ بادشاہوں میں سے چودہ ہم جنس پرست تھے۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلسل دو سو برس تک مردوں اور لڑکوں کے عضو تناسل اور مقعد' رومی حکومتوں کی توجہ کا مرکز رہے''

''لیک ٹینی اس'' کے بقول......

''رومی ہم جنس پرستانہ افعال کو لائق تحسین سمجھتے تھے۔''

ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ ہم آگے چل کر اس سوال کا جواب دیں گے کہ ہم جنس پرستی فطری ہے یا شعوری۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ ہم

دیکھ چکے ہیں کہ ہم جنس پرستی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم جس قدر بھی پیچھے سے پیچھے چلے جائیں ہمیں اس کے ڈانڈے آخری حد تک محسوس ہوتے ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ ماہرین حیاتیات کی رائے ہے کہ......

''جنین (ماں کے پیٹ میں بچے کے ابتدائی ایام) میں انڈروجن کی کمی ہم جنس پرستی کا باعث بنتی ہے۔''

چنانچہ انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم جنس پرستی کی روش موروثی جینز کا تحفہ ہے۔ لیکن پھر وہ بات کہ باقی مخلوقات میں یہ بے مقصد شہوت پسندی کا رجحان کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جنس پرستی انسان کے جینز میں تو شامل ہے لیکن بہت زیادہ قدیم دور کی یادگار نہیں۔لگتا ہے کہ یہ قباحت انسان میں ان زمانوں میں شروع ہوئی جب انسان ابھی انسان نہیں تھا بلکہ جنات کے درجے میں تھا۔شاید......''کرومیگنان'' اور ''نینڈرتھل'' کے زمانے میں یہی وجہ ہے کہ باقی مخلوقات جو انسان سے بہت عرصہ پہلے پیدا ہوئیں اس قباحت کا شکار نہیں ہیں۔گویا یہ جناتی خصلت ہے دوسرے الفاظ میں ''شیطانی'' ہم جنس پرستی اگرچہ خاصا قدیم جرم ہے اور اس کا ذکر بائبل اور قران حکیم میں موجود ہے۔لیکن ہر دور میں اپنی شدت اور پھیلاؤ کی بدولت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اسی دور کی سب سے بڑی قباحت ہو۔ باعث شرم اس قدر...... کہ آج تک کسی لکھاری نے ہم جنس پرستی کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔فلموں کی کہانیاں ہوں یا ڈرامے' افسانہ نگاری ہو یا ناول نویسی' شاعری ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف......ہم جنسی پرستی کے موضوع پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔البتہ کچھ یورپین اور امریکی مصنفین نے اس موضوع پر خوب لکھا ہے۔لیکن بائبل اور قران میں اس موضوع پر ہزاروں سال پہلے بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ بیان کرتے ہوئے بائبل اور قرآن حکیم نے شہر سدوم کی تباہی کی جو وجہ بیان کی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگ ہم جنسی پرستی کے مرض کا شکار ہو گئے تھے۔ اردو زبان میں اسی نسبت سے ہم جنسی پرستی کو لواطت کہا جاتا ہے۔یہ لفظ لوط سے نکالا گیا ہے۔بائبل میں ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ ہم جنس پرستی کرتے تھے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو خوبصورت فرشتے [۱۱۴] وہاں آ کر حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان ہوئے اور اہل شہر ان کے

پیچھے پڑ گئے۔

"انہوں نے لوط کو پکار کر اس سے کہا کہ وہ مرد جو آج رات تیرے ہاں آئے کہاں ہیں؟ ان کو ہمارے پاس باہر لے آ- تا کہ ہم ان کے ساتھ صحبت کریں" تب خدا نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور اس نے ان شہروں کو اور اس ساری ترائی کو اور ان شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے......اگا تھا غارت کیا۔"

گویا اہل سدوم پر ہم جنس پرستی کے جرم کی سزا کے طور پر ہلاکت طاری کی گئی اور وہ تباہ ہوئے- قران حکیم میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے اور ان پر پتھر برسائے جانے کا ذکر ہے- قران کے بقول

انکم لتاتون الرجال شهوة من دون النساء o

"تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو۔"

ہم جنس پرستی کے موضوع پر مشہور یونانی مفکر افلاطون نے بھی لکھا ہے- لیکن اس نے اپنی بے پناہ عقل کی وجہ سے اس کام کو انسانیت کے لیے مفید قرار دیا ہے- افلاطون کی مشہور زمانہ کتاب "ریپلک" میں ہم جنس پرستی کو قابل قدر اور قابل احترام جذبہ قرار دیا گیا ہے- وہ کہتا ہے کہ

"اچھی اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے بڑے بڑے طریقوں میں سے ایک ہم جنسیت ہے۔"

افلاطون نے ہم جنسیت کو جو ایک اعلیٰ وارفع اخلاقی مرتبہ دیا تھا وہ اس زمانے کے پورے معاشرتی طرز عمل میں قائم رکھا گیا جو یونان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے-

اس امریکی خاتون "رتھ" نے جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں- افلاطون کے اس خیال کی تائید کی ہے اور اپنی طرف سے لکھا ہے کہ

"جب ہم دوسری ثقافتوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ہم جنس پرستی میں مبتلا لوگ کسی لحاظ سے بھی ناکارہ اور مفلوج نہیں ہوتے- وہ ہر معاشرتی صورت حال کا سامنا عام اور معتدل لوگوں کی طرح کرتے ہیں- ان کی شخصیت میں کوئی

رکاوٹ یا خلل واقع نہیں ہوتا- ان کی قوت عمل کسی موقع پر حرکت وعمل سے نہیں جھجکتی- بعض معاشروں میں تو ایسے لوگوں کی خاص طور پر تعریف کی جاتی ہے اور انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

افلاطون سے لے کر اس دور کے امریکی ذہن تک جس کسی نے بھی ہم جنسیت کو اچھا کہا ہے سے غلط تجربہ ہوا ہے یا اس سے بھول ہوئی ہے- جب بغیر بچے پیدا کرنے کی خواہش کے عورت کے ساتھ بھی جنسی ملاپ کرنا عقلاً اور نیچرلی درست نہیں تو ہم جنسیت کیا معنی رکھتی ہے- آدمیت کے لیے جنسی ہوس کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے- صدیوں کی بگڑی ہوئی انسانیت ایک دم سے ان باتوں کو تو نہیں چھوڑ سکتی- لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پھر ان میں سے فوائد ڈھونڈنے شروع کر دیئے جائیں- یہ فطرت اصلیہ کا قتل ہے اور انسانی معاشرے میں اس قسم کے اعمال کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی- اسلام نے ہم جنس پرستی کو "حد سے بڑھی" ہوئی حرکت اس لیے کہا ہے کہ یہ انسانی فطرت کی مخصوص حدود سے باہر کا کام ہے- سرکشی ہے...... آدمیت کے خلاف گویا شیطان کا کام ہے- بہرحال اس موضوع پر اردو میں لکھا جانا بہت ضروری ہے- کیونکہ جو کچھ انگریزی میں دستیاب ہے اور جس کے تراجم ہمارے ہاں ملنا شروع ہو گئے ہیں وہ زیادہ تر اس قسم کی غیر فطری انسانی حرکات کے حق میں ہے- ہمارے ہاں اس موضوع پر بالکل نہیں لکھا گیا- الا یہ کہ کبھی کبھار کسی ضرورت کے تحت ایسا کیا گیا ہو- آخر کیوں؟ فلمیں ڈرامے، افسانے یا شاعری کسی قوم کی تہذیب وثقافت کی بڑی علامات ہیں- قوم کیا ہے؟ کیا کر رہی ہے؟ کن راہوں پہ گامزن ہے؟ قوم میں کیا اچھائیاں، کیا برائیاں ہیں؟ اور زمین پر کب تک باقی ہے؟ ثقافت ہی ان سوالوں کے جواب فراہم کرتی ہے- لیکن ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنی ثقافت کے ذریعے اپنے معاشرے کی اس بہت بڑی برائی یعنی ہم جنس پرستی کا ذکر نہیں کرتی- ثابت ہوا کہ یہ خلاف فطرت فعل عقلی طور پر ہر سطح کے انسانوں کے لیے باعث شرم وعار ہے- اہل یورپ گزشتہ کچھ عرصہ سے اپنی اس برائی کا اعتراف تو کرتے ہیں- لیکن دردناک بات یہ ہے کہ وہ اس فعل کو انسانی حق سمجھ کر اپنے قوانین میں اسے تحفظات دینے کے شرم ناک فیصلوں پر گاہے بگاہے غور کرتے رہتے ہیں- اس کے برعکس ہمارے ہاں مشرق میں اگرچہ یہ بدفعلی کم تو نہیں لیکن ہمارے دانشور اس کا اعتراف

کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

ہم جنس پرستی جسے انگریزی میں ہوموسیکس کہتے ہیں مردوں کی مردوں کے ساتھ اور عورتوں کی عورتوں کے ساتھ جنسی حظ اٹھانے کی بدنام عادت کو کہتے ہیں۔ دراصل جنسی لذت قوت لامسہ کی شدید ترین تسکین کا نام ہے۔ حواس خمسہ میں عموماً حس بصارت کو فوقیت دی جاتی ہے کہ حصول علم کے لیے یہی حس سب سے زیادہ انسان کی مددگار ہے۔ لیکن لطف اندوز ہونے کے معاملہ میں حواس خمسہ کا کردار بیان کرتے ہوئے سب سے زیادہ اہمیت حس لمس کی اسی شدید ترین حالت کو دی جانا چاہیے۔ اب قابل ذکر اور یہ ہے کہ جونہی بدن کو کوئی ایسی چیز چھوتی ہے جو جلد کو متحرک اور خوشگوار محسوس ہو تو بدن میں دو قسم کی جسمانی تبدیلیوں میں سے ایک رونما ہوتی ہے یا رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یا جنسی حظ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جنسی حظ پیدا ہوتے ہی جنسی اعضا کو دماغ سے حرکت میں آنے کا مشن مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک سوال جو انتہائی دلچسپ ہے پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا تمام جانوروں کو بھی اسی طرح محض بدن پر سرسراہٹ محسوس کر کے جنسی تحریک ہوتی ہے؟ یا یہ صرف انسان کی جبلت میں ہے۔ گویا سوال کرنے والا یہ کہنا چاہتا ہے کہ انسان جو جسمانی اعتبار سے مکمل حیوانی جبلتوں کا حامل ہے کیا اس امر یعنی جذبہء شہوت کے سلسلہ میں حیوانات سے مختلف ہے؟ سوال کو مزید سمجھنے کے لیے ہم اسی موضوع یعنی ہم جنس پرستی کو لیتے ہیں۔ کیا ہم جنس پرستی دوسری مخلوقات میں ہے؟ اور کیا دوسرے جانور بھی بغیر افزائش نسل کی خواہش کے جنسی حظ اٹھانے کو بطور عادت اپناتے ہیں؟ اس کا جواب بھی انتہائی دلچسپ اور نئی تحقیق کی دعوت دینے والا ہے۔ جہاں تک میرا ذاتی مشاہدہ ہے دوسرے جانور بھی اپنی تدریجی ترقی کے حساب سے یعنی بتدریج ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے درجوں کے جانور جنسی حظ حاصل کرنے کے لیے ضرورت افزائش نسل کا خیال آہستہ آہستہ چھوڑتے چلے گئے ہیں۔ یہ بات جو میں نے قدرے پیچیدہ پیرائے میں تحریر کی ہے۔ بندروں کی مثال سے صحیح طور سے سمجھ میں آ جائے گی۔ چڑیا گھروں میں عموماً بن مانسوں اور بندروں کی کچھ اقسام سیر کو آنے والی خواتین کو دیکھتے ہی جنسی تحریک کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اب یہاں افزائش نسل کی تمنا کارفرما تو نہیں ہوتی۔ پھر کیوں جنگلے میں بند جانور اپنے سے غیر مخلوق کی مادہ کو دیکھتے ہی جذبہء شہوت کی تسکین کے لیے بھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے جانور مثلاً کتا، گدھا، گھوڑا مادہ کی موجودگی کے بغیر بھی جنسی اعضاء کی طرف سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور

ان میں جنسی ملاپ کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس خواہش کی شدت "القلیل کا معدوم"(۱۱۵) کے مصداق ہے۔ اسی طرح ماہرین جنسیات نے بھی جانوروں پر لیبارٹری میں تجربات کے دوران اس نہ سمجھ میں آنے والے جذبے کا مشاہدہ کیا ہے۔ یعنی سادہ الفاظ میں ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ جانور جو محض اولاد پیدا کرنے کے لیے جنسی ملاپ کرتے ہیں اور جو ایک خاص قسم کی خوشبو محسوس کرنے کے بعد ایک دوسرے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کیونکر اچانک اور بلاجواز جنسی طور پر متحرک ہو جاتے ہیں...... لیکن اس کا جواب پھر نظریہ ارتقا کے ثبوت میں چلا جاتا ہے۔ زمین پر جانور اور پودے پیدا ہوئے۔ پہلے سمندر میں پھر خشکی پر انہوں نے وجدانی طور پر نسل بڑھائی اور پھر بتدریج ان کے اعضاء تبدیل ہوتے چلے گئے۔ پچھلی نوع سے اگلی نوع زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ظہور پذیر ہوتی چلی گئی۔ یہ سفر منزل انسانیت کی طرف جوں جوں طے ہوتا گیا جابجا شعور کی آمد آمد کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بڑے شہر کے قریب پہنچنے والا مسافر دور سے ہی مضافاتی آبادیوں کو دیکھنا شروع کر دے...... شعور آنے والا تھا۔ شعور کے مضافات نمایاں ہونے لگے۔ انسان سے قبل کی نوع پھر اس سے قبل کی نوع پھر اس سے قبل کی نوع...... اسی طرح پیچھے کی طرف جوں جوں بڑھتے چلے جائیں انسانی شعور کے مضافات درجہ بدرجہ معدوم ہوتے چلے جائیں گے۔ گویا انسان سے پہلی انواع شعور کے پیالے سے قطرہ قطرہ پیتی رہیں یا بقول مذہب شعور کے درخت سے جرع جرع نچوڑتی رہیں اور پھر آخر میں خلقاً آخر الانسان(۱۱۶) نے پورا شجر توڑ لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماہرین نظریہ ارتقاء کا یہ اعلان اگر درست ہے تو اس کی روشنی میں جنسیات کا وہ مبہم عمل بھی معنی خیز ہے؟ یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان سے پہلے کی کوئی نوع مثلاً بن مانس وغیرہ انسان کی طرح افزائش نسل کی ضرورت کے بغیر محض لطف لینے کے لیے جنسی طور پر متحرک ہوتی ہو۔ جواب یہ ہے کہ ہاں...... انسان سے پہلے نزدیکی ادوار کی انواع میں کسی حد تک محض لطف کی خاطر جنسی رغبت پائی جاتی تھی۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن کیا انسان کی طرح دوسرے جانور بھی ہم جنس پرستی کرتے ہیں۔ اس کا جواب ہے نہیں۔ کتا، سور، ریچھ گیدڑ، بھیڑیا غرض کوئی جانور بھی ہم جنس پرستی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ یہ کارنامہ صرف انسان سے سرزد ہوتا ہے۔

گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان نے محض اپنے شعور سے ہم جنس پرستی کو اپنایا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خلعت بشری زیب تن کرنے کے بالکل ابتدائی دنوں میں جب وہ زمین کے لالہ زاروں میں آوارہ پھرتا تھا۔ جب اسے شکار کرنے اور سونے کے علاوہ صرف جنسی ملاپ کا کام سرانجام دینا ہوتا تھا۔ جب اس نے اپنے ننگے بدن کو پتوں سے ڈھانکنا شروع کر دیا تھا۔ گویا جب شعور اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک سجا رہا تھا...... اور جب وہ جناتی خصلتوں کا حامل تھا اس وقت سے ہی اس نے ہم جنس پرستی کا طریقہ بھی اپنا لیا ہوگا۔ کیونکہ گزری ہوئی بحث میں ہم یہ ثابت کر آئے ہیں کہ حیوانات میں اپنی اپنی سطح پر وقت کے ساتھ ساتھ افزائش نسل کی خواہش کے بغیر جنسی ملاپ کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ شعور ملنے کا مطلب ہی یہی تھا کہ انسان بقائی ہوش وحواس وہ حیوانی عادتیں ترک کر دے جنہیں شیطانی یا جناتی کہا جا سکتا ہے اور جو شعلہء نار کی طرح ابن آدم کی آدمیت کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہیں۔

ہم جنسی پرستی بھی ایک ایسا ہی عمل ہے اس میں نر اور مادہ تو ہوتے نہیں دونوں طرف سے ایک ہی جنس کے افراد شریک ہوتے ہیں۔ نوعمر لڑکے جن کے چہرے سے مردانگی کی جگہ ابھی نسوانی خدوخال ظاہر ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس فعل میں مفعول کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ فاعل و مفعول دونوں ہم عمر اور غیر نسوانی خدوخال کے مالک ہوں۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں ہم جنس پرستی زیادہ ہیجانی انداز کی ہوتی ہے۔ خصوصاً یورپی تہذیب کے غلبے کے بعد دنیا بھر میں عورتوں کی ہم جنس پرستی نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اہل یورپ کی سوچ مادی ترقی کی وجہ سے دہریت کی طرف مائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ آج تک کوئی معاشرتی نظام ایسا نہیں بنا سکے جس میں اخلاقی اقدار کا خیال رکھا گیا ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہم جنس پرستی جیسے غیر فطری عمل کو تحفظات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملے میں انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ یورپ میں بہت سی صنعتیں صرف عورتوں اور مردوں کے لیے ہم جنس پرستی کے آلات بناتی ہیں اور وہ آلات دنیا کے ہر ملک میں آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اب اس شعبہ میں بعض مشرقی ممالک بھی داخل ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ربڑ کا عضو تناسل اور اندام نہانی جیسے آلات بھی بڑے شہروں کے سپر سٹورز پر مل جاتے ہیں اور گرلز ہائی سکول اور کالجوں کے ہاسٹلوں میں آئے دن لڑکیوں کی ہم جنس پرستی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انسان اتنا کیوں گرا اور اگر گر چکا ہے تو

یوں کر سنبھل سکتا ہے؟

انسان کا جنسی استحقاق

ظاہر ہے اس دور کے انسانوں کو مذہبی احکامات یا نصیحتوں سے ڈرا کر یا بوجھل قسم کی غلاقیات کا درس دے کر ان غیر فطری اعمال سے روکنا فضول ہے۔ جنہیں وہ جدید سائنس کے وتے ہوئے عقلی بنیادوں پر اپنائے ہوئے ہیں۔ البتہ ان جدید علوم کو پسند کرنے والے جدید دور کے لوگوں کو انسان کے ارتقائی مراحل سمجھا کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کو انسان نے فطری طور نہیں اپنایا بلکہ جب تک انسان ''شعور'' سے دور تھا دوسری مخلوقات کی طرح قدرتی طریقوں پر عمل کرتا تھا اور جب انسان کے پاس عقل آ گئی تو اس نے جان بوجھ کر ان راستوں کو اپنا لیا جن کی اجازت نیچر نہیں دیتی۔ لہٰذا اب انسان چونکہ ماضی سے زیادہ سمجھ دار ہے اس لیے اسے چاہیے کہ شعوری طور پر ان چیزوں کو ترک کر دے۔ تاکہ وہ مقام آدمیت پر فائز ہو سکے اور زمین کا بگڑا ہوا ماحول سنور سکے۔ اس لیے قرآن حکیم نے انسان کو ان چیزوں سے منع کیا ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ یہ اعمال جو جانوروں سے بھی سرزد نہیں ہوتے انتہائی شرم ناک ہیں اور یوں انسان جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہو چکا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنا اصل جنسی استحقاق استعمال کرتے ہوئے...... میاں بیوی کے رشتوں کو استوار کرے اور افزائش نسل کی غرض سے جنسی ملاپ کی روش اپنائے تاکہ ہوس پرستی کا یہ سیلاب ختم ہو اور انسانیت کی ناؤ ساحل مراد سے آ لگے۔

باب ۹

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

کہتے ہیں کہ یہ کائنات "کشش" کی چند اقسام کے زیر اثر ہے۔ علماء سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ زمین پر سب سے بڑی قوت کشش "کشش ثقل" ہے۔ کرۂ زمین کے مرکز میں دباؤ کی وجہ سے درجہ حرارت ۸ ہزار سینٹی گریڈ سے زیادہ ہے۔ جہاں تمام مادے پگھلی ہوئی حالت میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہی مقام ہے جہاں سے زمین کی کشش ثقل پیدا ہوتی ہے۔ جو کرۂ ارض پر موجود حتیٰ کہ کرۂ ارض کے قریب موجود ہر جسم کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو سورج کی وہ بے پناہ کشش ہے جو زمین سمیت تمام سیاروں کو اپنے دام فریب میں جکڑے ہوئے ہے۔ مادی دنیا میں جس قدر عظیم الشان قوت کی حامل یہ کشش ثقل ہے انسانی دنیا میں نسبتاً اس سے کہیں زیادہ قوت...... کشش جنس مخالف میں ہے۔ جنس مخالف یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد میں ایک دوسرے کے لیے زبردست جاذبیت اور وصال کی قوت پائی جاتی ہے۔ لیکن جسمانی ساخت کے اعتبار سے جو مقام عورت کے حصے میں آیا ہے وہ طاقت کے حوالے سے تو کمزور لیکن بناوٹ کے حوالے سے انتہائی دلکش ہے۔ عورت جوان ہونا شروع ہوتی ہے تو اس کے جسم میں ایسے آثار نمایاں ہونے لگ جاتے ہیں جن میں نزاکت، نرماہٹ اور رومانویت موجود ہوتی ہے۔ اس کی سڈول بانہیں، ملائم جلد، چمکدار آنکھیں، سینے پر ابھرتی ہوئی مخروطی چٹانیں، چال ڈھال اور کھنکتی ہوئی نقرئی آواز یہ سب ایسی چیزیں ہیں جنہیں خالق کائنات سمیت ہر ذی شعور نے حسن کے استعاروں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی، مفکر اور دانشور عورت کی اس فطری برتری سے انکار نہیں کرتے۔ شعراء کرام جنہیں اقبال قوم کے دیدہ ہائے بینا کہتا ہے۔ عورت کی جسمانی ساخت کی ان خوبیوں کے گیت گاتے نہیں تھکتے۔ نغمہ خواں، داستان گو، واعظ، ڈرامہ نگار، قلم کار اور مصور جو اقوام کی تہذیبوں کے محافظ ہوتے ہیں عورت کی ایک جنبش ابرو کے لیے ترستے نظر آتے ہیں۔ دنیا میں آدھی کے قریب صنعتیں اور کارخانے عورتوں کا سامان بناتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ ایک گھر سے

لے کر ایک معاشرے تک انسانی زندگی عورت کا طواف کرتی کیوں نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ تمام مذاہب اور پھر ان مذاہب کے خدا بھی عورت کی مدح سرائی میں کسی سے پیچھے نہیں۔

ایک لمحے کے لیے غور کیجیے۔ جنت جس کا نقشہ تمام مذاہب نے اپنے اپنے رنگ میں کھینچا ہے عورت کے بغیر کیسی ہوگی؟ یعنی اگر فرض کر لیا جائے کہ جنت میں نہ حوران بہشتی ہیں اور نہ عورت تو جنت کا تمام تر خواب ناک اور پرکشش ماحول بے کیف اور خشک ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ کارگہ عالم میں عورت کے ذکر کے بغیر کوئی معنی نہیں بھرے جا سکتے۔ گویا

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

یہ بات درست نہیں کہ عورت معاشرتی زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ ہے۔ حقیقت میں معاشرتی زندگی کی گاڑی کے تمام پہیے صرف مرد ہیں۔ جبکہ عورت اس گاڑی کا انجن ہے۔ کیونکہ زندگی کا تمام تر بوجھ تو بلاشبہ مرد کے کندھوں پر ہے۔ لیکن اس وقت تک کوئی مرد بھی متحرک ہونے کے لیے تیار نہیں جب تک اس کی پشت پر عورت ایک خارجی مہیج کے طور پر نہ ہو۔ مثل ہے کہ ہر جہانگیر کی پشت پر کسی نور جہان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ افراد معاشرہ جب اپنے لیے مناسب شہری زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو ان کے فیصلے پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا جذبہ "قرب عورت" کا ہوتا ہے۔ معاشرے کے تمام پیشے، کاروبار اور معاملات جنس مخالف کی ہمراہی کی بدولت بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ مشہور ماہر نفسیات فرائڈ نے اپنے تمام تر مطالعہ کا یہی نتیجہ نکالا ہے کہ

"بالآخر عورت ہی ہے جس کے ہاتھوں میں بھٹکے ہوئے انسان کی غلطی کے ازالے کا راز موجود ہے۔ وہ انسان جسے بہشت کے باغات میں عورت کی راہ زنی کی بدولت ٹھوکر لگی۔ اگر سنبھل سکتا ہے تو عورت ہی کی رہبری کے طفیل۔"

فرائڈ کا یہ خیال دوسرے الفاظ میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور وہ الفاظ فرانس کے بانی انقلاب نپولین بونا پارٹ کے ہیں کہ

"مجھے بہترین مائیں دے دو میں تمہیں عمدہ نسل دے دوں گا۔"

ایک ماں کی حیثیت سے عورت کا مطالعہ انتہائی دلچسپ ہے۔ اس معصوم بچے کے دل و دماغ پر جس نے آنے والے کل میں قوم کی زمام اقتدار تھامنی ہے۔ ماں کے روپ میں عورت کا سایہ

سب سے پہلے پڑتا ہے- ماں جب اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے لگا کر لوریاں دیتی ہے جب اس کو اپنے پستانوں کا دودھ پلاتی ہے- اس کے ساتھ کھیلتی ہے- اس کی ضروریات زندگی پوری کرتی ہے- اس کے ساتھ سوتی ہے اور ہر وقت اس کے سامنے رہتی ہے تو ماں کی شخصیت کا گہرا اثر بچے کے کردار پر پڑتا ہے- گویا مرد کی زندگی پر سب سے پہلا سایہ عورت کا پڑتا ہے- جو بچے پیدا ہونے کے بعد صرف مردوں کے ہاتھوں میں پلتے ہیں ان میں...... اور ان میں جو بچے آغوشِ مادر میں پرورش پاتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یوں عورت کی گود میں پل کر جوان ہونے والا بچہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی کسی عورت ہی کے اشاروں کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے- کیونکہ وہ عورت ہی تھی جس نے اسے سب سے پہلے زندگی کے اشارے سمجھائے- تو پھر کیوں نہ ایسا ہو کہ معاشرے کے مرد زندگی بھر عورت کے اشاروں پر ناچتے رہیں- یعنی حقیقت میں عورت ہی وہ شمع ہے جس کے تاب دار شعلے پر ازل سے ہی نسل آدم کے پروانے رقص کرتے چلے آئے ہیں- شمع پر پروانوں کا رقص، رقصِ موت، رقصِ آخری، ہابیل اور قابیل کا تمثیلی قصہ بھی بائبل نے یہی مضمون واضح کرنے کے لیے بیان کیا ہے- اس قصے میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ زمین پر پہلا قتل بھی عورت ہی کے باعث ہوا-

مادی دنیا میں کششِ ثقل کی قوت بلاشبہ بے پناہ ہوگی- لیکن انسانی زندگی میں قوتِ کششِ جنسِ مخالف بے حد عظیم ہے- کیونکہ انسان جس نے تسخیر کائنات کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور جو اپنے پیر کی ایک ٹھوکر سے عظیم الہیبت پہاڑوں کو جڑ سے ہلا دینے کی صلاحیت کا حامل ہے- جب فعال اور متحرک ہوتا ہے تو اس کے سینے میں عورت کے وصال کی سرشاری ایک زبردست محرک کے طور پر موجود رہتی ہے- دوسری جنگ عظیم کا ایک دلچسپ واقعہ مطالعہ کے دوران نظر سے گزرا-

"کسی پوسٹ پر جرمن کے کچھ فوجی عرصہ دراز سے پڑے تھے- ان کی داڑھیاں اور بال جنگلی گھاس کی طرح بڑھ چکے تھے- مہینوں کپڑے نہ بدلتے اور نہ ہی نہاتے- جنگل کی زندگی، جنگ کی طوالت اور مدت سے شہری زندگی کی دوری نے انہیں انسان سے جانور بنا دیا تھا-

طویل عرصے بعد اتفاقاً وہاں کوئی بڑا فوجی آفسر آیا اور چند دن قیام پذیر رہا- اس کے ہمراہ اس کی نوجوان بیوی اور سالی بھی تھی- محض دو عورتوں کی موجودگی نے پوسٹ پر

موجود تمام فوجیوں کو دو دن کے اندر چاک و چوبند کر دیا- انہوں نے بال کٹوائے کپڑے بدلے اور چست و چالاک ہو گئے- گویا محض عورت کی موجودگی کے احساس نے ان کی بے جان اور خشک رگوں میں تازہ رس ڈال دیا-"

زبردست محرک

عورت مرد کی فعال زندگی کا ایک زبردست محرک ہے- یہ اسکندریہ کی ملکہ "قلوپطرہ ہو" یا اہل کی "زہر جمال" اور "بیدخت" - یہ پطرس اعظم کی نوجوان بیٹی ہو یا شہنشاہ رچرڈ کی بہن ملکہ "جین" - یہ اندلس کے آخری تاجدار ابو عبداللہ کی عیسائی ماں ہو یا اکبر اعظم کی ہندو بیوی- یہ کارل مارکس کی رفیقہء حیات ہو یا شہنشاہ ایران کی جوان ملکہ- یہ نپولین کی جوزیفین ہو یا ہٹلر کی ایوا براؤن- یہ جہانگیر کی مہر النساء ہو یا شاہ جہان کی ممتاز- یہ شہزادہ چارلس کی لیڈی ڈیانا ہو یا یاسر عرفات کی نوعمر عیسائی بیوی، یہ عورت ہی ہے جس کے اشاروں پر ناچتے ہوئے بڑے بڑے فاتحین نے ملکوں کے نقشے بدل ڈالے-

ادب کی دنیا میں صنفِ نازک کے خیال سے ایسے ایسے مضمون باندھے جاتے ہیں جن میں دنیا بھر کی تشبیہات کو کسی ماہ جبین کی انگڑائی پر وار دیا جاتا ہے- آنکھ کو نرگس، ہونٹ کو پنکھڑی، رخسار کو گلاب، قد کو سرو، گردن کو صراحی، چہرے کو کتاب اور زلفوں کو رات کہتے ہوئے شاعر کبھی نہیں تھکتا- یہیں پر بس نہیں، جنگ و جدل جیسے کھردرے موضوعات بھی صنفِ نازک کے ذکر سے خالی نہیں- عرب کے جنگجو سپاہی بہ یک وقت شمشیر زنی اور گیسوئے محبوب کی قصیدہ خوانی ایک جیسی مہارت سے کرنے میں شہرت رکھتے تھے- اسی طرح میدان حکومت اور سیاست کے شہسوار، دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور نامور جرنیل اپنی نجی زندگیوں میں ہمیشہ عورت کے آنچل سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے رہے-

عورت فضائے عالم کی وہ دلکش قوس قزح ہے جس کے ایک ایک رنگ سے زندگی کے سوسو سوتے پھوٹتے ہیں- جس کی سانس کارگہء کائنات کے سینے میں چلتی ہے- عورت انسانی زندگی کا وہ بھاری پلڑا ہے جو ہمیشہ جھکا رہتا ہے- کیا یہ سچ نہیں کہ مرد نے عورت کے حضور انتہائی قدم اٹھایا تو

اسے مافوق الفطرت ہستی بنا کر اپنے عقائد میں شامل کر لیا......اس موضوع پر ایک مکمل کتاب ''خدا جب عورت تھا'' (When god was woman) یورپ میں شائع ہوئی۔ ''وائلن ڈورف کی وینس''......اس کی صرف ایک مثال ہے۔ ہندوؤں میں تو ''ماں دھرتی'' اور گاؤ ماتا بھی اسی کی مثالیں ہیں۔ پرستان کی پریوں سے کون واقف نہیں۔ سکندر اعظم کے آب حیات کی طرح پرستان کی ان پریوں کا تصور بھی مرد کا ایک دلفریب خواب ہے۔ بڑے بڑے مصلح، عظیم قائد، ولی، غوث، قطب حتیٰ کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی عورت کی اس اہمیت سے انکاری نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''مجھے تین چیزوں سے محبت ہے۔ عورت، خوشبو اور نماز''

اسلام نے عورت کے معاملہ کو جس نقطہء نگاہ سے معاشرے کے سامنے پیش کیا ہے اس کی معمولی جھلک بھی دنیا کے ان نام نہاد جدت پسندوں کے افکار پر بھاری ہے۔ قرآن حکیم نے عورتوں کے حقوق اور فرائض بیان کرتے ہوئے انہیں مردوں کے برابر ہی نہیں۔ مردوں سے ایک لحاظ میں بڑا درجہ بخش دیا ہے۔ مریم کی ماں اور عمران کی بیوی نے جب گھبرا کر اپنے مالک سے فریاد کی کہ ''اے اللہ! تو نے میرے پیٹ میں بیٹی ڈال دی تو جواب آیا۔

''لیس الذکر کالانثی'' مرد عورتوں جیسے (بہتر) نہیں ہیں۔

موجودہ زمانے میں یورپ کے اہل دانش نے عورت کی بے بسی اور کسم پرسی کا جو جعلی واویلا مچا رکھا ہے۔ یہ دراصل ان کی اپنی تہذیب کا المیہ ہے۔ اسلام نے عورت کو چادر اور چاردیواری دے کر جس مسند شاہی پر متمکن کر دیا ہے۔ یورپ کی نام نہاد آزادی عورت کے حق میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتی۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

ان المسلمین والمسلمٰت و المومنین والمومنات......

لہٰذا یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہو گا کہ عورت کا وجود ہی تصویر کائنات کا سب سے حسین رنگ ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

''زین للناس حب الشھوات من النساء''

''انسانوں کے لیے زینت ہے شہوات کی محبت عورتوں میں سے''

عورت کی مکار فطرت

عورت دنیا بھر میں اپنے مکر و فریب کے حوالے سے خوب پہچانی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس سلسلے میں عورت کو قطعاً قصوروار نہیں سمجھتے۔ لیکن یہاں ہم نے اس امر پر بحث کرنی ہے کہ آیا عورت واقعتاً مکار ہے یا نہیں؟ بات یہ ہے کہ عورت زمانہء قدیم سے اپنی چالاکی اور چاپلوسی کے حوالے سے مشہور ہے۔ مثلاً ہے کہ ''فساد کی بنیاد زن، زر، زمین سے ہوتی ہے۔'' ماضی میں عورت نے ہمیشہ فساد برپا کروانے اور قتل و خون ریزی میں بے مثال کردار ادا کیا۔ بے مثال ایسا کہ بڑے بڑے فاتحین اور سلطانوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔ عورت کے اسی کردار کی بدولت مذہب نے بھی آہستہ آہستہ اپنے ذخیرہ روایات میں عورت کی چاپلوسی، چالاکی اور طوطا چشمی کی کہانیوں کو شامل کر لیا۔ بائبل اس طرح کے قصوں سے بھری پڑی ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر ہم پچھلے ابواب میں کر چکے ہیں۔ عورت نے اپنے اس منفی طرز عمل کو اپنی شخصیت کا یوں حصہ بنایا کہ مکاری اور چاپلوسی عورت کی پہچان بن گئیں۔ قرآن میں عزیز مصر نے اپنی بیٹی پر تبصرہ یوں کیا۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

''ان کیدکن عظیم''

''عزیز مصر نے کہا کہ بے شک یہ عورتیں مکار ہوتی ہیں''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ آپ عورتوں کو دیکھ کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللھم انی اعوذ بک من فتنة النساء

اے اللہ! مجھے عورتوں کے فتنوں سے بچا۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہو گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان روایات کی صحت پر بحث کریں اور موجودہ منطقی طرز استدلال سے جدت پسندی کے وہم میں ان کی حقانیت سے انکار کریں۔ جیسا کہ فی زمانہ ہمارے کچھ احباب نے وطیرہ اپنا رکھا ہے۔ عورت کے عیارانہ کردار سے ہمارے قصے کہانیوں میں چڑیل کے تصور نے جنم لیا۔ اس کے دو آنسو پتھر

کے کلیجے کو پگھلا دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں- اس کی چاپلوسی اور خوشامد اچھے اچھے پروقار اور پہاڑ جیسے مردوں کو اپنے پیروں پہ متزلزل کر دیتی ہے- اس کا جھوٹا وعدہ انتظار کرنے والوں کو پتھر کر دیتا ہے-

اس کی چال زمانے کی تہذیبوں کو اپنے تعاقب میں لگا لیتی ہے- اس کی کھنکتی ہوئی آواز بڑے بڑے سورماؤں کو اپنے سحر میں جکڑ کر سر کٹانے پر آمادہ کر دیتی ہے- اس کی جنبش آبرو آہنی کلیجے کو گھائل کر دیتی ہے اور اس کی زلفیں دھر کے معماروں کے مقدر پر سیاہ رات کی طرح چھا جاتی ہیں- یہ اکڑ والوں کی اکڑ اور مستی والوں کی مستی نکال کر انہیں اپنا تابع فرمان بنا لیتی ہے- اس نے کنیزوں' شہزادیوں' رانیوں اور ملکاؤں کے روپ میں محلاتی سازشیں کر کے مملکتوں کی بساطیں الٹ دیں- اس نے بڑے بڑے فاتحین کو اپنے دام فریب میں جکڑ کر دنیا کے نقشے بدل دیئے- ''مونالیزا'' کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر لاکھوں ڈالر میں خریدنے والے لوگ اس کی زلفوں کے اسیر کیوں نہ ہوں- شیکسپیئر نے زندگی بھر عورت کی اسی تصویر کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے رکھا- اس کے مشہور زمانہ ڈرامہ ہیملٹ کا ہیرو جو ایک جذباتی شہزادہ ہے- عورت کے رحم کو ''جہنم کا دہانہ'' کہتا ہے- جہاں سے آنے والا ہر شخص مجرم اور گناہگار ہے- وہ عورت کو معاشرے کے بگاڑ کا سب سے بڑا مجرم سمجھتا ہے- عورت جس قدر نازک اندام اور کومل ہے- اس سے کہیں زیادہ سفاک اور خطرناک ہے- اس کا ہر روپ موت کا روپ ہے اور اس کے ساتھ ہر ناطہ تلوار کی دھار پر بیٹھ کر قائم رکھنا پڑتا ہے- دراصل ''عورت'' کو ''مرد'' نے شعور کے ابتدائی دنوں میں ہی طاقت کے بل پر اپنا مطیع بنانے کا کام مکمل کر لیا تھا- لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جس طرح مرد کو شعور کی دولت عطا ہوئی- اسی طرح عورت کو بھی شعور دیا گیا تھا- اب صورت حال یہ تھی کہ مرد اور عورت ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تو ہم پلہ ہوئے لیکن جسمانی ساخت کی بدولت عورتیں' مردوں سے پیچھے رہ گئیں- نتیجتاً مردوں نے عورت پر جسمانی غلبہ حاصل کر لیا اور وہ حسد جو ذہنی صلاحیتوں کے برابر ہونے کی وجہ سے مرد کے دل میں پیدا ہوا تھا...... عورتوں کے دل میں جا کر احساس کمتری اور احساس محرومی کی پیدائش کا باعث بنا- ہزاروں سال تک اپنی کمزوری کے باعث احساس محرومی میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر عورتوں کی کمیونٹی ''اجتماعی'' طور پر اخلاقی انحطاط کا شکار ہوگئی- اسی اخلاقی انحطاط نے عورت کی ناپسندیدہ عادات کو جنم دیا...... اور یوں عورت بڑے بڑے دانشوروں کی نظر میں بھی ملعون ہوگئی

لیکن جہاں اس نفسیاتی تاریخ کا اثر ہے وہاں عورتوں کی حیثیت اور مقام کو گرانے میں تحریف شدہ بائبل یا عیسائیت نے بھی کچھ کم کردار ادا نہیں کیا- بائبل میں ہے کہ......

''جو کوئی خدا کو پیارا ہے وہ اپنے کو عورت سے بچائے گا- ہزار آدمیوں میں سے میں نے ایک کو خدا کا پیارا پایا ہے- لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو خدا کو پیاری ہوتی-''

بائبل میں یہ بھی ہے کہ ''عورت موت سے زیادہ تلخ ہے-''

''ترتولیان'' مسیحیت کے ابتدائی دور کا امام ہے- اس کے بقول......

''عورت شیطان کے آنے کا دروازہ ہے...... وہ مرد کو غارت کرنے والی ہے-''

ایک اور بڑے مسیحی امام ''کرائی سوٹم'' کے بقول......

''عورت ایک ناگزیر برائی' ایک پیدائشی وسوسہ' ایک مرغوب آفت' ایک خانگی خطرہ' ایک غارت گر بلا اور ایک آراستہ مصیبت ہے-''

ہم نے عیسائیت کی نظر میں عورت کا مقام ملاحظہ کیا...... لیکن پھر آپ یہ کہیں گے کہ حضورؐ کی دعا...... اے اللہ! مجھے عورتوں کے فتنے سے بچا- یا یہ حدیث کہ جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگی...... یا اس قسم کی دیگر احادیث...... کی حیثیت کیا ہے؟ اگر مسیحیت قابل تنقید ہے تو اسلام نے کون سی بھلائی کی ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں- ہم نے کہا ہے کہ ان احادیث کی صحت مشکوک بھی ہو سکتی ہے- کیونکہ یہ تو چند احادیث ہیں...... قرآن و احادیث کا زیادہ تر حصہ تو عورت کے مقام پر مشتمل ہے- بقول اقبالؒ......

''اگر میں غیر مسلم ہوتا تو قرآن حکیم کو کسی عورت کی تصنیف سمجھتا- کیونکہ قرآن حکیم میں عورت کو بے پناہ رعایتیں اور حقوق دیئے گئے ہیں-''

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت مظلوم ہے- اس لیے کہ روز ازل سے لے کر آج تک مردوں نے عورت کی شعوری ہم سری برداشت نہیں کی- حالانکہ صحائف کے نزدیک تو عورت کو مرد سے بھی پہلے شعور حاصل ہوا- بائبل میں ہے کہ...... ''نیکی اور بدی کی پہچان کے درخت کو کھانے کا مشورہ سب سے پہلے عورت نے دیا-'' البتہ قرآن حکیم نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور یوں کہا ہے

کہ شیطان نے دونوں کو بہ یک وقت ورغلایا۔

عورت سے مرد کی یہی حاسدانہ پالیسی انسانی معاشرے کے بگاڑ کا باعث رہی ہے۔ آج بھی اگر مرد اور عورت کے مقام کا قرآنی تعین دل و جان سے قبول کر لیا جائے تو خطہء زمین کو جنت بنایا جا سکتا ہے۔ ماضی کا انسان عورت سے حسد کرتا تھا...... اس کی بصیرت' اس کی نزاکت' اس کی برداشت' اس کا تحمل' اس کی نفاست' اس کا حسن...... مردوں کے دل میں چبھتے تھے۔ اطالویوں کی ضرب المثل ہے......

"گھوڑا اچھا ہو یا برا اسے مہمیز کی ضرورت ہے' عورت اچھی ہو یا بری اسے مار کی ضرورت ہے۔"

سپین والوں کی ضرب المثل ہے......

"عورت کی اچھی صورت پر بھروسہ بے وقوفی ہے۔"

افلاطون جیسا فلسفی عورت کی تخلیق کے حوالے سے یوں رقم طراز ہے کہ......

"انسان شروع میں ذو جنسی تھا۔ یعنی مذکر اور مؤنث ایک ہی جسم میں اکٹھے تھے۔ اس کی چار ٹانگیں' دو چہرے اور چار بازو تھے۔ اس نے اپنے خالق "زیوس" کے خلاف بغاوت کر دی۔ سزا کے طور پر انہیں آدھا آدھا کر دیا گیا۔ جن میں سے ہر ایک کے پاس دو ٹانگیں' ایک چہرہ اور دو بازو آ گئے۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ تب سے یہ دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں تا کہ اپنی تکمیل کر سکیں۔"

"ارسطو" کے نزدیک عورت کی نسائی خصوصیات دراصل فطری نقائص ہیں۔ قدیم یہودی قانون کی رو سے کنواری لڑکی دعا کی بھی مستحق نہیں ہوتی۔ رومی شاعر "ورجل" کے بقول......

"عورت ہمیشہ ناپائیدار ہوتی ہے۔"

رومی مصنف "جیووینل" کے خیال میں......

"عورت سے بڑھ کر کوئی بھی کینہ پرور نہیں۔"

سکاٹش مذہبی اصلاح پسند "جان ناکس" کے الفاظ میں......

"عورت کی حکمرانی فطرت کو سخت ناپسند ہے۔ یہ خدا کے لیے توہین آمیز ہے۔ حتیٰ کہ کامل مساوات کے نظام خیر سے انحراف ہے۔"

"ولیئم شیکسپیئر" کا کہنا ہے کہ......

"اے کمزوری! تیرا نام عورت ہے"

"سیموئیل بٹلر" کے الفاظ میں......

"عورتوں کی روحیں اس قدر چھوٹی ہیں کہ بعض لوگ یقین رکھتے ہیں کہ عورتوں میں روح ہی نہیں ہوتی۔"

"ولیم کنگریو" کے الفاظ میں "جہنم میں بھی عورت کی حقارت جیسا غصہ نہیں۔"

"الیگزنڈر پوپ" کے مطابق......

"بہر کیف...... عورتیں کسی کردار کی حامل نہیں ہوتیں...... کچھ مرد کاروبار کے لیے اور کچھ تفریح کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن عورت محض جنسیت کے لیے ہوتی ہے۔"

"سیموئیل جانسن" کی زبان میں......

"ایک عورت کی اصلاح کسی کتے کا اپنی پچھلی ٹانگوں پہ چلنے کے برابر ہے۔"

برطانوی ناول نویس "ولیم میک پیس تھیکرے" کا کہنا ہے کہ

"کچھ ایسی کمینگیاں ہیں جو مرد کے لیے بھی انتہائی پست اور گھٹیا ہیں۔ لیکن ایک دلفریب عورت تنہا ان کے ارتکاب کا حوصلہ رکھتی ہے۔"

برطانوی ناول نویس "جارج میری ڈیتھ" کے الفاظ ہیں......

"مجھے توقع ہے کہ عورت وہ آخری شے ہوگی جسے مرد مہذب بنائے گا۔"

مشہور جرمن فلسفی فریڈرک کے بقول "عورت خدا کی دوسری غلطی ہے"

"سگمنڈ فرائڈ" کے الفاظ یہ ہیں کہ

"عظیم سوال...... اپنی تیس برسوں پر محیط نسائی روح کے متعلق تحقیق' کے باوجود جس کا جواب دے پانے کا اہل نہیں ہوں یہ ہے کہ عورت کیا چاہتی ہے؟"

مشہور مصور "پکاسو" کے نزدیک......

"عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں' دیویاں یا پائیدان"

عورت کے بارے میں ان آراء کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ عورت سے بھلائی کی

توقع کی جاسکتی ہے- لیکن درحقیقت عورتوں کی یہ حالت سراسر مردوں کی زیادتی کا نتیجہ ہے- حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کی گاڑی عورت اور مرد کی مساوی کوشش سے منزل مراد تک پہنچ سکتی ہے- اس سلسلے میں قرآن حکیم نے انسانوں کو "حرف آخر" ہدایات عطا کر دی ہیں- اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ کس طرح اشرف المخلوقات بن کر دکھاتا ہے-

عورت ماں کے روپ میں

ماہرین حیاتیات نے تجربہ کیا ہے کہ ماں کے جسم میں کچھ خاص قسم کے غدود ہیں جو بوقت ضرورت ہارمونز خارج کرتے رہتے ہیں- یہ ہارمونز خون میں شامل ہوتے ہیں اور بدن پر کیفیت طاری ہو جاتی ہے- یہ کیفیت ممتا کا جذبہ ہے- انہوں نے چوہیوں پر متعدد تجربات کیے- ایک چوہیا کا آپریشن کر کے اس کے بدن میں سے ممتا کے غدود نکال دیئے گئے- پھر جب اس چوہیا نے بچے جنے تو اس کو بچوں کی طرف کوئی رغبت نہ ہوئی- دودھ پلانا تو درکنار اس نے اپنے بچوں کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا- بعض ایسے جانور بھی ہیں جن میں ممتا کے غدود قدرتی طور پر نہیں ہوتے- لہٰذا وہ بچے پیدا کرتے ہی انہیں چھوڑ جاتے ہیں- حتیٰ کہ بعض حشرات الارض تو اس جذبے سے اس قدر محروم ہوتے ہیں کہ اپنے ہی بچوں کو کھا جاتے ہیں- ان میں سانپ اور بچھو کے علاوہ بھی کچھ جنگلی جانور اور حشرات شامل ہیں- انسان جسمانی اعتبار سے جانوروں سے مختلف نہیں اور اس کے تمام حیاتیاتی تقاضے جانوروں جیسے ہیں- یہی وجہ ہے کہ انسان میں بھی جانوروں کی طرح حیوانی جذبات پیدا ہوتے اور سر چڑھ کر بولتے رہتے ہیں- انسانی معاشرے میں ماں جہاں محبت' رحم' شفقت اور ایثار کی علامت ہے- وہاں یہ بات بھی آئے دن ثابت ہوتی رہتی ہے کہ ماں ممتا کے جذبات سے عاری اور بے گانہ ہو جاتی ہے- ۱۵ جولائی ۲۰۰۱ء کے اخبار میں ایک یورپی خاتون کی خبر شائع ہوئی- جس نے اپنے پانچ معصوم بچوں کو پانی کے ٹب میں ڈبو ڈبو کر ہلاک کر ڈالا- ان بازاروں میں جہاں جسم فروشی کے اڈے قائم ہیں- مائیں ہی اپنی بیٹیوں کو اس غیر انسانی جرم کے لیے تیار کرتی اور ان کی کمائی کھاتی رہتی ہیں- ماضی میں حکمران ماؤں نے نشۂ حکمرانی میں اپنی جوان اولاد کو مروا ڈالا...... "سیکس فری کرانیکل" میں حال ہی میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ...... ۴۲ سالہ خاتون نے

پارک میں اپنے بیٹے سے شادی کر لی اور وہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں-

دراصل ہماری سوچ کی غلطی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے ہم ماں کو بچپن کے بعد بھی ہی ماں سمجھتے ہیں جو وہ اپنے اس وقت میں تھی جب اس کے ہارمونز خارج ہوتے تھے- حقیقت یہ ہے کہ بھینس' بکری' گائے غرض ہر مادہ جانور اپنے بچے کی شیر خوارگی کے بعد دھیرے دھیرے اس کی پہچان بھول جاتا ہے- کیونکہ ان کے پاس شعور و حافظہ نہیں- اس کے برعکس انسانی بچے کی ماں شعور و حافظے کی مالک ہے- وہ اپنے بچے کو پہچانتی ہے- جسے اس نے جنم دیا اور دودھ پلایا- اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی بچہ عالم شیر خوارگی میں ماں سے بچھڑ جائے اور پھر عالم شباب میں ماں کے سامنے آئے تو ماں اسے ممتا کے جذبات کی مدد سے نہیں پہچان سکتی- حالانکہ وہ اسی کا بچہ تھا سچ تو یہ ہے کہ ہم انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں- کیونکہ ہم بقائمی ہوش و حواس ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں- انگریزی میں اس عمل کو ایسوسی ایشن کہتے ہیں اور صرف ماں پر ہی کیا موقوف ہماری ایسوسی ایشن اپنی اپنی سطح پر تو ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہے- گھر کے افراد' عزیز رشتے دار' دوست احباب' اہل محلہ یا علاقہ حتیٰ کہ گھر کے جانوروں' گھر کی بناوٹ اور استعمال کے سامان تک سے ہم اس درجہ مانوس ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ادھر ادھر ہو جائے تو ہمیں خاصی اداسی اور دل گرفتگی برداشت کرنا پڑتی ہے- آپ کو سونے کے لیے اپنا مخصوص بستر یا سرہانہ بھی نہ ملے جسے آپ معمول کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں تو آپ کو ایک آدھ لمحے کی کبیدگی محسوس ہوگی- یہی انسیت ہے یعنی مانوس ہو جانا ہے- اب یہ انسیت ہر کسی کے ساتھ اپنے اپنے درجے پر ہوتی ہے- ظاہر ہے آپ کو اپنے سرہانے کے ساتھ جو انسیت ہے اس کی مثال ماں کے رشتے کے ساتھ تو نہیں دی جاسکتی- لیکن یہ انتہائی واضح حقیقت ہے کہ ماں کے ساتھ آپ کی یا آپ کے ساتھ ماں کی محبت انتہائی بلند درجے میں صرف ایسوسی ایشن ہی ہے- یہاں ایک دلچسپ اور نازک مسئلہ پیش آجاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ماں فطری طور پر "ممتا" دینے پر مجبور ہے- جیسا کہ دوسرے جانوروں کی مادائیں تو پھر اس کا اپنے بچے پر کیا احسان رہ جاتا ہے- کیونکہ بعد میں تو وہ محض شناسائی کی بدولت اپنے بچے کے ساتھ مانوس رہتی ہے- جبکہ ایک طرف تمام مذاہب نے اور بالخصوص اسلام نے ماں کے مقام کو انتہائی بلند کر کے پیش کیا ہے- نبی کریمؐ کا

مشہور ارشاد ہے کہ

"الجنت تحت اقدام الامھات" جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے

اس کے علاوہ تمام ماہرین عمرانیات، دانشور اور مفکرین بھی ماں کے مرتبے کے احترام کا درس دیتے ہیں- اگر ماں کا بچے پر کوئی احسان نہیں اور اگر بچہ پیدا کر کے اس کی پرورش کرنا محض ایک فطری عمل ہے- جیسا کہ باقی حیوانات بھی بچے پیدا کرتے اور ان کی پرورش کرتے ہیں- تو پھر ماں کو اس قدر منفرد انداز میں احترام دینا کہاں کا انصاف ہے- بحث کے اس مقام پر جہاں مذہب اور ماہرین فطرت کے نتائج آپس میں ٹکرا رہے ہیں- ہم قرآن سے رجوع کرتے ہیں- قرآن حکیم کی آیت وبالوالدین احسانا، والدین پر احسان کرو ہمارے اشکال کو دور کر سکتی ہے- اس آیت میں احسان کا لفظ استعمال ہوا ہے- احسان ایسی بھلائی کو کہتے ہیں جو آپ پر فرض تو نہیں لیکن آپ نے اگر سرانجام دی ہے تو بہت اچھا کیا ہے یعنی احسان کیا ہے اب تصویر کچھ واضح ہوتی ہے-

ماں باپ نے بچے کی پرورش کی ...... یہ ان کا فرض تھا اور فرض بھی ایسا جو ان کی فطرت میں گوندھ دیا گیا تھا- کیونکہ ایک جانور مادہ اپنے بچے کی پرورش کر سکتی ہے تو انسانی ماں کیوں نہ کرے- اس کے برعکس بچہ جب اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتا ہے تو وہ احسان کرتا ہے کیونکہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی اس کی نیچر میں نہیں تھی اور نہ ہی روئے زمین پر کوئی جانور ایسا ہے جو اپنی الوہیاتی ہدایت کے زیر اثر ایسا کرے...... اور پھر قرآن کی آیت سے بھی یہی دلیل ملتی ہے کہ والدین کے ساتھ بھلائی احسان کے طور پر کی جائے- احسان ایک خالص انسانی خصلت ہے- جو کوئی بھی شخص بطور فرض نہیں کرتا-

تصریحات بالا سے یہ عجیب وغریب حقیقت جس کے تسلیم کرنے کو دقیانوسی سوچ کے مالک اور روایت پسند لوگ آسانی سے تیار نہیں ہوں گے- سائنس، فلسفہ، منطق ہر لحاظ سے ثابت کی جا سکتی ہے-

یہاں فی الوقت معاشرے میں ماں کے روپ کا تذکرہ درپیش ہے- ماں جو انسانی معاشرے میں اپنے بچے کے بچپن میں اس کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارتی ہے- اس کی شخصیت اور کردار پر بھی سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور بچہ بڑا ہو کر اپنی ماں ہی کی عادات، افکار،

محرومیاں اور دکھوں کا بوجھ عمر بھر اپنے کشکول میں لیے پھرتا ہے- دراصل اس زمانہ میں مادیت کی پرستش کرتے ہوئے انسان ان روحانی اقدار کو فراموش کر بیٹھا ہے- جن سے جنت نظیر معاشرہ پروان چڑھتا ہے- اس دور پر ہی کیا موقوف ماضی میں بھی انسان نے اپنے جوڑے بناتے وقت روحانی اقدار اور معاشرتی ضرورتوں کو مدنظر رکھنے کی بجائے، شکل وصورت اور جسمانی کشش کو ازدواجی حیثیت کا معیار بنائے رکھا- بات یہیں سے بگڑنا شروع ہوتی ہے- جب ہم جنس مخالف کی جسمانی کشش سے متاثر ہو کر اس سے ازدواجی رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اس غلط سوچ کا اثر ہماری اولاد پر بھی پڑے گا- واضح الفاظ میں بات کی جائے تو یوں ہے کہ ہم جب شادی کرنا چاہتے ہیں تو جانوروں کی طرح محض جنسی ہوس کی تسکین کے نقطہء نظر سے- لیکن جب بچے پیدا کرتے ہیں تو انسانی معاشرے کو نئی نسل فراہم کرتے ہیں- وہ ماں جو اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت کے وقت محض جنسی حظ اور خالی خولی جسمانی لذت حاصل کرنا چاہ رہی تھی کیونکر ایک پاکیزہ انسان کو جنم دے گی- اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ تو محض اتفاق یا حادثہ تھا-

ہاں! البتہ وہ ماں جو جنسی ملاپ کے وقت افزائش نسل کی فطری ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنے دل میں انسانی معاشرے کو نئی اور عمدہ نسل فراہم کرنے کا خیال سمو کر اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت کرتی ہے- اس کا پیدا ہونے والا بچہ یقیناً حادثہ یا اتفاق نہیں ہوگا- بہت کم ایسے بچے ہیں جن کی مائیں بچہ جنم دیتے وقت احساس تفاخر سے پھولے نہ سماتی ہوں کہ انہوں نے انسانی معاشرے کو اپنی مرضی اور منصوبے سے بچہ فراہم کیا- ظاہر ہے جب ایک بچہ پیدا ہی منصوبہ بندی کے تحت ہوا تو یقیناً اس کی ماں اور باپ اس کی تربیت میں بھی کوتاہی نہیں کریں گے- اس کے برعکس حادثاتی طور پر دنیا میں آ جانے والے انسان کبھی بھی اپنے ماں باپ کی وہ شفقت جو حقیقت میں انسانی شفقت ہے حاصل نہیں کر پاتے- نتیجتاً بے چین اور بے زار رہتے ہیں-

ایسی مائیں اور ایسے بچے جو معاشرے میں صرف Fill in the blanks کے کام آتے ہیں- تعداد میں بہت زیادہ ہیں- نتیجتاً پورا معاشرہ ان کے کردار کی نذر ہو جاتا ہے اور قومیں بے چین اور مضطرب رہتی ہیں- اس معاملے میں اگرچہ ماں کے ساتھ باپ کی بھی ابتدائی مرحلے میں

برابر کی شراکت داری ہے۔لیکن پیدائش کے بعد بچے کے بگاڑ یا سنوار میں سب سے زیادہ ہاتھ ماں کا ہوتا ہے۔یہاں ایک لمحے کو ٹھہریے ہم اس مضمون میں پہلے بیان کر آئے ہیں کہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ

الجنت تحت اقدام الامھات   جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے

بچے کا بگاڑ یا سنوار ماں کی تربیت اور پرورش پر موقوف تھا۔گویا بچے کے لیے جنت اور جہنم حاصل کرنے کا پہلا سبق اور درس ماں کی تربیت تھی۔اب یہاں اس حدیث مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مذہب اور نیچر کے ٹکراؤ کا اشکال دور ہو سکتا ہے۔یہ حدیث جو عموماً اولاد کو نصیحتاً سنائی جاتی ہے۔تا کہ وہ اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے ماں کا احترام کریں۔حقیقت میں اولاد کے لیے نہیں بلکہ ماؤں کے لیے ارشاد ہوئی ہے یعنی اے ماؤں! تمہارے ہی قدموں تلے اپنے بچے کے لیے جنت کا دروازہ ہے۔اگر بات سمجھنے کے لیے یہ جملہ استعمال کیا جائے تو حدیث شریف کی اصل غرض و غایت واضح ہو جاتی ہے۔یعنی یہ ماں ہی ہے جو اگر چاہے تو اپنی تربیت سے بچے کے کردار کو مثبت یا منفی بنا دے۔اس سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ اگر مائیں یہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد نیک اور صالح ہو تو وہ اپنے ہی قدموں سے ان کے لیے بہشت بریں کا راستہ ہموار کر سکتی ہیں۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ ماں کا روپ ہی انسانی تہذیب و تمدن اور معاشرے کے خدوخال تعمیر کرتا ہے۔جیسا کہ نپولین بونا پاٹ کی مشہور آرزو کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔جب اس نے کہا تھا تم مجھے بہترین مائیں دے کر مجھ سے بہترین قوم لے لو اور یہ بات بھی طے ہے کہ ماں کا مرتبہ مقام رشتوں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔کیونکہ حقائق واضح ہو جانے کے بعد اولاد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ماؤں کو اور پھر نئی آنے والی ماؤں یعنی بچیوں کو اس روز روشن حقیقت سے آگاہ کریں کہ دنیا کا دیرینہ خواب یعنی فردوس نظیر معاشرہ تمہارے ہی طفیل پورا ہوگا۔

عورت بہن کے روپ میں

ماں کے بعد عورت کا انتہائی پاکیزہ روپ بہن کا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خالص انسانی رشتہ ہے۔جانوروں میں بہن بھائی کا کوئی تصور نہیں۔شعور کے اضافے نے انسان کو رشتوں کی

صورت میں جو تحفے دیے ان میں بہن، بھائی، کزن، چاچے، مامے، دوست احباب سب شامل ہیں۔لیکن ان میں سب سے خوبصورت رشتہ بہن بھائی کا ہے۔بہن کے روپ میں عورت جنت کی حور سے بھی زیادہ پاک اور محبت کرنے والی دکھائی دیتی ہے۔اس رشتے سے متعلق نفسیاتی بحث کرتے ہوئے ہمیں انسانی شعور کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لینا ہوگا۔ماضی میں انسان نے موجودہ شکل و صورت اپنانے کے بعد پہاڑوں کی غاروں میں اپنی خاندانی زندگی کا آغاز کیا۔اس وقت تک انسان کی جنسی خواہشات اتنی بے راہ رو نہ تھیں۔ایک بڑے سے غار میں کئی خاندان رہتے تھے۔نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے میں جنسی کشش محسوس کرتے اور ایک دوسرے کے قریب آ جاتے۔خاندان میں سے کسی کو اعتراض ہوتا تو فیصلہ طاقت کے بل پر کیا جاتا۔مردوں میں مقابلہ ہوتا اور جیتنے والا اپنی پسندیدہ عورت سے شادی کر لیتا۔پہلے پہل ان کے ملنے اور شادی کرنے کے عمل کے لیے کوئی تقریب نہ ہوا کرتی۔پھر وہی جوڑا ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتا اور جانوروں کی طرح ہر سال بچے پیدا کرتا رہتا۔یہ انسان کے اس ابتدائی دور کی صورت حال ہے جب اس میں شعور اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا اور اس وقت ایک جوڑے سے پیدا ہونے والے بچے بہن بھائی کے رشتے کی پہچان نہیں رکھتے تھے۔اس دور کے انسانوں کو ماہرین حیاتیات "نینڈرتھل" کہتے ہیں۔اس دور کا انسان ابھی مکان بنانے کے فن سے نا آشنا تھا۔لیکن آگ جلانا اور گوشت بھون کر کھانا سیکھ چکا تھا۔پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے ایک جوڑے سے پیدا ہونے والے بچے مسلسل ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے میں پہلے سے زیادہ انسیت محسوس کرنے لگے۔پھر آگے چل کر وہ وقت بھی آیا جب ایک ماں باپ کے بچے اپنے اجتماعی حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے خود کو دوسروں سے الگ ایک خاندان کے افراد سمجھنے لگے۔اس طرح خاندانوں سے قبائل بنتے چلے گئے اور پھر بعد میں قبائل سے اقوام۔تیزی سے ترقی کرتی ہوئی شعوری حالت نے ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والی لڑکیوں اور لڑکوں میں جنسی جھجک پیدا کر دی اور یوں شعور نے پہلی مرتبہ بہن اور بھائی کے رشتے کو جنم دیا۔

اگرچہ بہن اور بھائی کے درمیان جنسی ملاپ شعور کے ابتدائی مرحلے میں ہی ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔لیکن بعض قوموں نے بہن اور بھائی کے جنسی اختلاط کا خیال بہت دیر سے ترک کیا۔

مصری اقوام تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد تک بہن اور بھائی کے جنسی اختلاط کی قائل رہیں- ہمارے برصغیر میں ہندو راجاؤں کے ہاں بھی بہن بھائی کی آپس میں شادی کا رواج رہا اور صرف...... تقریباً ساڑھے بارہ سو برس قبل راجہ داہر اور اس کی بہن کی آپس میں شادی اور پھر ازدواجی زندگی گزارنے کا بین ثبوت ملتا ہے-

اسلام نے بہن بھائی کی آپس میں شادی کو حرام قرار دیا ہے- یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ وہ انسانی قبائل جنہوں نے تیزی سے شعور کے ارتقائی مراحل طے کیے- بہن بھائی کے جنسی ملاپ کو ترک کرنے میں انہوں نے تیزی دکھائی اور جن قبائل میں شعوری ترقی تیزی سے نہ ہو سکی وہاں اس رشتے کا تقدس واضح ہوتے ہوئے دیر لگ گئی- شعور کی ان ارتقائی منازل کو دیکھتے ہوئے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ بہن اور بھائی کے رشتے میں پاکیزگی کا عنصر شرف انسانیت کا کمال ہے جو دوسری مخلوقات کے حصے میں نہیں آ سکا-

یہ مذہب ہی تھا جس نے انسان کی فلاح کا بیڑا سب سے پہلے اٹھایا اور پھر تمام مذاہب کے بعد اسلام نے انتہائی آسان پیرائے میں انسانوں کو تہذیب سکھانے کا ذمہ لیا-

جیسا کہ ثابت ہوتا ہے کہ بہن بھائی کے رشتے میں محض عقل و شعور کی بدولت تمیز ہو سکی- یہاں ایک بات یاد رہے کہ ہم انسانی ارتقاء میں مذہب کو عقل و شعور کا سب سے بڑا راہنما تسلیم کرتے ہیں- مذہب اور عقل و شعور نے ملکر انسان کو بتایا کہ بھائی کی بہن کے ساتھ اور بہن کی بھائی کے ساتھ جنسی رغبت خالصتاً حیوانی خاصہ ہے جو اشرف المخلوقات کو زیب نہیں دیتا اور نہ ہی معاشرے کے لیے کسی طور مفید ہو سکتا ہے- اس سے معاشرتی توازن بگڑنے کا یقینی خطرہ ہے- مزید برآں اب تو سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ لہو کا اختلاف ازدواجی زندگی میں افزائش نسل کے لیے مفید ہے- میڈیکل کے ڈاکٹرز نے کامیاب تجربات کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہن بھائی کی شادی جن کے خون کے گروپ اور دیگر جسمانی اعضاء ایک جیسے ہو سکتے ہیں- حتیٰ کہ کزنز' چچازاد' خالہ زاد' ماموں زاد' پھوپھو زاد کی آپس میں شادیاں ہونے سے معذور بچے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے- زمانہ قدیم کے فراعین ر بہنوں کے ساتھ اس لیے شادیاں کیا کرتے تھے تاکہ نسل خاص رہے- حالانکہ دوسرے خاندانوں میں رشتے کرنے سے نہ صرف معاشرتی روابط بڑھتے ہیں بلکہ مختلف نسلوں کی خصوصیات رنگ' قد و قامت' ذہانت وغیرہ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور یوں انسانوں

کے ایک دوسرے کے قریب ہونے اور معاشرتی توازن قائم ہونے کے زیادہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں-

بہن بھائی کا رشتہ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں خالص انسانی طرز عمل ہے- یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے اور ہر قوم میں آج بھی اس رشتے کا مختلف انداز میں سواگت کیا جاتا ہے- اہل یورپ بہن بھائی کے رشتے میں اتنے سنجیدہ نہیں جتنے ہمارے ہاں کے مشرقی لوگ ہیں- ہمارے ہاں بہن گھر کا ایک ایسا فرد ہے جسے ماں کے بعد سب سے زیادہ احترام دیا جاتا ہے- بہن بھائی کے لیے پیار' خلوص' وفا اور قربانی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور بھائی اپنی بہنوں کو اپنا ہمدرد اور شریک راز سمجھتے ہیں- سفر پر روانہ ہوتے ہوئے بھائی کے لیے بہن کی دعائیں سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں- وہ اپنے بھائی کے بازو پر کالا دھاگہ باندھ کر اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ اس کی دعائیں' وفائیں اور ہمدردیاں اپنے بھائی کے ساتھ ہیں- اس کالے دھاگے کو ہندی زبان میں ''راکھی'' کہا جاتا ہے- (رکھشا' یعنی حفاظت کرنے والا)

اگر چہ فی زمانہ انسانوں کی اکثریت کو بہن کے مقدس رشتے کی صحیح پہچان ہو چکی ہے- لیکن پھر بھی آئے دن کہیں کہیں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے ابھی تک انسان کی سابقہ حیوانی فطرت کا پتہ چلتا ہے- نوجوان بہن اور بھائی ذرائع ابلاغ کی قباحتوں کی وجہ سے بہک بھی سکتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بہن اور بھائی کو اکیلے کمرے میں بیٹھنے یا سونے سے منع فرمایا ہے- بہن بھائی کے رشتے کا تقدس انسان کے لیے شرف انسانیت کا حسین تحفہ اور چیلنج ہے- اگر انسان اس رشتے کی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے آنے والے ادوار میں یہ ثابت کرتا ہے کہ ابن آدم اپنے جنسی جذبات پر قابو پانے کی مکمل مہارت حاصل کر چکا ہے- تو امید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے میں رشتوں کا صحیح توازن قائم ہو کر اشرف المخلوقات کی عظمت اور بڑائی کا ایک پائیدار ثبوت مہیا ہو گا-

اہل مشرق کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ وہ نام نہاد تہذیب یافتہ اقوام کی نسبت رشتوں کے معاملے میں آج بھی انسانی عظمت کا ثبوت دیتے ہیں-

عورت بیٹی کے روپ میں

یہ بات طے شدہ ہے کہ اولاد اور مال دنیا کے حسین ترین فریب ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

المال والبنین فتنة الحیاةِ الدنیا

ترجمہ: مال اور اولاد دنیاوی زندگی کے فتنے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ

زین للناس حب شھوات من النساء والبنین

''انسانوں کے لیے شہوات کی محبت میں زینت رکھی گئی جو عورتوں اور اولاد میں ہے''

دراصل تحفظ خویش فطری تقاضا ہے۔ اپنے بچوں کی حفاظت ہر جاندار کرتا ہے۔ لیکن انسان نے عقل کی مدد سے بچوں کی حفاظت کے اس کام کو انتہائی پیچیدہ اور طویل بنا رکھا ہے۔ ہم اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ ہم انہیں آرام پہنچانے کے لیے سہولتیں خریدتے ہیں اور سہولتیں خریدنے کے لیے عمر بھر مشقت کرتے رہتے ہیں۔ ہم بچپن سے ہی ان کے محفوظ آدمی (بڑا آدمی) بننے کے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں طرح طرح کے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ جائز و ناجائز طریقوں سے آمدنی کو بڑھاتے رہتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے بچے جو ہمارے کردار کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری زندگی بھر کی محنت جائز و ناجائز کام کرنے کی عادت اور ہماری تحفظ خویش کی فطرت کو شعوری طور پر اپنا لیتے ہیں اور پھر جب ہمارے بچے بڑے ہوتے ہیں تو انہیں راہوں پر چل پڑتے ہیں جن پر چل کر ہم نے انہیں جوان کیا۔ نسل کا یہ چکر متواتر چلتا رہتا ہے اور تہذیب میں توازن پیدا ہونے کا امکان کم ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے بچوں کی ضروریات کا محض اس حد تک خیال رکھیں جس قدر ہم پر فرض عائد ہوتا ہے۔ بچوں میں اولاد نرینہ یعنی بیٹوں کا معاملہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک بیٹی کے رشتے کا تعلق ہے تو ہمیں اس کی نگہداشت کے لیے بیٹے کی نسبت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ مشرق و مغرب میں چند ایک باشعور خاندانوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر بیٹی کی کمتری کا تصور پایا

جاتا ہے اور یہ مرض آج کا نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے یونہی چلا آ رہا ہے۔ اہل حجاز تو اس قدر سفاک تھے کہ اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

واذا الموءودة سئلت بای ذنب قتلت

جب ان (بچیوں) سے سوال کیا جائے گا کہ انہیں کس جرم میں قتل کیا گیا۔

عرب پر کیا موقوف ہمارے ہاں تو دور حاضر میں بھی بیٹی کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مشرق میں بیٹی کی ولادت باعث شرم و عار اور مصیبت ہوتی ہے اور بیٹی کو پیدا ہوتے ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں ہے کہ

ولیس الذکر کالانثیٰ 'اور لڑکا' لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا

نہ جانے زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے جب ماں اپنی بیٹی کے دل میں چپکے سے معاشرے کا خوف ڈال دیتی ہے۔ بیٹی گھر میں ہوش سنبھالتی ہے تو اپنے ''پرایا مال'' ہونے کا ذکر سننا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے اس کے بھائی کو گھر کا مالک اور اسے چڑیوں کا چنبہ جو ایک دن پردیس رخصت ہو جائے گا کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے ماحول میں تربیت پانے والی بچی دل میں یہ خیال بٹھا لیتی ہے کہ اس کا اصل گھر اس کے ''پیا'' کا گھر ہے۔ بابل کا آنگن اس کا عارضی ٹھکانہ ہے۔ نتیجتاً اس کا ذہن اچھے سے اچھے ''پیا'' (خاوند) کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ وہ سنہرے خواب اور سبز باغ دیکھتی رہتی ہے اور ماں باپ کے گھر میں خود کو دو پل کا مسافر سمجھتی ہے۔ اس کا سب سے برا اثر یہ پڑتا ہے کہ جب وہ اپنے جیون ساتھی کے ہمراہ چلی جاتی ہے تو اس گھر میں جو اسے اس کا اپنا گھر بتایا جاتا رہا ہے۔ اجنبی ماحول اور اجنبی لوگ اسے باہر سے آیا ہوا بدیسی مال سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ وہ تو اس گھر کو اپنا اصل مقام سمجھ کر آئی تھی اور ستم یہ کہ اس کے والدین نے اسے رخصت کرتے وقت نصیحت کی تھی کہ اب اس کا جنازہ ہی اس گھر سے نکلے۔ اب یہاں اس گھر میں آ کر صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ خاوند جو اسے جنسی تسکین کے لیے ایک مال کے طور پر لایا۔ اسے خالص انسانی سطح کی شناسائی فراہم نہیں کر سکتا اور باقی اہل خانہ اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہاں آ کر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ وہ خواب جو وہ اٹھارہ یا بیس برس سے دیکھ رہی تھی اور جو اسے زبردستی دکھایا جا رہا تھا ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اسے یک لخت احساس ہوتا ہے کہ یہ گھر بھی اس کا نہیں۔ یہ

احساس ہوتے ہی اس کے من میں عدم تحفظ کا خدشہ جنم لیتا ہے۔نتیجتاً وہ اپنی بقا اور حفاظت کے لیے الٹے سیدھے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیتی ہے۔اسے اس گھر میں کئی طرح کی سازشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔تاکہ وہ اپنے قدم زیادہ سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ جما سکے۔اسے شوہر کی جنسی ہوس احساس دلاتی ہے کہ شادی کا مقصد جنسی حظ اٹھانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔یوں اس کے ذہن میں ایک قطعی منفی دنیا کا تصور جنم لیتا ہے اور وہ اپنی آئندہ زندگی کو اسی دنیا میں رہ کر گزار دیتی ہے۔اس کے ہاں اولاد ہوتی ہے تو ماں کی محرومیوں اور چڑچڑے پن کے زیر اثر پرورش پاتی ہے اور ماں کے ہاتھوں تیار ہونے والی نسل انسانی معاشرے کو بگاڑنے پر ایک بار پھر کمربستہ ہو جاتی ہے۔اگر وہی بیٹی جس نے ہمارے ہاں نادرست تربیت پائی، صحیح تربیت پاتی اور عمران علیہ السلام کی بیٹی مریمؑ کی طرح پل کر جوان ہوتی تو یقیناً ہماری متوقع نسل تہذیبی اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز ہوتی۔عورت بیٹی کے روپ میں اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوموں کا مستقبل پوشیدہ ہے۔جس معاشرے کی مائیں ہدایت یافتہ عورتیں ہوں گی۔اس معاشرے کا اوج کمال ثریا سے زیادہ بلند اور کہکشاؤں سے زیادہ تابناک ہوگا۔عورت جب بیٹی کے روپ میں جنم لیتی ہے تو دراصل وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک مکتب جنم لیتا ہے جس نے آگے چل کر ایک نسل کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھانا ہے۔

یہ المیہ البتہ ان چند خاندانوں کا نہیں جو متحدہ خاندانی نظام (Combine Family System) کے طریقۂ کار کو نہیں اپناتے۔جیسے یورپ میں جنسی بے راہ روی کے مارے ہوئے لوگ یا ہمارے ہاں یورپی طرز زندگی کے دلدادہ کچھ خاندان۔لیکن دنیا کی اکثریت اسی غیر متوازن خاندانی طرز زندگی کا شکار ہے۔ایسی صورت میں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یورپ کے وہ لوگ جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہو کر غیر خاندانی زندگی گزار رہے ہیں یا ہمارے ہاں کے وہ لوگ جو یورپ کی بے روح طرز معاشرت سے متاثر ہیں زیادہ صحیح ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے لوگ متحدہ خاندانی نظام سے کٹ کر تمدن کے بگاڑ کا مزید باعث بنتے ہیں۔ہمارے ہاں کا خاندانی نظام جس میں گھر کے عمر رسیدہ افراد کو کٹھن زندگی کا تجربہ رکھنے والا محترم بزرگ سمجھا جاتا ہے۔بہر حال ان سے بہتر ہے۔جہاں گھر کے بزرگ افراد کو مشین کے بے کار پرزے کی طرح فالتو سمجھ کر ''اولڈ ہوم'' میں پھینک دیا جاتا ہے۔یورپ کا یہ رویہ اور طرز عمل شرف انسانیت کے منافی اور شرمناک ہے۔لیکن ہم

بات کر رہے ہیں بیٹی کے مقام کی جو معاشرے کے قیام کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔نیچر کے حوالے سے ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اولاد کا کیا مقام ہے اور والدین کے ساتھ ان کے حقوق و فرائض کا تناسب کیا ہے۔لیکن وہ ایک سائنسی نقطۂ نظر تھا۔اگر محض سائنسی طریقۂ تدبیر کو راہنما مان لیا جائے تو کسی متوازن تمدن کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔ہمیں انسانوں کے ساتھ رہنا ہے تو ہمیں اخلاقی اقدار کا پاس رکھنا ہوگا اور اخلاقی اقدار میں سب سے زیادہ معتبر وہ ہیں جو ہمیں مذہب اور پھر اسلام فراہم کرتا ہے۔

بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم چوکنے ہو جائیں اور اس بات کو یقین کی حد تک دل و دماغ میں بٹھا لیں کہ بیٹی کی صورت میں ہمارے ذمہ انتہائی اہم اور نازک کام لگا دیا گیا ہے۔ہم بیٹی کی پرورش کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ اسے ایک دن ماں بننا ہے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ وہ ایسی مائیں بنیں جن کی اولاد شرف انسانیت پر فائز ہو اور جو اشرف المخلوقات کے لیے باعث فخر ہو۔

اب بیٹی کے حوالے سے ہم ایک اور بحث کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔عظیم نفسیات دان فرائڈ کے بقول ایک باپ کے لیے اپنی بیٹی اور ایک ماں کے لیے اپنے بیٹے میں جنسی کشش پائی جاتی ہے۔فرائڈ کے بقول تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ گھر کی بچیوں کی طرف مائل رہتا اور ان کی طرف داری کرتا ہے جبکہ ماں بیٹوں کی طرف۔ فرائڈ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی لاشعوری خواہش کی تسکین کرتے ہیں۔میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جذبۂ شہوت بھی جسے صرف شیطانی عمل سمجھا جاتا ہے اپنے دونوں پہلو رکھتا ہے۔جذبۂ شہوت کا ایک پہلو مثبت بھی ہے۔باپ اور بیٹی کی محبت اگر لاشعوری طور پر جنسی خواہش کا ردعمل ہی ہے تو بھی یہ کوئی بری بات نہیں۔کیونکہ یہ ایک مثبت اور صالح عمل ہے اور باپ بیٹی کی محبت، اسی طرح ماں اور بیٹے کی محبت جائز اور قابل فخر ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ یہ لاشعوری رغبت لاشعوری ہی ہے۔جیسے ہی یہ لاشعوری رغبت شعور کے خانے میں خواہش کی حیثیت سے داخل ہوئی باپ اور بیٹی کی محبت منفی ہو جاتی ہے اور اس قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں کہ کسی درندہ صفت باپ نے اپنی بیٹی کی آبرو لوٹ لی۔اخبارات کی وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی خبریں اس کی شاہد ہیں۔

دراصل یہ امر تو ہم متعدد بار ثابت کر چکے ہیں کہ نیچرلی انسانوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ نیچر کی نظر میں ہر رشتہ فریب، جھوٹ اور دھوکہ ہے۔ باپ باپ نہیں، ماں ماں نہیں، نہ ہی کوئی بہن بھائی ہے، نہ انکل آنٹیاں، نہ ہی کوئی کزن ہے، اور نہ ہی دوست احباب۔ یہ سب رشتے ہم انسان بننے کے بعد اپنی نیچر پر جبر کرتے ہوئے اپنے سوچے سمجھے پروگرام کے تحت بقائمی ہوش وحواس صرف شعور کی وجہ سے اپناتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پاگلوں اور دیوانوں کو رشتوں کی پہچان باقی رہتی۔ الا قلیل

لیکن فطرت یا نیچر چاہے کچھ بھی کہے۔ انسان بن جانے کے بعد ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے تئیں اشرف المخلوقات ثابت ہو کر دکھائیں۔

عورت بیوی کے روپ میں

مثبت جنسی تعلقات میں دنیا کا واحد رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ قرآن حکیم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔

هن لباس الكم وانتم لباس الهن

وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

ایک فرد کی زندگی میں آنے والی عورت جو بیوی کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ جسے عرف عام میں جیون ساتھی یا رفیقہء حیات (Life partner) کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں آئندہ دنیا میں آنے والے ہزاروں انسانوں کے لیے جو اس کے بطن سے نسل در نسل پیدا ہوتے رہیں گے۔ انتہائی اہم "استاذ" اور معلمہ ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری مرد کے مقابلہ میں فزوں تر ہے۔

مرد کیا ہے؟ مرد تو محض کارخانہء خاندان چلانے والا ایک کارکن ہے۔ جس کے ذمہ اس مکتب کی مالی ضروریات پوری کرنا اور حفاظت کرنا ہے جو اس کی بیوی کی صورت میں اس کے گھر کھل گیا۔ اس کی بیوی اس کے چھوٹے سے خاندان کی بیک وقت معلمہ بھی ہے اور مربیہ بھی۔ اب ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ جس تربیت گاہ کا ترتیب کرنے والا زمانے بھر کے خوف، محرومیاں اور حزن و

لال دل میں چھپائے ہوئے ہو۔ وہ کیونکر اپنے شاگردوں کی صحیح تربیت کر سکتا ہے۔ بات یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔ بات اس سے بھی قبل جب میاں بیوی رشتہء ازدواج میں منسلک ہو رہے تھے اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ یورپ میں اگرچہ لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے سے ملنے، ایک دوسرے کو پرکھنے اور سمجھنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں یہ آزادی اس درجہ وافر مقدار میں دے دی گئی ہے کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کے بدن کے جزیروں کو سر کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی یہ بے راہ روی ایک ایسے بچے کے جنم کا باعث بنتی ہے جس کو ورثے میں نہ ماں ملتی ہے اور نہ باپ اور یورپ کے دارالامان ان بچوں کی پرورش کا ذمہ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں لڑکی اور لڑکے کو کھلم کھلا ملاقات کے مواقع تو درکنار ایک دوسرے کو دیکھنے اور بعض اوقات نام ونسب سے واقف ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ ہمارے ہاں رشتے کا تمام کام لڑکی کی طرف سے "لڑکی والے" اور لڑکے کی طرف سے "لڑکے والے" سرانجام دیتے ہیں اور جن دونوں نے عمر بھر ساتھ رہنا ہوتا ہے وہ ایک دوسرے کے مزاج سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لڑکے والے یعنی لڑکے کی ماں اور بہنیں لڑکے کو آ کر اس کی ہونے والی بیوی کی خوبصورتی، جوانی اور اداؤں کی باتیں بتاتے ہیں اور لڑکا اپنے ذہن میں ایک خوبصورت اور پرکشش جسم کے ساتھ جنسی لذت حاصل کرنے کے خواب بننے لگتا ہے۔ وہ رات کو بستر پہ لیٹتا ہے تو شادی کے بعد حاصل ہونے والے سرور کو تصور میں لا لا کر خیالوں ہی خیالوں میں لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیجیے! بات بگڑ گئی۔ شادی ایک مثبت فریضے کی بجائے محض قانونی پابندی کے تحت ایک رجسٹرڈ زنا کی شکل اختیار کر گئی۔ میرا یہ کہنا ہے کہ زنا کی ایک صورت میاں بیوی کے درمیان بھی ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ آئندہ زندگی کی مکمل منصوبہ بندی اور کامل ذہنی ہم آہنگی کے بعد جسمانی ملاپ کرتے ہیں۔ وہ اسلامی زبان میں مباشرت کرتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ محض جنس مخالف کی جسمانی کشش سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہم بستری کرتے ہیں وہ میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی زنا کرتے ہیں۔ کیونکہ محض جنسی حظ تو جانوروں کی فطرت کا بھی خاصہ نہیں۔ جانور بھی جسمانی ملاپ افزائش نسل کی غرض سے کرتے ہیں۔ اب ان کا اس طرح غیر انسانی حتیٰ کہ غیر حیوانی یعنی خلاف فطرت فعل انہیں کالانعام بل هم اضل

سبیلا (جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ) کے مصداق گمراہی اور ضلالت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔میاں بیوی کا رشتہ اپنی نوعیت میں انسانی معاشرے کے اندر مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ بہت ضروری ہے کہ رشتہءازدواج میں منسلک ہونے سے کچھ دیر پہلے دونوں فریقین کی طبیعتوں، مزاج، عادات اور خصلتوں کی طرف سے یہ اطمینان کرلیا جائے کہ دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔کیونکہ جن جوڑوں میں ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو ایک دوسرے کے سپرد نہیں کرسکتے۔ان کے درمیان اعتماد، محبت، وفا، ایثار حتیٰ کہ ہر طرح کی دوری پائی جاتی ہے۔ وہ طوعاً کرہاً ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور مجبوراً ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔برادری میں ناک رکھنے کے لیے یا بعض اوقات کسی اور مجبوری سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے بھی نہیں کہ ان کی بھڑاس نکل جاتی اور طویل زندگی خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ایسے لوگ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ذہنی طور پر طرح طرح کی پیچیدگیوں اور ڈپریشنز کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ان کی یہ نفسیاتی پیچیدگیاں اور ڈپریشنز خارجی طور پر تو ان کی پرورش پائی ہوئی اولاد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔لیکن باطنی طور پر یہ پیچیدگیاں ان کے لاشعور کا ایک طاقت ور حصہ بن جاتی ہیں اور پھر بوقت مباشرت ان کی شخصیت کی یہی پیچیدگیاں ان کے جینز کے ساتھ رحم مادر میں چلی جاتی ہیں۔جہاں ایک بچہ پلنا شروع ہوتا ہے۔جس کا آغاز ہی مسخ شدہ شخصیتوں کے جینز سے ہوتا ہے۔بچہ ماں کے پیٹ میں ہی ماں باپ کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ڈپریشنز کا حصہ وصول کرلیتا ہے اور اپنی شخصیت کی کوتاہیاں، محرومیاں اور کم ہمتیاں ماں کے پیٹ سے ہی لے کے آتا ہے۔پیدا ہوتے ہی اس کی پرورش ایسے ماں باپ کرتے ہیں جو آپس میں محض ایک کمپرومائز کے تحت رہ رہے ہوتے ہیں۔کیونکہ ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی تو تھی نہیں وہ تو شادی کے وقت محض جنسی ملاپ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ معاشرے کے ایک نفسیاتی مریض کے طور پر پرورش پاتا ہوا جوان ہوتا ہے اور یوں سوسائٹی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔یہ ماجرا تو ہم نے ان لوگوں کا بیان کیا ہے جو آپس میں کمپرومائز کے تحت رہتے ہیں۔لیکن وہ لوگ جو کمپرومائز کے تحت بھی نہیں رہ پاتے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ان کی اولاد کی پیدائش اور تربیت اس سے بھی کہیں زیادہ بدتر حالات میں ہوتی ہے اور پھر وہ لوگ جن کے درمیان اختلافات کی نوعیت شدید ہو جاتی ہے اور بات علیحدگی پر ختم ہوتی ہے۔اپنی اولاد کو خود ہی حوادثات زمانہ کے

حوالے کردیتے ہیں۔ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں جن کی شادیاں ذہنی ہم آہنگی کے نقطہءنظر سے طے پاتی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعے یہ سمجھایا جائے کہ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو اچھی طرح اخلاقی طور پر جانچ اور پرکھ لیں۔اس کے بعد ایک اور اہم مسئلہ جس کو صدیوں کے بگڑے ذہن آسانی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ان کے مزاج برہم سے احتجاج کی توقع بھی ہے۔انتہائی اہم ہے۔بات نوعیت کے لحاظ سے خاصی منفرد اور نئی ہے اور لذت اور سرور کے شوقین انسانوں کے لیے ایک دھچکے کی حیثیت رکھتی ہے۔بات یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کے انسانی اوقات انتہائی غیر فطری اور مشکوک ہیں۔انسان بھی اپنی تخلیق کے ابتدائی دور میں دوسری مخلوقات کی طرح صرف افزائش نسل کی غرض سے بوقت ضرورت جنسی ملاپ کرتا تھا۔لیکن عقل کا سورج روشن ہونے کے بعد انسان نے نر اور مادہ کے اعضائے جنسیہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اسے ان اعضاء کو چھپانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس عمل سے ان کے درمیان بوئے شہوت کا تبادلہ بند ہو گیا اور ان کو آہستہ آہستہ جنسی ملاپ کے فطری اوقات بھول گئے۔بعد ازاں شعور کا آفتاب مزید روشن ہوا تو انسان نے افزائش نسل کی غرض و غایت سے مجامعت کرنا بالکل ترک کردیا۔ہم مظاہر فطرت میں دیکھتے ہیں کہ ایک جانور مثلاً بھینس، گائے، گدھا، کتا، گھوڑا وغیرہ ایک خاص موسم میں محض نسل بڑھانے کی غرض سے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔وہ ایک دوسرے کے جسم میں ایک خاص قسم کی بو محسوس کرتے ہیں۔پھر جب ان کے جنسی اختلاط سے مادہ کے رحم میں بچے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے تو پھر وہ ایک دوسرے کے قریب جنسی رغبت کی وجہ سے نہیں آتے یہاں تک کہ مادہ بچے کو جنم دیتی ہے۔اس کو دودھ پلاتی ہے......اور پھر کہیں جا کے مادہ میں دوسری بار جنسی ملاپ کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔اگرچہ تمام حیوانات، چرند پرند، درندے حتیٰ کہ حشرات الارض میں یہی طریقہءتناسل پایا جاتا ہے۔انہیں پر موقوف نہیں۔زمین پر موجود نباتات، درخت، پودے، فصلیں بھی اسی قانون کے تحت اختلاط کرتے ہیں۔بات سمجھنے کے لیے فصلوں کی مثال سب سے آسان ہے۔مثال کے طور پر ہم خالی زمین میں ہل چلاتے ہیں۔ہل چلانے کے بعد بیج بوہوتے ہیں، کھاد ڈالتے ہیں، اس کی بڑھوتری کے لیے پانی اور دیگر معدنیات فراہم کرتے ہیں اور پھر فصل اگنے کا

انتظار کرتے ہیں- اس دوران جب فصل کی کونپلیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں یا بڑھ رہی ہوتی ہیں تو ہم دوبارہ سے ہل چلانے کی حماقت نہیں کرتے اور نہ ہی دوبارہ بیج بوتے ہیں- کیونکہ ایسا کرنا سراسر مہمل اور لایعنی عمل ہے- قران حکیم کے مطابق

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں- پس تم آؤ (استعمال کرو) اپنی کھیتیوں میں جب چاہو-''

آپ نے دیکھا اللہ تعالیٰ انسان کو اس خوبصورت اور پروقار عمل کی دعوت دے رہے ہیں- جو خالصتاً فطری اور قابل قبول ہے اور پھر یہ دعوت ایک باشعور انسان کو دی جا رہی ہے جو اب اپنے وجدان سے نہیں بلکہ عقل سے اپنی جنسی بے راہ روی پر قابو پائے گا اور ملائکہ کے سامنے جو کائنات کی قوتوں پر مامور ہیں اپنے رب کے حضور سرخرو اور سرفراز ہوگا......

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجامعت کا فطری اصول بیان فرمایا ہے- قرآن حکیم مردوں سے مخاطب ہے اور انہیں تبلیغ کرتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو کھیتیوں کی طرح استعمال کریں- یعنی جیسے کھیتی میں بیج ڈال دینے کے بعد دوبارہ بیج نہیں ڈالا جاتا- اسی طرح مرد بھی اپنی عورتوں کے ساتھ حمل ٹھہر جانے کے بعد دوبارہ مجامعت نہ کریں- حتیٰ کہ اس وقت تک مجامعت نہ کریں جب تک بچہ پیدا ہو کر اور اپنی ماں کا دودھ پی کر ماں سے جسمانی طور پر علیحدہ نہیں ہو جاتا - یہی فطرت ہے- یہی قانون، مظاہر فطرت میں رائج ہے- یہی فصل کاشت کرنے کا اصول ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے- لیکن ہم بدقسمتی سے اپنی فطرت کی تمام اچھائیاں فراموش کر چکے ہیں اور برائیوں کو اضافوں کے ساتھ اپنائے ہوئے ہیں- یہ طریقہء تناسل اگرچہ باوقار اور مطابق عقل و فطرت ہے لیکن ہے بہت مشکل - کیونکہ ہم ہزاروں سال سے جنسی فعل کا ناجائز طور پر ارتکاب کرتے آ رہے ہیں- اتنے طویل عرصے میں یہ عادات ہمارے جینز کا حصہ بن چکی ہیں اور جینز کے ذریعے سے ملنے والی عادات اس قدر پختہ ہوتی ہیں کہ انہیں فطرت جیسا ہی کہا جا سکتا ہے- گویا ''فطرت ثانیہ'' اس طریقہء تناسل کو اب دنیا میں رائج کرنا ناممکن تو نہیں- لیکن ناممکن کے قریب قریب ہے- اگر خالص اسلامی حکومت ہو اور پھر جبراً نہیں بلکہ بذریعہ تبلیغ مدت تک اس آیت کی تفسیر پر عوام کو عمل کے لیے اکسایا جائے تو دھیرے دھیرے اس قباحت کو ختم کیا جا سکتا ہے- اگر کبھی ایسا ممکن ہو سکا تو انسانی کردار میں عجب لازوال قسم کی شان و شوکت کا پیدا ہو جانا یقینی ہوگا

ور انسان سالوں میں نہیں بلکہ دنوں میں اپنی منزل حقیقی کے قریب تر ہو جائے گا- اس پر عمل کرنے میں سب سے زیادہ دشواری مذہبی طبقہ کو پیش آ سکتی ہے- کیونکہ مذہب نے تاریخی حادثات کی وجہ سے بعض ایسی کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے- جن میں ہر قسم کی جنسی بے راہ روی کی اجازت دی گئی ہے- ہم اپنے پچھلے ابواب میں عیسائیت، بت پرستی اور ہندومت کے حوالے سے ان جنسی دعوتوں کا مضمون پیش کر چکے ہیں- اسلام نے اگرچہ قرآن حکیم میں فطرت کے نزدیک رہتے ہوئے جنسی تعلقات کی تعیین کی ہے- لیکن ہمارے ہاں بھی بعض ضعیف روایات اور قصے کہانیوں میں جنسی اختلاط کی غیر عقلی، غیر فطری اور غیر قرآنی اجازتیں دی گئی ہیں- جیسا کہ قرآن کی مذکورہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جنسی ملاپ کے اوقات کو فطری تقاضوں کے ماتحت رکھ کے ہی اچھی نسل اور فصل حاصل کی جا سکتی ہے- دو انسانوں کے درمیان یہ واحد جنسی رشتہ جسے میاں بیوی کا رشتہ کہا جاتا ہے- اس بات کا متقاضی ہے کہ اشرف المخلوقات کے شایان شان ہو اور اشرف المخلوقات کے شایان شان یہی ہے کہ ایک صالح انسانی معاشرہ پیدا کرنے کی جستجو کی جائے- آنے والی نسلیں تیار کرتے ہوئے انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور بچوں کی پیدائش کو ایک حادثے کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے طور پر قبول کیا جائے-

عورت بیوی کے روپ میں گھر کی مالکن ہوتی ہے- اسے ایک ایسے نظام کو چلانے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے جسے مستقبل میں اس کی اولاد نے پورے معاشرے میں قائم کرنا ہے- خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقریر فرمائی اس میں میاں بیوی کے لیے خصوصی نصیحت فرمائی- آپؐ نے فرمایا ''تمہاری عورتوں پہ لازم ہے کہ وہ باحیا ہوں اور تم پر واجب ہے کہ ان کے نان نفقہ کا بندوبست کرو-''

بیوی مرد کی زندگی کا وہ ساتھی ہے جو اس کے سب سے قیمتی اثاثے یعنی اس کی آبرو کی واحد نگران ہوتی ہے- اگر میاں بیوی شادی کے وقت صرف جنسی تسکین کے شوق سے ایک ہوئے تھے تو لازمی بات ہے کہ کچھ وقت کے بعد ان میں پہلے جیسا شوق باقی نہیں رہے گا- کیونکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ پہلے بوسے کے بعد دوسرا بوسہ کم لذت انگیز ہوتا ہے- اسی طرح تیسرا بوسہ مزید کم سرور و نشاط بہم پہنچاتا ہے- وقت کے ساتھ ساتھ ان کا وہ ولولہ جو اجنبی جزیرے سر کرنے

کے شوق مہم جوئی کی بدولت تھا ایک دوسرے کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ نتیجتاً ان میں ایک دوسرے کے لیے کشش کم ہو جاتی ہے اور وہ پہلے جیسی لذت و سرور حاصل نہیں کر پاتے۔ پہلے جیسی لذت و سرور حاصل کرنے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جنس مخالف کی دلکشی پھیکی پڑ جاتی ہے اور اس طرح بیوی اپنے طور پر اور شوہر اپنے طور پر ناجائز طریقے سے اس لذت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یورپ کا تو یہ المیہ ہے ہی۔ ہمارے معاشرے میں بھی اس قسم کی داستانوں کی کمی نہیں ہے......
یہ بدکرداری ان کی شخصیت پر ڈھیرے ڈھیرے اپنی منحوس سیاہی ڈالتی رہتی ہے جو ان کے عام طرز عمل کو مجرمانہ اور مشکوک بنا دیتی ہے۔ اس بدکرداری کا بالواسطہ اثر اولاد پر پڑتا ہے اور وہ انہیں راستوں پر چل نکلتی ہے۔ جن سے ان کے ماں باپ ہو کر گئے۔ بیوی کے روپ میں عورت کو وفا کی دیوی بھی کہا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کی مثالیں دوسری قسم کی بیویوں کی نسبت نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اب ہم ایک اور اہم مسئلے پر توجہ دیتے ہیں۔ دین اسلام کے متعلق عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اس دین میں چار شادیوں کی جو اجازت دی گئی ہے تو یہ درست عمل نہیں۔ ظاہر ہے یہ اعتراض مسلمانوں کی طرف سے تو نہیں آتا۔ مستشرقین کی طرف سے یا پھر یورپ زدہ نیم انگریزی ماحول کے نام نہاد ترقی پسند مسلمانوں کی طرف سے...... دراصل کچھ کوتاہی ہمارے ارباب مذہب سے بھی ہے۔ انہوں نے اسلام میں چار بیویوں کے تصور کی صحیح قرآنی تفسیر نہیں کی۔ حالانکہ قرآن حکیم کی وہ آیت جس میں چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔ انتہائی واضح اور صاف سمجھ میں آنے والی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ

فان خفتم ان لا تقسطو فی الیتامیٰ فانکحو ماطاب لکم من النساءِ مثنیٰ و ثلاثه وربع وان خفتم ان لا تعد لوا فواحده

ترجمہ: اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا تو ان سے نکاح کر لو۔ (لیکن) اپنی استطاعت کے مطابق دو کر لو تین کر لو یا چار کر لو اور اگر تمہیں یہ خوف لاحق ہو کہ (اپنی بیویوں کے مابین) تم عدل نہیں کر پاؤ گے تو ایک ہی کرنا۔

دیکھیے اس قدر واضح اور عام فہم انداز میں اللہ رب العزت نے تعدد ازواج کی حکمت سمجھائی یعنی اگر تم دیکھو کہ معاشرے میں بے سہارا (یتیم) عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا...... کیونکہ وہ

بے سہارا ہیں۔ ایک لمحے کو ٹھہریے قرآن حکیم کی آیت میں فی الیتمیٰ کے الفاظ ہیں اور بدقسمتی سے ہم یتیم صرف اس کو سمجھتے ہیں جس کا باپ مر گیا ہو۔ دراصل یہ ہماری مشرقی سوچ کا عجمی کارنامہ ہے۔ ورنہ حقیقت میں یتیم کا مطلب جو عربوں کے ہاں مستعمل ہے۔ ایسا شخص ہے جو بے سہارا ہو۔ ایسے بچے جن کے ماں باپ مر جائیں وہ بھی یتیم، ایسی عورتیں جن کے شوہر وفات پا جائیں یا انہیں چھوڑ جائیں وہ یتیم (بیوہ) اور ایسی عورتیں جن کا کوئی بھی ذمہ دار یا کفیل باقی نہ رہے وہ بھی بے سہارا اور یتیم ہی ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ ایسی یتیم اور بے سہارا عورتیں جنہیں دیکھ کر تمہیں محسوس ہوتا ہو کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا تو تم یوں کرو کہ اپنی مالی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے ان کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لو۔ یعنی ان سے نکاح کر لو، دو کر لو، تین کر لو یا چار کر لو اور ہاں اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تمہارے اندر ایک اعلیٰ منتظم کی صلاحیتیں کم ہیں اور ہو سکتا ہے تم ایک سے زیادہ شادیاں کر تو اپنی بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ رکھ سکو تو پھر ضروری ہے کہ تم ایک ہی شادی کرو۔

دیکھا آپ نے کس قدر واضح اور صاف الفاظ میں قرآن حکیم نے اس مسئلہ کی جامع تصریح کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یعنی اہل اسلام میں اور پھر خصوصاً اہل عرب میں اس آیت کی مقصدیت کو بھلا کر تعدد ازواج کو محض جنسی لذت اور چسکے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوتاہی اسلام یا قرآن کی تو نہیں۔ جیسا کہ اہل یورپ سمجھتے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ ہماری اپنی جنس زدہ سوچ ہے اور ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ زیادہ عورتیں ہوں تاکہ ہر رات شب وصال ہو اور ذائقے بدل بدل کر اپنے لیے جنسی تسکین کا سامان کرتے رہیں۔ حالانکہ اسلام کے عظیم نظام نے اس بے سہارا عورت کو جس کے بھٹک جانے یا جس کی بدولت دوسروں کے بھٹک جانے کا خطرہ ہو۔ تحفظ دینے کی راہ بتائی ہے۔ وہ ہمارے معاشرے کی خاتون ہے اور ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اسے سہارا دیں اور اس کو بے یار و مددگار نہ چھوڑیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عملی طور پر ایسا کر کے دکھایا اور اہل مدینہ نے ہجرت کے موقع پر اس عظیم الشان ہدایت کا عملی مظاہرہ کیا۔ بعد میں بھی غزوات اور جنگوں میں شہید ہونے والے مردوں کی بیویوں، بہنوں، بیٹیوں حتیٰ کہ ماؤں تک کو اسی طرح ایک صالح معاشرے کی طرف سے تحفظ فراہم کیا جاتا رہا۔ روایت میں حضرت سودہؓ

جو نبی کریمؐ کی دوسری بیوی تھیں کی عمر ۶۵ برس بتائی جاتی ہے- آپ خود سوچیے ایک ۶۵ برس کی خاتون ایک پچاس برس سے اوپر کے مرد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو تو ایسا کہنا کیا درست ہوگا کہ یہ جوڑا جذبۂ شہوت کے تحت وجود میں آیا- افسوس یہ ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں اس قسم کی سیدھی سادھی وضاحت نہیں کی جاتی- بلکہ الٹا ایسی روایات کو اسلام کا حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے- جن کی مدد سے اہل مغرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر انگشت نمائی اور دشنام طرازی کرتے ہیں- بدنام زمانہ سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' Stanic Verses میں اس قسم کے اعتراضات اٹھائے گئے ہیں-

حالانکہ سلمان رشدی نے بھی اپنی کتاب لکھنے کے لیے ہمارے ہی ذخیرۂ روایات سے کمزور اور پھینک دیئے جانے کے قابل روایتیں حاصل کی ہیں- بعینہٖ اسی طرح جب غازی علم الدینؒ کے ہاتھوں قتل ہونے والے ہندو پبلشر ''راج پال'' نے کتاب ''رنگیلا رسول'' شائع کی تھی تو اس میں بھی ہماری ہی کمزوریوں کی بدولت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ جنسی ہوس پرست کہنے کی مذموم جرات کی گئی تھی- میرا ارادہ ہے کہ نبی کریمؐ کی پاک اور مطہر سیرت پر ایک ایسی کتاب تحریر کروں جس میں سلمان رشدی کی Stanic Verses اور راج پال کی ''رنگیلا رسول'' میں اٹھائے جانے والے اعتراضات اور پھر ان کے ساتھ ساتھ دیگر مستشرقین کے لاعلمی کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے اعتراضات کا مکمل اور مدلل جواب دیا گیا ہو- لیکن اپنی سیاہ کاریوں کی وجہ سے محسوس کرتا ہوں کہ ابھی میں خود...... اور میرا قلم اتنے پاکیزہ نہیں ہو سکے کہ آقائے نامدار، سرور کائنات رحمت اللعالمینؐ کی مقدس اور دلکش ہستی پر کچھ لکھنے کی جسارت کر سکوں- اے کاش! اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمائے اور میرا یہ دیرینہ خواب پورا ہو سکے-

اگر اہل مغرب اور ان کے مفکرین قرآن حکیم کی تعدد ازدواج سے متعلق اس آیت کا مفہوم جو کہ بالکل واضح ہے سمجھ لیتے تو انہیں ہماری چار چار شادیوں پر اعتراض کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی- ہمارے ارباب مذہب میں سے کسی نے اہل یورپ کے اس بھونڈے اعتراض کا عقلی اور عملی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی- اس کی وجہ اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے ارباب مذہب خود بھی ذاتی طور پر اسی آزادی کے ساتھ شادیوں کے قائل ہیں...... ایک کمزور اور وضعی روایت میں ہے کہ ''اپنے پیش امام کی چار شادیوں کا اہتمام کرو اور ہر بیوی نوجوان اور خوبصورت

ہو- تاکہ امام صاحب کے بھٹکنے کا اندیشہ نہ رہے-'' آپ نے دیکھا...... آپ نے اندازہ کیا کہ اس قسم کی روایت کہاں سے آ سکتی ہے- کیا یہ حد درجہ بڑھتی ہوئی جنسی ہوس کا نتیجہ نہیں- اہل عرب نے تو ہمارے ہاں سے بھی کہیں زیادہ متعدد ازدواج کی قرآنی اجازت کا غلط استعمال کیا ہے- ہم جانتے ہیں کہ اہل عرب اور پھر خصوصاً وہ امیر کبیر لوگ جن کے پاس اس دور میں سرمایے کی فراوانی ہے نہ صرف چار بیویاں رکھتے ہیں بلکہ لونڈیاں اور باندیاں بھی جنسی ذائقہ بدلنے کے لیے اپنے حرم میں ''پال'' رکھتے ہیں- موجودہ زمانے کے اہل عرب کے نزدیک عورت صرف مباشرت کے لیے بنائی گئی ہے اور زیادہ سے زیادہ بیویاں اور لونڈیاں ہونے کو باعث فخر سمجھا جاتا ہے- اس کے برعکس ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرتے ہیں- اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم قرآنی آیت کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ چکے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہزاروں سال ہندو مذہب کے بیچوں بیچ گزارے ہیں اور ہمارے خون میں ہندوانہ عادات اور اپنے بعض مذہبی اعتقادات ایسے رچے بسے ہوئے ہیں کہ ہم انہیں اپنی فطرت کا حصہ سمجھتے ہیں- ہندوؤں کے مذہب میں مرد کے لیے بھی اور عورت کے لیے بھی دوسری شادی حرام اور گناہ ہے- آپ نے سن رکھا ہوگا کہ ہندوؤں کے مذہب میں اپنے رفیق حیات یا لائف پارٹنر کی موت کے ساتھ ستی ہو جانا یعنی مرنے والے کی جلتی ہوئی چتا میں اتر کر جان دے دینا ثواب اور نیکی کا کام ہے- ہندوؤں کے مذہب میں ستی ہونے کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ عورت جس کا شوہر مر گیا باقی ماندہ تمام عمر چوڑیاں توڑ، چٹیا کٹا، سفید کپڑے پہن اور شادی کی اکلوتی نشانی ''منگل سوتر'' اتار کر گزار دیتی ہے- اس کا بھی صاف مطلب یہی ہے کہ بیوہ جسے یہاں کی زبان میں ''رنڈی'' کہا جاتا ہے کے لیے دوسری شادی جائز نہیں...... ہم ہیں تو مسلمان لیکن ہندوؤں کے ہمراہ رہتے ہوئے ہم نے لاشعوری طور پر ہندوؤں کے اس مذہبی اعتقاد کا اثر قبول کیا- ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری بیوی شوہر کی دوسری شادی کے بعد یعنی اس کی دوسری بیوی آ جانے کے بعد اس نئی آنے والی عورت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتی- اسے سوکن یا سوتنیا کے نام سے یاد کرتی اور عمر بھر اس کے درپے رہتی ہے- یہ فطرت جو ہماری عورت کے خون میں راسخ ہو چکی ہے- ہندوؤں کے ہمراہ رہتے ہوئے نفسیاتی طور پر ہمارے مزاج میں داخل ہو گئی- اس کے برعکس اہل عرب کی بیویاں سوکن یا سوتن سے نہ ہی حسد کرتی ہیں اور نہ ہی نفرت-

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ وقت نہیں گزارا- بلکہ وہ زیادہ بیویوں کے عرصہء دراز سے قائل چلے آ رہے ہیں- جس کی وجہ سے ان کی عورتیں نفسیاتی طور پر دوسری، تیسری، یا چوتھی بیوی کو اپنے شوہر کی بیوی کے طور پر قبول کر لیتی ہیں- یہ سوال کہ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے اور عورت کے لیے ایک ہی خاوند کے زیر سایہ رہنا ضروری ہے- جب تنظیم الاخوان پاکستان کے امیر، الفلاح فاؤنڈیشن کے سرپرست کئی کتابوں کے مصنف اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ مولانا محمد اکرم اعوان سے کیا گیا تو انہوں نے یوں جواب دیا-

"اگرچہ مرد و زن دونوں انسان ہیں لیکن ان کے میدان عمل الگ الگ ہیں- لہٰذا ان کے احساسات و جذبات اور کیفیات کے ساتھ ساتھ نفسیات میں بھی تضادات ہیں- اس کی مثال ہم یوں لے سکتے ہیں جیسے ایک باغ ہے جس کی ذمہ داری دو لوگوں پر ہے- ایک کا کام ہے کنواں کھودنا مشقیں بھر بھر کر لانا، پودے لگانا، بیج بونا اور کھاد ڈالنا- جبکہ دوسرے کے ذمے کونپل کونپل، پتی پتی اور غنچے غنچے کی دیکھ بھال کرنا ہے- ننھے منے پودے کو تناور درخت بنا کر ہی اس سے غافل نہ رہنا- یہ دوسری ذمہ داری خاتون پر تھی- لہٰذا اللہ کریم نے اس کی فطرت میں یہ چیز رکھ دی کہ وہ جس طرف بھی متوجہ ہو کلی طور پر ہو- اس کے لیے فطری طور پر ایسا ہونا لازم تھا- ورنہ کائنات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا- اسی فطرت کے تحت وہ جب دل دیتی ہے یا کوئی تعلق قائم کرتی ہے تو اپنی تمام تر محبت خلوص اور توجہ اسی ایک شخص پر مرتکز کر دیتی ہے- وہ اگر ایسا نہ کر پاتی تو نسل انسانی آگے نہ چل سکتی- آپ دیکھ لیجیے! مغرب میں جہاں خاتون کی توجہ اس کی اصل سے ہٹا دی گئی وہاں کاغذات سے ولدیت کا خانہ بھی مٹا دینا پڑا اور خود ایک امریکن ادیب نے اپنے معاشرے پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے- (The Lonelycrowd) یعنی "اکیلے انسانوں کا ہجوم" تو معاشرتی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے، بنی آدم کو انسان بنانے کے لیے اور بقائے نسل کے لیے عورت کا اپنی فطرت کے مطابق یکسو رہنا ضروری ہے-

مرد کو چونکہ باہر ڈیل کرنا ہے کہیں سے کھاد لانی ہے کہیں سے پانی لانا ہے، کہیں سے کدال لانی ہے تو اس کی توجہ مختلف جہات میں ہوتی ہے- لہٰذا اس کا مزاج ہی ایسا

ہے کہ وہ مختلف جہات میں رشتے قائم کر لیتا ہے- پھر ایک اور بات بھی ہے- میڈیکلی ایک خاتون کی زندگی میں اپنی ذات کے اندر بہت تغیر ہے- اسے بچے کو پیدا ہی نہیں کرنا بچے کی پرورش بھی کرنی ہے- وہ مرد سے تعلق استوار کرنے کے بعد مصروف تر ہو جاتی ہے- اس کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں رہتا بلکہ مختلف ادوار میں بٹ جاتی ہے- جبکہ مرد ایک رشتہ قائم کرنے کے بعد اپنی اکلوتی ذات میں مصروف نہیں ہوتا یعنی وجودی طور پر اس کی ذات میں کوئی مصروفیت نہیں آتی- لہٰذا بسا اوقات اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی خاتون کے ساتھ منسلک رہے- اس لیے مڈل ایسٹ وغیرہ میں اگر کوئی مرد بغیر کسی معاشی مجبوری کے ایک ہی بیوی رکھے تو اس کے کردار پر شک کیا جاتا ہے- ہمارے ہاں تو ہندو معاشرت کے ساتھ ملنے کی وجہ سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا جرم ہو گیا- ورنہ مسلم معاشروں میں صرف ایک شادی پر قناعت کرنا عیب سمجھا جاتا ہے اور پھر جن معاشروں میں دوسری شادی کی ممانعت ہے وہاں آپ یہ ضمانت نہیں دے سکتے کہ مرد کے جنسی تعلقات واقعی ایک ہی عورت کے ساتھ ہیں- لہٰذا میڈیکلی بھی، فطری اعتبار سے بھی اور سائنسی اعتبار سے بھی مرد کو ایسا کرنا چاہیے کہ وہ ایک سے زیادہ جنسی تعلقات رکھ سکتا ہو- جن معاشروں میں بھی انسانی اقدار باقی ہیں ان کا سبب وہ عورتیں ہیں جو ایک وقت میں ایک ہی جگہ اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں (۱۱۷)-"

مولانا اکرم صاحب کا یہ لیکچر تعدد ازواج کے جواز میں ہے- اول تو اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت بھی کچھ خاص معاشرتی مقاصد کے تحت ہے- جو قرآن حکیم نے 'فاالنکحو فی الیتمیٰ' کہہ کر بیان کر دیئے ہیں- البتہ مولانا محترم کے لیکچر میں یہ بات ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تعدد ازواج کو فطرتاً قبول کرنے کی لچک بھی ہے-

باب ۱۰

فطرت میں اخلاقیات (Ethics) کا حصہ

انسان بحیثیت اشرف المخلوقات

خالق جو علیم وخبیر ہے...... جانتا تھا کہ یہ حیوان اشرف المخلوقات بننے کے بعد اتنی صلاحیت حاصل کر لے گا کہ تسخیر کائنات کے ساتھ ساتھ اپنی شعلہ مثال، فطرت پر بھی قابو پا سکے۔ وہ لوگ جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں سمجھتے جو اسے کائنات کا ایک حادثہ قرار دیتے ہیں۔ جو خالق کے وجود سے انکاری ہیں۔ جنہیں عام اصطلاح میں دھریہ کہا جاتا ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ......

"زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا"

۱۔ جو یہ کہتے ہیں کہ......

"شعور انسان کے خلاف مادے کی منظم سازش ہے"۔ (مارکس)

یا یہ کہتے ہیں کہ......

"الانسان حیوان الناطق" "انسان محض بولنے والا جانور ہے"۔ (افلاطون)

یا یہ کہتے ہیں کہ......

"Man is a social animal"

"انسان محض ایک سماجی جانور ہے" (ارسطو)

وہ لوگ خالق کے اس تمثیلی دعوے کو فرضی قرار دیتے ہیں۔ اور انسان سے مایوس ہیں۔

وہ محض مادیت کے قائل ہیں "افلاطونی" نظریات کے عکاس اہل یورپ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ آج اہل یورپ جو کائنات کی وسعتوں کو چھو لینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جنہوں نے چاند کی ویران غاروں میں جھانک لینے کی ہمت پیدا کر لی ہے۔ حقیقت میں انسان کے مستقبل سے

ں ہیں۔ وہ خالق کائنات کو ایک تخریبی قوت سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس خالق کے تخریبی ہونے کی ب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ

) بلی چوہے کو کھا جاتی ہے۔ (ب) شیر بکری کو کھا جاتا ہے۔

ج) بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے۔

جب مظاہر فطرت میں یہی شیطنیت موجود ہے۔ جب خالق کائنات نے ہی "جس کی لاٹھی ی کی بھینس...... (Might is right) کا اصول بنایا ہے۔ تو پھر انسان سے اعمال صالح کی قع کیونکر کی جاتی ہے...... لیکن ان کی نظر اس چڑیا پر کیوں نہیں پڑتی جو بچوں کے منہ میں ایک جدائی حکم کے تحت دانہ ڈالتی ہے۔ ان کی نظر ان دریاؤں پر کیوں نہیں پڑتی جو پہاڑوں کی رگوں ے نکل کر ساری زمین کو سیراب کرتے ہوئے سمندروں کو جا آباد کرتے ہیں۔ ان کی نظر غنچوں کی چٹخ اور پھولوں کی مہک، ہواؤں کی دل فروزی، سمندروں کے طلاطم، لہروں کے تموج، شاخوں کے جھکاؤ، دریاؤں کے بہاؤ، ہر تخلیق کے حسن، ہر صنعت کی خوبی اور ہر تصویر کی دلکشی پر کیوں نہیں پڑتی۔ جن سے مظاہر فطرت میں تعمیرت ہی تعمیریت کی نمائندگی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "انسان" سے مایوس ہونے والے جلد باز تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ جو مکالمہ کیا...... یعنی اللہ نے یہ جو ظاہر کیا کہ انسان زمین میں فساد اور خون بہانے کی بجائے جنت تخلیق کرے گا۔ کیونکہ اس کے پاس شعور ہے (جو صفت خداوندی ہے)۔ تو اللہ رب العزت کا یہ ارادہ ابھی پایہء تکمیل تک نہیں پہنچ پایا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ مادہ پرست لوگ جلد باز ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی انسان نے دیکھا ہی کیا ہے۔ نبی آخر الزماں ؐ کی آمد اور خصوصاً آپ ؐ کے خاتم المرسلین ہونے کا صاف مطلب ہے کہ اب انسان کا شعوری ارتقاء مکمل ہو چکا ہے۔ اور اب اسے خالق کائنات کی طرف سے مزید ہدایات کی ضرورت نہیں قرآن مجید میں ہے۔ "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" آج کے دن میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دی ہیں۔ اور میں راضی ہوں کہ تمہارے لیے دین اسلام ہے۔

"تو اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ اب انسان جو دھیرے دھیرے شعور کی تمام منزلیں طے کرتا

ہوا اس مقام تک پہنچا کہ اسے آخری ہدایت نامہ فراہم کردیا جائے...... خالق کے پروگرام کے مطابق انسانیت کی گاڑی کو اپنے شعور کی مدد سے اور آخری ہدایت نامہ کی روشنی میں اس منزل مقصود تک لے جائے گا جسے بہشت بریں یا جنت الفردوس کہتے ہیں- یہ چند دنوں کی بات ہے خالق کائنات کے نزدیک وقت کی کیا اہمیت ہے- اس کا تو نہ ماضی ہے نہ مستقبل' وہ تو ابدی حال ہے- ابدی حال' سورج کا طلوع وغروب اور گردش لیل ونہار تو ہم مخلوقات کے لیے ہیں جن سے ہم اوقات متعین کرتے ہیں اور دنوں اور سالوں کی پیائش کرتے ہیں- لہٰذا یہ کہنا کہ طویل مدت بیت گئی اور انسان کی سرشت سے جناتی خصلت نہ گئی درست نہیں- وہی جناتی خصلت جو اس کی بشریت کے وقت سے اس کے حضور سجدہ ریز نہ ہوئی- وہی جناتی خصلت جو اس کے شعور سے قبل اس میں پائی جاتی تھی- اور جو ''نینڈر تھل'' اور ''کرومیگنان'' کے وجود کے ساتھ دنیا سے مٹ تو گئی لیکن کلیتاً ختم نہ ہوسکی- اور فطرت کے ساتھ ساتھ اس کی ذات میں منتقل ہوتی رہی- وہی جناتی خصلت جس میں انگارے کی تپش اور شعلے کی لپک ہے اور جو آن کی آن میں اعمال کے کھیت کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے- قرآن حکیم اس موقع پر اعلان کرتا ہے- ''**حبطت اعمالهم** ان کے عمل کی کھیتیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں-'' وہی جناتی خصلت اس میں منتقل ہوئی اور اسے مٹی کے پتلے سے آگ کے شعلے میں تبدیل کردیا- ہاں! وہی جناتی خصلت اس میں سے نہ گئی (اور مایوس لوگوں کے بقول طویل مدت گذر گئی- انہیں لوگوں کے بقول ہزاروں سال گذر گئے لیکن انسان کی اصلاح نہ ہوسکی...... ایسا کہنے والے مایوس لوگ ہیں اور مایوسی ابلسیت ہوتی ہے- سچ تو یہ ہے کہ انسان خالق فطرت کے حضور ابھی ابھی بالغ ہوا ہے' ابھی تو اسے ہدایت نامہ ملے انتہائی مختصر وقت گزرا ہے- خالق کے پروگرام تو لاکھوں کروڑوں سال پر محیط ہوتے ہیں- وہ ازل...... سے بھی پہلے تھا اور ابد کے بعد...... تک بھی رہے گا- وہ جس کی قدرت لامتناہی اور جس کی بساطت لامحدود ہے- جو ہر شے میں اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہے- اور جہاں کوئی شے نہیں وہاں بھی...... وہ جس کی قدرت کاملہ کسی کی محتاج نہیں...... اور جو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے کسی کا منتظر نہیں- بقول اقبالؒ......

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ہاں! اس مختار کل کے لیے صدیوں اور ہزاروں سال کی کوئی اہمیت نہیں...... یہ...... چند عرصہ قبل اس نے ''باشعور'' انسان کو زندگی گزارنے کے لئے ضابطہء حیات عطا کیا- اور اب یہ 'بالغ انسان' اسے طرح طرح سے سمجھنے کی کوشش کررہا ہے اور اس کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ ضابطہء حیات سے استفادہ کرے- جس نے اس کی زندگی کے لیے اسے ''اعمال صالحہ'' کی دعوت دی اور نتیجہ پہلے بتا دیا- کہ اس طرح ''نہ کوئی خوف تم پر طاری ہوگا اور نہ کوئی حزن-''......

من امن باللہ والیوم الآخر و عمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم فلا خوف علیهم ولا یحزنون o

جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت پر اور صالح اعمال کئے (اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو تم پھر ان کے لئے اللہ کے پاس اجر ہے اور نہ کوئی خوف ان پر طاری ہوگا اور نہ کوئی حزن)

یہ وہ مقام ہے جہاں سے انسان کے لیے انسان بننے کی دعوت شروع ہوتی ہے-

لیکن ہوا یوں- کہ انسان اب تک ''اعمال صالحہ'' سے دور رہا- اس نے ابھی تک اس دعوت کو دل وجان سے قبول نہیں کیا اور یہی اس کی غلطی ہے- قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

والعصر ان الانسان لفی خسر o الا لذین امنو وعملو الصلحت

گواہ ہے زمانہ- کہ انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ (خسارے میں نہیں ہیں) جنہوں نے صالح اعمال کیے'' اور سوچیے! کیا زمانہ گواہ نہیں؟ کیا لیل ونہار کی یہ گردش گواہ نہیں؟ کیا تاریخ کا یہ سفر گواہ نہیں؟ کیا اجڑی ہوئی بستیاں اور یہ سسکتی ہوئی زندگیاں گواہ نہیں؟...... کہ انسان اپنی اصلیت سے ہٹ کر خسارے میں ہے...... انسان نے اپنے اندر کے بھڑکتے ہوئے شعلے کی بات مان لی- اور اس مردود ابلیس کے پیچھے لگ گیا- جو اس کا ازلی دشمن ہے کبھی کسی جانور نے اپنی نوع کے کسی دوسرے جانور کا قتل نہیں کیا- لیکن انسان نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کیا ہے- دوسری جنگ عظیم میں ابلیس کے اس شاگرد نے ایک ایک بم پھینک کر جاپان کا ایک ایک شہر تباہ کردیا' لیکن ابھی تک ''یزدان'' اس سے مایوس نہیں اور کبھی مایوس ہوگا بھی نہیں کیونکہ وہ ازل سے ابد تک کی خبر رکھتا ہے اور اگر اسے معلوم نہ ہوتا...... کہ آگے کیا ہونے والا ہے تو کچھ بھی تخلیق نہ کرسکتا- یہ کائنات حادثہ نہیں ہے اور نہ ہی انسانی تخلیق...... یہ پروردگار کا ایک عظیم الشان منصوبہ ہے- اس لیے وہ اس منصوبے میں خلل ڈالنے والوں یا اس میں تاخیر کا باعث بننے والوں کو اپنا دشمن؟ کہتا ہے- یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ خالق ہی کیا جس کے منصوبے میں کوئی مخلوق خلل اندازی کی جرات کرے-

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ **احسن الخالقین** نے اس منصوبے کی تکمیل "انسان" کے ہاتھوں ہونا مقرر کی۔ یہی وجہ ہے کہ "انسان" اس منصوبے میں خلل یا تاخیر کی کوشش کر سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ خالق کائنات جانتا ہے یہ منصوبہ مکمل ہو کر رہے گا اور اس کے دشمن بے نام و نشان ہو جائیں گے "**انَّ شانئک ھو الابتر**" بے شک تیرے دشمن بے نام و نشان ہو جائیں گے" اب دیکھنا یہ ہے کہ اس منصوبے میں کون خلل اندازی کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔ پیچھے ہم بیان کر آئے ہیں کہ انسان کے تدریجی ارتقاء میں انسان پے در پے غلطیاں کرتا رہا اور اپنی فطرت کے خلاف بہت سی غیر فطری حرکتوں کو اپنی مستقل عادت جسے فطرت ثانیہ کہتے ہیں بنا بیٹھا اور ان عادات میں سب سے بڑی جنسی تحریک ہے، جس نے انسان کی فطرت میں شامل ہو کر اس کو مقام انسانیت سے نیچے گرا دیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ......

"اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والے جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں"

جنسی تحریک، بے شک فطرت" تھی بلکہ جبلت تھی، لیکن صرف افزائش نسل کے لیے۔"

مگر اب انسان نے اتنی صدیوں تک اپنی اس جبلت؟ کا بذریعہ شعور غلط استعمال کیا۔ کہ قانون قدرت نے اس کے "جینز" میں تبدیلی پیدا کر دی۔ بصورت دیگر اسی زمین پر انبیاءؑ کی مثالیں موجود ہیں۔ جنھیں خالق کائنات نے اس دنیا میں پیدا کیا اور اپنے بندوں کے ہاتھوں اپنے پروگرام کی تکمیل کر کے دکھائی۔

کامل ترین انسان

کیا یہ سچ نہیں کہ ابراہیم علیہ سلام کے ذریعہ پروردگار نے نبی آخر الزماں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کا منصوبہ بنایا۔ وہ ابراہیم ہی تھے جنھوں نے ہزاروں سال قبل دعا مانگی تھی۔ **ربنا وبعث فیھم رسولاً منھم یتلو علیھم**

ترجمہ "اے ہمارے رب ان میں رسول مبعوث فرما جو انہیں آیات پڑھ کر سنائے۔

یہ صرف دعا نہیں ہے، پروردگار کے ایک منصوبے کی تکمیل کا ایک مرحلہ ہے۔ وہ منصوبہ جسے مالک کائنات نے کائنات سے بھی پہلے تجویز کیا......یعنی بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کا مقصد ملائکہ کو نمونہ دکھانا بھی تھا اور اپنے پروگرام کو آخری ٹچ (Final touch) دینا بھی۔

بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات میں ہی وہ مثالی انسان موجود تھا۔ جسے معراج انسانیت کہا جا سکتا ہے۔ گویا مظاہر کائنات کو محمد رسول اللہ کی صورت میں نمونہ دکھا کر بتایا گیا کہ......دیکھو! یہ وہ! انسان کہ جس طرح کا انسان بنانا مجھے مقصود تھا۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ

"اللہ رب العزت نے ساری کائنات کی ارواح تخلیق کرنے سے پہلے میری روح کو تخلیق کیا" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی وہ مکمل انسانی نمونہ تھی کہ جس طرح کی ذات حاصل کر کے، جس طرح کی زندگی اختیار کر کے......اس سرزمین کو پرامن جزیرہ، بہشت بنایا جا سکتا ہے۔ ایک اور مقام پر نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ

"میرے اسلاف (آباؤ اجداد) میں کوئی بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں گزرا"

اس حدیث شریف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے جینز پاک تھے اور نبیؐ کی پیدائش کا منصوبہ ہزاروں سال پہلے چل رہا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا دعا کرنا ایک طرح سے مصمم ارادہ کرنا ہے۔ ابراہیمؑ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! میری نسل میں وہ شخص پیدا فرما جسے تو نے معراج انسانیت کا شرف بخشا ہے۔" گویا حضرت ابراہیمؑ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس ہادی برحق اور انسان کامل کی پیدائش کے لیے راہ ہموار کریں گے۔ ان کے اس ارادے کے ساتھ ہی ان کے اطوار زندگی میں ایک لگن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں اولاد ابراہیمؑ کی جینز میں اس رادہ کی تکمیل شامل ہوئی اور یوں ہزاروں سال بعد ایک ایسا شخص دنیا میں ظہور پذیر ہوا جس کے جینز پاک تھے۔ ہر گناہ اور کمزوری سے پاک تھے۔ بعینہ یہی مضمون سمجھانے کے لیے نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔

"میرے دل میں شیطان کا خانہ نہیں"

اور یوں انسان کامل کا ظہور ہوا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ کی ذات ہی وہ ثبوت ہے جس کی مدد سے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ انسان چاہے تو زمین کی پریشانیاں اور مصائب ختم کر سکتا ہے۔ یہ بے چینیاں، یہ اضطراب، یہ بیماریاں، یہ غربت، یہ بھوک، یہ بدامنی، یہ وحشت، یہ خوف، یہ غم اور حزن یہ تکالیف، یہ بے پناہ مسائل کا انبار، یہ دکھ اور درد کی زندگی کا بوجھ......واقعی بظاہر ختم ہوتے محسوس نہیں دیتے۔ ان مسائل کے حل کے لیے مفکرین نے دفتروں کے دفتر کالے کر دیئے۔ انسان کو انسان کے قریب لانے کے لیے طرح طرح کے نظام اور بھانت بھانت کے نظریے متعارف کروائے گئے۔ اور سینکڑوں لوگوں نے انسانیت کے لیے طرح طرح کے دکھ جھیلے ہیں اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔ لیکن یہ مسائل روز بروز بڑھتے گئے۔ واقعی بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ انسان کبھی بھی راہ راست پر نہیں آئے گا۔ غالب نے اپنی مایوسی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن یہ مایوسی کا عالم ہے اور یاسیت کو رب العالمین نے "ابلیسیت" کہا ہے اور انسان کو حوصلہ دلایا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اے انسانو! یہ زمین تمہاری ہے اور تم اس کے وارث ہو۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ

"ربنا اتنافی الدنیا حسنته وفی الآخرة حسنة"

"اے ہمارے رب! ہماری دنیا بھی حسین بنا اور آخرت بھی"

اور یوں پروردگار نے شہہ دی ہے کہ انسانو! کارگہء عالم کا نقشہ بدلنے کی کوشش ہر وقت کرتے رہو۔ اپنی متاع گم گشتہ جسے قرآن نے جنت الفردوس کہا ہے کے حصول کے لیے اپنی ہمتوں کو آواز دو۔ ہوتا وہی کچھ ہے جس کی تم محنت کرتے ہو۔ جسے تم طلب کرتے ہو۔ جس کی تم خواہش کرتے ہو' "لیس للانسان اله ماسعٰی" انسان کے لیے اپنی کوششوں کے سوا کچھ نہیں اور یہ بھی فرمایا کہ "نصیب مما اکتسبو" تمہارا نصیب وہی ہے جسے تم (اپنے ہاتھوں سے) کسب (بناتے) کرتے ہو' ان حوصلوں اور تسلیوں کے ساتھ پروردگار انسان کو ہمت باندھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور انسان کو مشورہ دیتا ہے کہ تم اپنے نفس کے شعلے پر غالب آسکتے ہو۔ اپنی فطرت کو (جو فطرت اصلیہ نہیں) بدل سکتے ہو۔ اور اپنے جینز میں مثبت تبدیلی لاسکتے ہو۔ اس کے لیے ایک سوچے سمجھے ارتقائی عمل کی ضرورت ہے۔ جو خالق کائنات کے احکامات کی روشنی میں انسان خود پورا کرے گا۔

مذاہب عالم کے ساتھ انسانی رویہ

مذہب......جس کے نام پر انسان ہزاروں سال سے ایک دوسرے کا خون بہاتے آرہے ہیں۔ جس نے گھر کے گھر نہیں۔ شہر کے شہر نہیں ملک کے ملک اجاڑ دیے۔ جس نے زمین پر بسنے والی مخلوقات کو غیر محفوظ کر دیا۔ جس نے خالق کائنات کی سب سے حسین مخلوق انسان کو اپنے ہاتھوں میں ایسا کھلونا بنایا کہ کسی کٹھ پتلی کی طرح اشرف المخلوقات نے قتل وخونریزی کے تماشے دکھانے شروع کر دیئے اور تماشے بھی ایسے ایسے خطرناک جن کی دہشت سے فرشتوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ یہ مذہب ہی تھا جس نے لاکھوں کی فوجوں کو لاکھوں کی فوجوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ انسان انسان کے سامنے ڈٹ گیا۔ صلیبی جنگیں ہوں یا نپولین کی پیش قدمی' پہلی جنگ عظیم ہو یا ایٹم بم کے دھماکے جن سے دوسری جنگ عظیم کے دوران دو ہنستے بستے شہر صفحہء ہستی سے نابود ہو گئے۔ جہاں بھی انسان قتل ہوا جہاں بھی ابن آدم کا خون بہایا گیا کارستانی مذہب کی ہی تھی حالانکہ یہی انسان جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو کائنات کا بلاشرکت غیرے وارث سمجھتا ہے اور جسے اپنے باشعور اور عقل مند ہونے پر بے پناہ فخر ہے۔ موازنہ کیا جائے تو ان جانوروں سے جن کے پاس شعور آگہی کی دولت نہیں چنداں مختلف نہیں

اور اس حقیقت سے بھی کوئی بے خبر نہیں کہ یہ مذہب ہی ہے جس کے نام پر اب تک لاکھوں انسان اس دنیا سے ادھوری زندگی گزار کر چلے گئے اب دیکھنا یہ ہے کہ مذہب نے ایسا کیوں کیا۔ تاریخ کی کتابوں کے مطالعے اور انسانی نفسیات کے گہرے مشاہدے سے یہ حقیقت واشگاف الفاظ میں کھل جاتی ہے کہ اس کی بنیاد بھی "سیکس" تھا۔ وہ کون سا مذہب ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد جنسی رغبتوں پر نہیں اٹھائی ماسوائے قرآن حکیم کے جو سرور کائنات محمد الرسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے قلب اطہر پر اللہ رب العزت نے اتارا' کون سی ایسی مذہبی کتاب ہے۔ جس نے سیکس کا پرچار نہیں کیا۔ یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف قرآن حکیم ہی کتاب اللہ ہے' ورنہ مسلمانوں کے تاریخ دانوں' مبلغوں اور بڑے بڑے علماء نے اسرائیلیات سے متاثر ہو کر اسلام میں جنسیات کا ایک پورا دفتر داخل کر دیا ہے۔ بات ہو رہی تھی کہ مذہب نے جنسی راستوں پر چل کر انسان کی درست رہنمائی نہیں کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بذات خود مذہب ان معاملات میں مجرم نہیں بلکہ وہ لوگ اس جرم کے مرتکب ہیں جنہوں نے مذاہب حقہ میں افتراء پردازیاں کیں۔ لیکن انہوں نے افتراء پردازیاں کیوں کیں۔ اور جواب یہ ہے کہ "بگڑی ہوئی انسانی فطرت کے ہاتھوں......اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا مذہب نے انسانی فطرت بگاڑی تھی یا "بگڑی ہوئی فطرت" نے مذہب کو آلودہ کیا تھا۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو مذاہب حقیقت میں انسان کی بگڑی ہوئی فطرتوں کو سدھارنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن انسان اس درجہ بگڑ چکا تھا کہ اس نے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق مذہبی تعلیمات کو بدل ڈالا

"وغرهم فی دینهم ما کانو یفترون"

ترجمہ: اور انہوں نے اپنے دین میں از خود تبدیلیاں کر لیں۔

چنانچہ مذہب قاتل نہیں اور نہ ہی کوئی مذہب قتل وخوں ریزی کا درس دیتا یا دنگا فساد پسند کرتا ہے۔ تمام کے تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ پر قتل وخون ریزی اور فسادات کو مٹانے کے لئے آئے تھے لیکن انسان کی شعلہ مثال فطرت......انسان کی جناتی خصلت...... مسلسل سرکشی پر آمادہ رہی اور اسے مذاہب کی نصیحتوں' آدرشوں اور اصولوں کے خلاف اکساتی رہی لہٰذا یوں کہنا کہ مذہب قتل و غارت گری کا باعث ہے بالکل غلط ہے۔ مذہب امن وسلامتی کا ضامن ہے اور کوئی بھی مذہب دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ انسانیت کو دکھ کے عذاب سے نکالے اور لڑتے بھڑتے انسانوں کو محبت کا درس دیتے رہے۔ البتہ مذاہب کی موجودہ شکلیں تحریف شدہ ہونے کی وجہ سے مذاہب اپنے اصل مقصد سے دور چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کو شروع دن سے ہی محفوظ رکھنے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کو خود کرنا پڑا اور جس کی وجہ سے قرآن حکیم آج تک لفظ بہ لفظ وہی ہے جو نبی کریمؐ کے قلب اطہر پر

نازل ہوا تھا۔ اس کے برعکس دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کو پڑھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ کج فطرت لوگوں نے کس طرح جان بوجھ کر آسمانی تعلیمات اور اعلیٰ اخلاقیات کا حلیہ بگاڑا اور کس طرح انسانیت کی روح کو جان بوجھ کر کچلنے کی کوشش کی۔

ہندوؤں کی ''رامائین'' پڑھ کر ایک صاحب نظر کے لئے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ ''رام'' اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ تھا جو تین چار ہزار سال قبل آریہ سماج میں اجودھیا کی سرزمین پر پیدا ہوا اور جس نے گمراہ انسانوں کو ''سورگ'' (جنت) کی راہ دکھائی۔ اس نے انصاف، عدل اور سلامتی کے قیام کے لئے اپنی تمام زندگی صرف کی اور جہاں کہیں ضرورت پیش آئی ظالموں اور غاصبوں کو بزور شمشیر بھی زیر کیا اور انسانی مساوات کا سبق عام کیا۔ لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ ہندو ''راما'' کو کیا سمجھتے ہیں۔ آج ہندو خدا کے اس برگزیدہ اور نیک بندے کو ہی ''خدا'' سمجھتا ہے اور رام کو ''برہمہ'' کا زمینی روپ کہہ کر اس کی پوجا کرتا ہے۔

بدھ مت کے ماننے والوں نے بھی یہی کچھ کہا۔ مہاتما بدھ جیسے نیک طینت انسان کو مرنے کے بعد ''خدا'' بنا لیا اور ان کی تعلیمات کو بگاڑ دیا۔

یہی حال عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کیا اور اللہ کے اس عظیم اور جلیل القدر پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہہ کر اس کی پوجا شروع کر دی۔

مختصر یہ کہ ہر مذہب والوں نے یہی کچھ کیا اور اپنی اصل تعلیمات کو بگاڑ دیا۔ اب اس میں مذاہب کا کیا قصور ہے؟ قصور تو ہے اس انسان کا جس نے یہ گھناؤنا کھیل کھیلا اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اللہ کے احکامات میں تبدیلیاں کیں۔ پھر کارل مارکس جیسوں کا یہ کہنا کہ ''مذہب عوام کے لئے افیون ہے'' دیانتدارانہ روش نہیں۔ ان مذاہب کے ماننے والوں نے تبدیلیاں کیں تو اس کے نتائج بھی بھگتے۔ اللہ کے احکامات بگاڑنے سے اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگڑتا انسان کا اپنا ہی خسارہ ہوتا ہے اہل کلیسا کو ہی لے لیجئے۔ اپنے مذہب میں من گھڑت تبدیلیاں کر کے وہ کس مقام پر پہنچے۔

اہل کلیسا کی قابل رحم حالت

اہل کلیسا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور ان پر نازل ہونے والی وحی کو اپنی شیطانی خواہشات کی پیروی میں تبدیل کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تمام عیسائی دنیا انتہائی شرمناک حد تک قعر مذلت میں جا گری۔ قرون وسطیٰ میں عیسائی دنیا کی اخلاقی اور معاشی حالت قابل رحم تھی۔

یورپ صدیوں تک وحشت و بربریت اور جہالت میں گرفتار رہا اور اب تک ہے...... وہاں تہذیب و اخلاق کا کوئی تصور نہیں۔ موجودہ عیسائی دنیا میں اگر مادی ترقی نظر آتی ہے تو یہ سپین کے مسلمانوں کی بدولت ہے۔ لیکن اخلاقی لحاظ سے آج بھی اہل یورپ ظالم، ناانصاف، خودغرض اور جاہل ہیں۔ ڈاکٹر ڈریپر (۱۱۸) لکھتا ہے کہ......

قرون وسطیٰ میں یورپ کا بیشتر حصہ لق و دق بیابان یا بے راہ جنگل تھا۔ کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ جابجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے۔ لندن اور پیرس میں لکڑی کے مکانات تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ روشندان اور چمنیاں نہیں تھیں۔ آسودہ حال امراء فرش پر گھاس بچھاتے اور بھینس کے سینگ میں شراب پیتے تھے۔ گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے ہوتے روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ مویشیوں کے ساتھ ایک کمرے میں سوتے۔ سالہا سال ایک ہی لباس پہنے رکھتے جو انتہائی میلا اور بدبودار ہوتا، نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی (۱۲۵۰-۱۲۱۲) پہ کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔ جب سپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا تو فلپ دوم (۱۵۲۸-۱۵۵۷) نے تمام حمام حکماً بند کر دیئے تھے۔ اس بادشاہ نے اشبیلیہ کے گورنر کو اس لیے معزول کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرح روزانہ ہاتھ منہ دھوتا ہے۔''

غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے جوؤں کی یہ کثرت تھی کہ کنٹربری (برطانیہ) کا لاٹ پادری باہر نکلتا تھا تو اس کی قبا پر سینکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں ۱۰۲۰ء تک لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بکتا تھا۔ فرانس کے ایک دریا ساؤن کے کنارے انسانی گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔ امراء معدودے چند تھے جن کا کام زنا، شراب نوشی اور جوا تھا۔ جاگیرداروں کے قلعے ڈاکوؤں کے اڈے تھے جو مسافروں پر چھاپے مارتے اور زرفدیہ وصول کرنے کے لیے انہیں پکڑ لاتے، بے گناہوں کو ناکردہ گناہوں کی اکثر سزائیں یوں دی جاتیں کہ پاؤں کے انگوٹھوں کو رسی سے باندھ کر الٹا لٹکا دیتے یا گرم سلاخ سے جسم داغتے یا گرہ دار رسی سر کے گرد لپیٹ کر پوری طاقت سے مروڑتے یورپ کے ڈاکو آدم خور ہوا کرتے تھے، وبائیں عام تھیں۔

ان کے پادری فریب اور جعلسازی سے کام لیتے تھے۔ پوپ جنت کی راہداریاں اور گناہ کرنے کے پرمٹ فروخت کیا کرتا تھا۔ مارٹن لوتھر (۱۵۴۶) پروٹیسٹنٹ فرقے کا بانی اسی لیے باغی ہوا تھا کہ جرمن میں پرمٹ اور راہداریوں کا ٹھیکہ کسی اور کو مل گیا تھا اور لوتھر کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔

سود حرام تھا لیکن پوپ کا بینک لوگوں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتا تھا۔ عوام قبر پرست اور

مجسمہ ساز تھے- علماء عشائے ربانی' کرامات اولیاء' رہبانیت اور تصرفات روحانی کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے-

یہ الفاظ ڈاکٹر ڈریپر کے ہیں جسے گھر کا بھیدی بھی کہا جا سکتا ہے- وہ آگے چل کر لکھتا ہے اہل روم کی بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ ڈٹ کر کھاتے' تیز شراب پی کر غل غباڑہ کرتے' فساد کرتے اور ہر روز حرام کاری کے نئے ریکارڈ قائم کرتے-

ایک اور مورخ گبن (۱۱۹) لکھتا ہے-

"اتنے طویل تاریخی زمانے میں بدی کی یہ کثرت اور نیکی کی یہ قلت کہیں نظر نہیں آتی-"

گاتھ قوم کا ایک مؤرخ پروکوپیس (۵۶۰ء) لکھتا ہے

"میں ان وحشیوں کے ہولناک افعال کے ذکر سے صفحات تاریخ کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا- تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے خلاف انسانیت افعال کی مثال زندہ رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہو"

عیسائیوں نے ۱۰۹۹ میں بیت المقدس پہ قبضہ کیا تھا جو ۱۱۸۷ تک جاری رہا- گویا کل ۸۸ سال- اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس دوبارہ آزاد کرا لیا- ان جنگوں کو صلیبی جنگیں کہتے ہیں- بریفالٹ (۱۲۰) لکھتا ہے

"صرف بیس سال کے مختصر عرصہ میں ان عیسائیوں نے سارے ملک کو برباد کر دیا یہاں جاگیردارانہ نظام جاری کر دیا- ملک کو ٹکڑوں میں بانٹ کر مختلف یورپی سرداروں کے حوالے کر دیا- جو انتہائی جاہل لوگ تھے- اور آپس میں لڑتے رہتے تھے- ان ظالموں کا مقصد صرف دولت لوٹنا تھا- انہوں نے ایک ایسے ملک کو جو عربوں کی مدبرانہ حکومت کی وجہ سے شاداب تھا بالکل برباد کر دیا-"

موسیو ژاک (۱۲۱) ڈی وتری جو اسی زمانے میں فلسطین کے ایک شہر عکہ کا پادری تھا اپنی کتاب تاریخ بیت المقدس میں لکھتا ہے-

"پہلے صلیبیوں سے باخدا لوگ تھے ذلیل' بدوضع اور شریر انسان یوں نکلے جیسے شراب سے دود..... زیتوں سے چھال..... گیہوں سے بھوسہ"

قرون اولیٰ کے لوگوں کے بارے میں ہم پچھلے ابواب میں تفصیلی ذکر کر چکے ہیں..... یہ قرون وسطیٰ کے مذہبی انسانوں جو اس وقت عیسائی تھے..... کے حالات کا اجمالی ذکر ہے- ہم کہہ چکے ہیں مذاہب کا قصور نہیں ہے- بدفطرت انسانوں کا قصور ہے جنہوں نے شیطان کی اطاعت میں اللہ کے صاف ستھرے احکامات بدل کر غیر انسانی اخلاقیات بلکہ بداخلاقیات میں تبدیل کر دیا

"موسیو لیبان" ایک فرانسیسی مؤرخ لکھتا ہے کہ

"جب صلیبیوں کی فوج کسی طرف جاتی تو تمام دیہات' قصبات' میں قتل و غارت کا

بازار گرم کر دیا جاتا- یہاں تک کہ جو انسان نظر آتا اسے مار ڈالتے- ان کا ایک شغل یہ بھی تھا کہ جو بچہ ہاتھ آتا اس کی تکا بوٹی کر کے آگ میں پھینک دیتے- معمولی سے جرم کی بناء پر فوج کے سپاہیوں کو ذبح کر دیا جاتا اور اس کا گوشت بھون کر باقی فوج کو کھلا دیا جاتا یہ لوگ عورتوں' مردوں' بچوں' یہودیوں' عیسائیوں' مسلمانوں' سب کو مارتے اور بعض دفعہ ایک رسی میں باندھ کر کئی کئی لوگوں کو پھانسی دی جاتی-"

یہ حال تھا اس وقت کے مہذب ترین مذہب یعنی عیسائیت کو ماننے والوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کا برطانیہ جو اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا دعویدار ہے- صرف ڈھائی تین سو سال پہلے تک غلاموں کی خرید فروخت کا سب سے بڑا مرکز تھا- یہاں غلام عموماً پانچ شلنگ فی کس کے حساب سے مل جاتے- یہاں کلیسا کو کتابیں ناپسند تھیں اور لکھنے والوں کو کلیسا کے حکم سے چیرنگ کراس اور ٹمپل بار پر کاٹھ مار کر سنگسار کر دیا جاتا- فرانس کا یہ عالم تھا کہ کوئی حکومتی نمائندہ ٹیکس لینے کے لیے کسی بستی میں داخل ہوتا تو ساری آبادی مارے ڈر کے بستی چھوڑ کر بھاگ جاتی- اور سرکاری ملازم ان کا سارا سامان اٹھا کر لے جاتے- فرانس میں چند صدیاں قبل تک بھوکوں کے مسلح گروہ ہوٹلوں اور باورچیوں کی دکانوں پر ہلہ بول دیتے اور روٹیاں اٹھا کر بھاگ جایا کرتے- تاریخ میں مشہور ہے کہ اس زمانے میں لندن پھانسیوں کا شہر کہلاتا تھا اور پادریوں کے احکامات حرف آخر ہوا کرتے تھے- ان مظالم سے تنگ آ کر کوئی شخص عیسائیت ترک کرنے کا خیال دل میں لاتا تو اسے اذیت ناک سزائیں دی جاتیں- اور نئے لوگوں کو عیسائی بنانے کا طریقہ دعوت و تبلیغ کی بجائے یہ تھا کہ "شارلیمان" نے جرمنی کے قبیلہ سیکسنز کے چار ہزار افراد کو پکڑ کر عیسائیت ان کے سامنے پیش کی- انہوں نے انکار کیا تو سب کو قتل کر دیا گیا- شاہ سپین فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا کی تحریک اصطباغ جسے انگریزی میں انکوی زیشن کہتے ہیں' بہت مشہور ہے- جس کے تحت سپین کے لاکھوں مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے لیے زندہ جلانے کی مہم چلائی گئی تھی-

الغرض مذہب کی تمام تر ڈور پاپائے روم کے ہاتھ میں تھی- ہر وہ عیسائی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے بالاتر ہو کر سوچتا' علمی کتابیں لکھتا' سائنسی نظریات پیش کرتا' ہر روز نہاتا یا کوئی بھی نیا کام کرتا تو اسے انکوی زیشن کی عدالت سزا دیتی پاپائے روم کی اس عدالت نے اپنے قیام کے پہلے سال دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا- اور دس برس میں ستر ہزار افراد کو آگ میں پھینکا فرانس کی مشہور زمانہ حریت پسند خاتون جون آف آرک بھی ۱۴۳۱ء میں اسی سزا کا شکار ہوئی اور مایہ ناز سائنس دان برونو اور گیلیلو بھی اسی عتاب کی بدولت ہلاک ہوئے-

پوپ کی ظالمانہ حکومت کے خلاف سب سے پہلی آواز برشیا (اٹلی) کے ایک پادری آرنلڈ

نے بلند کی- پوپ نے ۱۵۵۵ء میں اسے موت کی سزا دی- پھر پرگ (چیکوسلواکیا) کے دو مصلحین ہس اور جرسوم اسی جرم میں زندہ جلا دیے گئے ۱۴۹۸ء میں فلورنس کے ایک پادری ساور نرول کو اس جرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارا گیا- ان کی علم دشمنی کا یہ عالم تھا- کہ ساری عیسائی دنیا نے سترھویں صدی عیسویں تک مختلف مواقع پر لگ بھگ ساٹھ لاکھ کتابیں جلائیں اور اس سارے عرصے میں ۵۰۰ کتابوں کے قریب لکھیں- کتابیں جلانا علماء کو قتل کرنا' مدارس کا فقدان یہ ایسی باتیں ہیں جو چند سو سال پہلے تک ساری عیسائی دنیا کا خاصہ تھیں- جنسی لحاظ سے مذہبی دنیا کے عیسائیوں کی حالت شرمناک تھی- "نیرو" جو ایک مشہور عیسائی فرمانروا تھا...... نے اپنی ماں کے ساتھ جنسی فعل کیا اور پھر اسے قتل کر دیا- مذہبی پیشوا جو بظاہر مجرد زندگی گزارتے تھے حقیقت میں سفاک سدومیت پرست ہوتے تھے- عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز یعنی روم' جنسیت کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا- روم کے اکثر بادشاہ اداکاروں اور غلاموں سے سدومیت کروایا کرتے تھے- روم کے اولین پندرہ بادشاہوں میں سے چودہ ہم جنس پرست تھے- قرون وسطیٰ کے عیسائی سرتاسر شہوانیت میں غرق تھے- جنسی حوالے سے اہل کلیسا کی حالت آج بھی قابل رحم ہے-

"ٹائی بیریئس" نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوٹی دریائی مچھلیوں کا خطاب دیا- وہ دودھ پیتے بچوں سے اپنے عضو تناسل کو چسوایا کرتا تھا- یاد رہے کہ "ٹائی بیریئس" بھی ایک عیسائی فرمانروا تھا- موجودہ دور کے عیسائی پیشواؤں کی اکثریت آج بھی اسی اخلاقی انحطاط کا شکار ہے- بیسوی صدی کے آخری عشرہ میں امریکی شہر "نیو بیڈفال" میں ایک پادری نے عدالت کے روبرو اعتراف کیا کہ اس نے دوران ملازمت ایک سو بچوں کے ساتھ بدفعلی کی-

۱۹۸۰ء کی دہائی میں "بیری لینڈ" کے تین پادریوں نے معصوم بچوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا- "ویانا" آسٹریلیا کے سب سے بڑے مسیحی پیشوا "بشپ کارڈینل ہینس" کو ایک لڑکے سے بدفعلی کے الزام میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا- "اڈنبرا یونیورسٹی" میں نفسیات کے پروفیسر "کرس برائنڈ" نے انکشاف کیا کہ انہوں نے بچپن میں رقم کے لالچ میں آ کر بڑی عمر کے ایک شخص کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے-

۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکہ میں جنسی جرائم کی شرح ۸۰ فیصد تھی- ماہر عمرانیات "فادر اینڈریو" کا اندازہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخری بیس سالوں میں پچیس ہزار مذہبی پیشواؤں نے ایک لاکھ بچوں کو نشانہ بنایا-

اہل کلیسا کی اس جنسی روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالق نے انہیں ایڈز جیسی بیماریوں میں مبتلا کر دیا- ایڈز اس دور کی ایک ایسی موذی مرض ہے جس کا تاحال علاج دریافت نہیں ہو سکا- ایڈز کا وائرس ایچ' آئی' وی خون میں شامل ہو کر خون کے سفید ذرات (ڈبلیو بی سی wbc) کو تباہ کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اپنی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے- سفید ذرات کے خاتمے سے انسانی جسم کا مدافعتی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ایڈز کا وائرس جنسی بے راہ روی کی بدولت پھیلتا ہے- صرف ایڈز ہی پر کیا موقوف اہل یورپ کی جنسی بے راہ روی کے نتائج دنیا والوں کو ایڈز' کلامیڈیا' کنڈی لوما' ہیپاٹائٹس' شینکر رائیڈ' ایل جی وی' سوزاک اور آتشک جیسی بیماریوں کی صورت میں نظر آئے-

اسلام کو مذہب جنسیت کہنے والے عیسائی فی الحقیقت اپنی خفت مٹانا چاہتے ہیں- حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا نظام بگاڑنے میں جس قدر حصہ نام نہاد مسیحیت نے لیا' کسی اور قوم کو نصیب نہ ہوا- آج اہل یورپ اپنی اخلاقیات کو معیار مان کر اہل اسلام پر چڑھ دوڑے ہیں- جبکہ ان کی اخلاقیات اس وقت انسانی تاریخ اور روئے زمین کی بری ترین اخلاقیات یعنی ایتھکس ہیں- اس وقت امریکہ پوری دنیا کا نظام درست کرنے نکلا ہے- جبکہ اسی ملک کا ایک سابقہ حکمران "بل کلنٹن" بیسویں صدی کے اختتام میں دنیا کے بدنام ترین جنسی سکینڈل میں ملوث ہوا- ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ باشندگان زمین کو اس شیطانی اخلاقیات سے محفوظ رکھے-

قرآن محفوظ ہے

"عیسائیت" جو دنیا کا سب سے بڑا مذہب مانا جاتا ہے- اپنی اصل تعلیمات کو بھلا کر اور من گھڑت تبدیلیاں کر کے اس مقام تک پہنچی اور اہل زمین کو ہزاروں سال تک رنج والم سے دوچار رکھا تو اس میں اصل مذہب کا کیا قصور ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات بدل دی گئیں- یہی حال جیسا کہ ہم نے ذکر کیا...... دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب ہندومت' بدھ مت' یہودیت وغیرہ کا بھی ہو- اسلام میں اگرچہ شیطانی اذہان قرآن حکیم کو تو نہ بدل سکے البتہ احادیث میں وضعی روایات داخل کر کے اور من گھڑت قصے نبی کریمؐ اور صحابہ کے ساتھ منسوب کر کے عام عوامی ذہن کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے- اور نتیجتاً مسلمانوں کی بھی بالآخر وہی حالت ہوئی جو اصل تعلیمات کو بھلانے والوں کی ہوتی ہے- اسلام میں سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ ہوا جو زمین پر اللہ کی نیابت یعنی اللہ کی ملکیتوں کی امانت داری تھی اور ملوکیت انسانی کا آغاز ہوا- جونہی ملوکیت نے مسند حکومت کو فتح کیا اسلام جو ایک جدید نظام تھا' مذہب بن گیا اور کہانی پھر اسی طرح چلنے لگی جیسے دوسری مذاہب کی چلی تھی-

لیکن خوش قسمتی سے قرآن کا اصل متن محفوظ رہنے کی وجہ سے ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جو عقل کے ترازو پر ہر غیر اسلامی عمل کی حقیقت کو پرکھتے اور پھر اعلانیہ اس کا انکار

کرتے رہے۔ ایسے لوگوں میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا کردار اس قدر نمایاں رہا کہ ان کی محنتوں کا ثمر آج بھی موجود ہے...... یہی وجہ ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح مکمل طور پر داغدار نہ ہوسکا...... اسلامی حکومتوں نے بہر حال کوشش کی کہ کسی نہ کسی حد تک قرآنی احکامات کی پیروی ہوتی رہے...... اور یہ ان کی مجبوری تھی۔ کیونکہ قرآن...... عام مسلمان بلکہ عام انسان کی پہنچ میں تھا اور ہر انسان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ قرآن کو پڑھے' سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالق فطرت کی نازل کردہ اخلاقیات گویا ضابطۂ حیات انسانی آج تک موجود ہے اور اس کو اپنا کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ...... آیا فطرت میں اخلاقیات کا کوئی حصہ ہے بھی سہی یا اخلاقیات آدرش' اصول اور یہ سب چیزیں محض فریب اور ناممکن العمل فلسفے ہیں۔

انسانی فطرت کے دو اجزاء

اخلاقیات یا آتھکس ناممکن العمل نہیں ہیں۔ بظاہر یہ سب کچھ ناممکن اور خالی خولی فلسفہ نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مذہبی اخلاقیات ہوں یا مفکرین کی کاوشیں موجودہ زمانہ کے مادہ پرست انسانوں کو بوجھل اور تکلیف دہ کیوں محسوس ہوتی ہیں؟ موجودہ زمانہ کا انسان ہو یا ماضی کا انسان بنیادی طور پر سب اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ انسان کی فطرت' محض حیوانی فطرت کے مماثل ہے۔ حیوان کھاتے' پیتے' سوتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ لہٰذا دونوں کی فطرت ایک جیسی ہوئی اور دونوں کی بنیادی ضروریات بھی ایک جیسی ہی ہوں گی۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے دراصل انسانی فطرت کے دو اجزاء ہیں ایک اس کا جسم ہے اور دوسری اس کی ذات جبکہ حیوانوں کے لئے ان کا جسم ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کے دوسرے جزو یعنی ذات کی موجودگی سے انکار کرنے والوں کو اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ ہمدردی' ایثار' قربانی' غمخواری' مروت اور احسان مندی کیا ہیں؟ کیا یہ اعمال انسان سے فطری طور پر خود بخود سرزد نہیں ہوتے؟ کیا ایک انسان کو تکلیف میں دیکھ کر دوسرے انسان کا دل نہیں دکھتا...... انسان غم میں روتا ہے' خوشی میں ہنستا ہے' دوسروں کے درد کو محسوس کرتا ہے' قربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ سب کچھ حیوانی فطرت کے تحت ہوتا ہے؟ نہیں' یہ انسان کی انسانی فطرت ہے جو اسے حیوانات سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔ یہی فطرت کے دو اجزاء ہیں الگ الگ اور جدا جدا۔ ایک جسمانی اور دوسرا روحانی یا نورانی۔ جسمانی تقاضے عام طبعی اصولوں کے تحت ہوتے ہیں بعینہ دوسرے حیوانات کی طرح جبکہ انسان کی ذات یا روحانیت حیوانی غذا سے پرورش نہیں پاتی بلکہ اس کے بالکل برعکس اس کی ایک الگ غذاء ہے۔

مثال کے طور پر روٹی کھانے سے انسانی جسم کو نشوونما ملتی ہے لیکن اس کے برعکس کسی بھوکے کو روٹی کھلانے سے روح کو طاقت ملتی ہے' بس یہی وہ دوسرا ''جزو'' ہے۔

جو اہل دانش کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اس کے اب تک پوشیدہ رہنے کی معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ انسان بنیادی طور پر مفاد پرست ہے اور شروع سے لے کر آج تک اسے صرف ظاہری مفادات ہی نظر آئے ہیں۔ ہم اپنی بات کو مزید وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک محاورہ مشہور ہے۔ مال صدقہ جان اور جان صدقہ آبرو۔ مال صدقہ جان فطرت کے پہلے جزو اور جان صدقہ آبرو انسانی فطرت کے دوسرے جزو کی تشریح ہے۔ یعنی جب کسی انسان کے سامنے مال اور جان کے بقاء کا مسئلہ بیک وقت درپیش ہو...... تو اسے اپنی جان کے لیے مال کو قربان کر دینا چاہیے۔ اور ہوتا بھی اکثر یوں ہی ہے کہ انسان ہوں یا جانور' جب انہیں جان کے لالے پڑتے ہیں تو اپنی جان کو بچانے کے لیے مال کی قربانی دے دیتے ہیں۔

اور جب کوئی شخص اپنے مال کے مقابلہ میں جان کو بچا لیتا ہے تو اسے کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ جان ہر کسی کو عزیز ہے اور ایک ننھی سی چڑیا بھی اپنی جان بچانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس ''آبرو'' کا تصور صرف روح یا ذات کو ماننے والوں میں پایا جاتا ہے۔ حیوانات میں آبرو بچانے کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آبرو کیوں بچائی جائے؟ آبرو کو بچانا کیوں ضروری ہے...... کیا انسان ''آبرو'' اور اخلاقیات کے جھنجھٹ سے دور رہ کر خوش نہیں رہ سکتا۔ محنت کرے کمائے' کھائے اور بچے پیدا کرے۔ اسے اخلاقیات کی کیا ضرورت ہے؟ جب ''اخلاقیات'' اس کی فطرت کا تقاضا ہی نہیں...... تو پھر کیا ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاقی بندھنوں کا پابند کرے اور خود پر جبر کر کے اپنی زندگی کو تکلیف دہ بنا لے۔

ایمان کی ضرورت

لیکن ان سوالات کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں کہ انسانی فطرت کے دو ''اجزاء'' ہیں ایک جسمانی فطرت اور دوسرا روحانی فطرت...... جبکہ جانوروں میں صرف حیوانی فطرت ہی ہوتی ہے ہم نے یہاں ایک اصطلاح استعمال کرنے کی جرات کی ہے۔ ''روحانی فطرت''...... اسی کو اہل مذہب ''ایمان'' کہتے ہیں۔ لیکن اہل مذہب کا نقطۂ نظر حقیقت سے ہمیشہ دور رہا ہے۔

ان کے نزدیک ایمان ان باتوں کو ماننے کا نام ہے۔ جن پر عمل کرنے سے دنیا میں تو کوئی فائدہ نہیں ملتا البتہ آخرت میں جنت ملتی ہے اس کے برعکس ''روحانی فطرت'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے لامحالہ ذہن اس فطرت کے تقاضوں اور اس کے اعمال کی طرف چلا جاتا ہے۔ دراصل جسم تو

سب کو نظر آتا ہے۔ لہٰذا عام حیوانی تقاضے اور ضرورتوں کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن روح کسی کو نظر نہیں آتی لہٰذا روحانی ضرورتوں اور تقاضوں کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ مذاہب نے اپنے تئیں روح کو سمجھانے کی بے شمار کوششیں کی ہیں جزا و سزا کا تصور دیا ہے۔ جنت دوزخ سے ڈرایا ہے...... نصیحتیں کی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز بتائی ہے لیکن کوئی انسان بھی دل سے مذہبی اخلاقیات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کیوں؟ آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ انسان کو اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ اہل زمین سے آنے والے دنوں میں بھی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ انسان کا ماضی ہزار مصلحین، مبلغین اور انبیاءؑ کے باوجود قتل و غارت اور فساد سے پر ہے۔ موجودہ صدی میں جدید افکار کے مالک لوگوں کو تو عیسیٰؑ اور مہدی کی آمد کا انتظار بھی نہیں رہا۔ لوگ اپنے ماحول پر غور کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے ماضی پر تو انہیں ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دن بھی بہتر نہیں ہوں گے۔ لیکن آنے والے دنوں کی بہتری کا یقین بے حد ضروری ہے اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ انسان کا جس دن اس بات پر ایمان کامل ہو گیا کہ دنیا کی زندگی بے نتیجہ نہیں اور آخر ایک دن زمین پر اللہ کا نظام قائم ہونا ہے۔ اس دن انسان فی الفور روحانی فطرت کی نشو و نما کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ قرآن خود پر ایمان لانے کی دعوت دینے سے پہلے ہمیشہ تاریخ اور آفاق سے ناقابل تردید مثالیں پیش کرتا ہے اور پھر انفس کی دنیا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔

دراصل دنیا کی موجودہ آبادی مذہبی پیشواؤں کی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ لوگ دل سے نہیں مانتے کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے دوسرے الفاظ میں پوری دنیا کا اس وقت مذہب سے ایمان اٹھ چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دنیا میں جنگ و جدل نہ ہو۔ اور انسان آرام سے رہیں۔ اب ایسے عالم میں وہ کہاں جائیں؟ کہ جب وہ اچھائی کے خواہش مند بھی ہیں اور مذہب میں بھی ایمان کی دولت سے محروم ہیں۔ ہاں! البتہ مذہبی پیشواؤں کی بات کے مقابلے میں معاشرتی سائنس کے ماہرین کی رائے پھر بھی توجہ سے سنتے ہیں۔ دراصل سماجی سائنس کے ماہرین لوگوں کو ان کے ماحول میں سے مثالیں دے کر حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انسانی عقل تو ویسے بھی ''محسوس'' کی خوگر رہی ہے۔ ہم نے گزشتہ ابواب میں ڈاکٹر انون کی کتاب ''سیکس اینڈ کلچر'' کا حوالہ دیا ہے۔

سیکس اینڈ کلچر

ڈاکٹر انون کی کتاب سیکس اینڈ کلچر جدید دور کے ماہرین جنسیات میں اتھارٹی سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جے ڈی انون کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے دنیا کے مختلف حصوں سے بسنے والے ۸۰ غیر مہذب قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں شہوانیت اور سماج کا کیا تعلق ہے۔ ڈاکٹر انون کی کتاب سیکس انڈ کلچر کے چند اقتباسات ہمارے موضوع کی اور موقف کی تائید کے لیے کسی بیش بہا خزانے کی مانند ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔'' (صفحہ نمبر ۱۴)

''کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے روابط قائم رکھے تھے۔'' (صفحہ نمبر ۳۴۰)

''اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔'' (صفحہ نمبر ۳۰۲)

''جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد یعنی تقریباً سو سال میں نمودار ہوتے ہیں۔'' (صفحہ نمبر ۳۳۰)

ڈاکٹر انون انسانی تمدن کے تین درجے بیان کرتا ہے۔

(۱) پست ترین درجہ (۲) درمیانی درجہ (۳) بلند ترین درجہ

ڈاکٹر انون کے بقول

''جس گروہ نے شادی سے پہلے جنسی تعلقات کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہو۔ وہ تمدن کی پست ترین سطح پر ہوتا ہے۔ جو گروہ شادی سے پہلے تھوڑی بہت پابندیوں کا قائل ہو درمیانی سطح پر اور جو گروہ شادی سے پہلے عفت بکارت کا تقاضا کرے وہ تمدن کی بلند ترین سطح پر ہوتا ہے۔'' (صفحہ ۳۰۰ تا ۳۲۵)

ڈاکٹر انون جنسی تعلقات پر حد بندی کا قائل ہے۔

''جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز آ جاتا ہے۔'' (صفحہ ۳۱۳)

''نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔'' (صفحہ نمبر ۳۱۷)

"جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں- چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا- وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے- نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی باقی نہ رہی-" (صفحہ نمبر ۳۹۸)

"مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے- جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے-" (۳۲۳)

"انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی بلندی تک پہنچ گئی ہو- جس کی لڑکیوں کی پرورش "مطلق وحدت زوج کی روایات میں نہ ہوئی ہو- نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط کی حدود و قیود ڈھیلی پڑ گئی ہوں- اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو- جب شادی عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور دونوں فریقین ایک دوسرے سے ہٹ کر کسی تیسرے کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں- تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں-" (صفحہ نمبر ۸۴)

"لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی فائدہ اٹھاتی رہے- جو ایک بلند تمدن کا انعام ہیں- لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں- یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں یعنی ضد- جو دانشور ان میں مفاہمت کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے- کوئی انسانی معاشرہ ہو اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی- یا تو ان صلاحیتوں کو زندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ- تاریخ شاہد ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے- وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی-" (صفحہ نمبر ۴۱۲)

"کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں- جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں- اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو آگے بڑھائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی-" (صفحہ نمبر ۴۱۴)

"جس معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع کم سے کم ہوں- اس معاشرے کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جاتا ہے- اس کی روایات...... شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوتی ہیں- وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند ترین مقام تک پہنچ جاتا ہے- جو اس وقت ہمارے ادراک میں بھی نہیں آ سکتا-" (صفحہ نمبر ۴۳۲)

نظریہء عفت

ڈاکٹر انون نے جو کچھ کہا یہ اس کے گہرے مطالعے اور تجربات کا نتیجہ تھا- گویا ڈاکٹر انون اسلام کے "نظریہ عفت" کا مبلغ تھا- پاکستان کے عظیم ادیب، صوفی اور دانشور قدرت اللہ شہاب کے الفاظ اس طرح ہیں-

"روحانی سطح پر قوائے نفسانیہ کے معتدل، متوسط اور متوازن ہونے کا نام حسن الخلق ہے- یعنی خوب سیرتی- روح کی باطنی ترکیب جن قوتوں اور کیفیتوں سے قائم ہوتی ہے- ان میں چار قوتیں بنیادی درجہ رکھتی ہیں-

(۱) قوت علم (۲) قوت غضبیہ (۳) قوت شہوت اور (۴) قوت عقل

قوت غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے جس کا ثمرہ سخاوت، ہمت و دلیری، بردباری، استقلال، صبر و رضا، نرمی اور ملائمت اور غصہ کے ضبط کرنے کی طاقت ہے- قوت غضبیہ حد سے بڑھ جائے تو اس کی بدولت شیخی مارنا، بھڑک اٹھنا، انجام نہ سوچ کر ندامت اٹھانا، تکبر کرنا، خود پسندی اور اپنے کو اچھا سمجھنا پیدا ہوتا ہے- قوت غضبیہ حد اعتدال سے گھٹتی ہے تو اس کا نام "جبن" ہے- جس کی بدولت بے غیرتی اور کاہلی، کم ہمتی، چھچھورہ پن، بزدلی، ذلت اور رسوائی کو گوارا کرنا لاحق ہوتا ہے-

قوت شہوت کے اعتدال کا نام عفت ہے- جس کے ثمرات حیاء و پارسائی، رضا اور قناعت، خوف خدا اور مخلوق کے ساتھ احسان و سلوک ہیں- جب قوت شہوانیہ اعتدال چھوڑ کر کم یا زیادہ ہوتی ہے تو حرص و لالچ، خوشامد اور چاپلوسی، عاجز مخلوق پر رعب اور دبدبہ ڈالنا، غرباء کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، بے حیائی، فضول خرچی، ریا فریب، تنگ دلی، حسد، کینہ اور بغض و عناد جیسی بری خصلتیں ظاہر ہوتی (۱۲۲) ہیں-" (صفحہ ۱۲۱۴ تا ۱۲۱۶)

ڈاکٹر انون مغرب کا مایہ ناز مفکر ہے- اور قدرت اللہ شہاب مشرق کے نامور ادیب دونوں دانشور نظریہء عفت کے قائل ہیں- اور نظریہء عفت خالص قرآنی نظریہ ہے-

نیچر کے لیے موزوں ترین آتھکس (اخلاقیات)

نیچر کے لیے موزوں ترین آتھکس اسلامی اخلاقیات ہیں- اور اسلامی اخلاقیات کو ہی نظریہء عفت کہا جاتا ہے- اسلام کا نظریہء عفت ایسا مکمل اور متوازن ہے کہ نہ تو اس کا تصادم کسی بھی موڑ پر نیچر سے ہوتا ہے- اور نہ ہی یہ قوت شہوت کو حد اعتدال سے آگے نکلنے دیتا ہے- اسلام نے عورت کو مرد کا لباس کہا ہے اور مرد کو عورت کا...... قرآن میں وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں حافظین فروجھم اور وہ عورتیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہوں- حافظات کہلاتی ہیں- قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی جائز صورت نکاح ہے- نکاح ہنگامی جنسی اختلاط کی رضا مندی کا اجازت نامہ نہیں- بلکہ معاہدہ ہے اس امر کا کہ میاں بیوی ان تمام حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ان پر قرآن نے عائد کیے ہیں- مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے- اس طرح کے تعلق کے بعد میاں اور بیوی کا جنسی اختلاط ایک عظیم انسانی کارنامہ بلکہ کار ثواب بن جاتا ہے- اس کے علاوہ جنسی اختلاط کا کوئی بھی دوسرا راستہ اسلامی زبان میں زناء کہلاتا ہے- قرآن نے نکاح کو میثاقاً غلیظا کہا ہے- جس کا مطلب ہے پختہ عہد گویا شادی بچوں کا کھیل نہیں کہ جب چاہا مٹی کا گھروندہ بنالیا اور جب چاہا توڑ دیا- قرآن نے حیاداری کو بہت بڑی دولت کہا ہے- نکاح کا پختہ عہد جو دو حیادار انسانوں کے درمیان ہوا- دراصل معاشرے کی ایک اکائی اور قوم کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے- میاں بیوی کے وقت مجامعت اور انزال کی دعا کتب احادیث میں یوں درج ہے-

(۱) بسم الله اللهم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان مارزقتنا

ترجمہ: بنام اللہ، اے اللہ! تو ہم (دونوں) کو شیطان سے بچا اور جو اولاد تو ہم کو عطا فرمائے اس کو بھی شیطان سے بچانا-

(۲) اللهم لاتجعل للشیطان فیما رزقتنی نصیباً-

ترجمہ: اے اللہ! جو اولاد تو مجھے عطا فرمائے اس میں شیطان کا کوئی حصہ (عمل دخل) نہ رکھنا-

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے بعض اہل دانش کا خیال ہے کہ جنسی جذبہ فطری جذبہ نہیں- ان کے بقول......

"جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ آپ اس کا خیال نہ کریں اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر آپ کے خیالات سے وابستہ ہے- اگر آپ کا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا- دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی

جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہوتی (۱۲۳)

لیکن مذکورہ بالا بیان علوم فطرت پر گہری نظر نہ ہونے کی وجہ سے معرض تحریر میں آیا- جنسی تقاضا صرف وقت اختلاط کا نام نہیں- وقت اختلاط تو اس تقاضا کا آخری مقام ہے- جنسی تسکین حاصل کرنے کے جو دیگر ذرائع اور طریقے انسانی شعور نے دریافت کر لیے ہیں- وہ اس فطری جذبہ کی تسکین کے لیے کافی وشافی ہیں- یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جیتا جاگتا انسان اپنے ذہن میں جنسی تقاضا نہ ابھرنے دے کیونکہ جنسی تقاضا کے ابھرنے کے لیے سوسائٹی میں قدم قدم پر بڑی زور دار تحریکیں موجود ہیں- یہ تو ٹھیک ہے کہ خیال پر کنٹرول کرنے والا جنسی اختلاط سے زیادہ سے زیادہ دیر کے لیے بچا رہے گا- لیکن جنسی اختلاط کے علاوہ جنسی تسکین حاصل کرنے کے یا بالفاظ دیگر کتھارسس کے دوسرے مواقع سے کس طرح بچے گا- وہ نوجوان جو محض جنس مخالف کے تصور سے بچنا چاہتا ہے- اس راہب سے مختلف نہیں جو جنسی خیالات کو ثواب کی خاطر جھٹک دیتا ہے- اس کے من میں جنسی خیالات اپنے بھیس بدل بدل کر داخل ہوتے ہیں اور اس کی آتش شوق کو نت نئے انداز میں ہوا دیتے رہتے ہیں- ہاں! البتہ ہمارے اہل دانش کی یہ بات ضرور درست ہے کہ جنسی قوت کا رخ تبدیل کر دینے سے خوابیدہ صلاحیتیں نکھرتی ہیں- یہ گویا روزہ رکھنے والی بات ہوئی اور خصوصاً جنسی روزہ زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے- ہمارا یہ خیال ہے کہ جنسی ضبط نفس ہر انسان کے بس کی بات نہیں- بہت کم لوگ ہیں جو اس بدنی مجاہدہ میں کامیاب ہوتے ہیں- تو پھر ایسی نصیحت جس پر اجتماع کا عمل ممکن نہ ہو بے معنی یا رائیگاں سمجھی جائے گی- لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ منفی جذبہء شہوت پر تو پابندی گوارا کر لی جائے لیکن مثبت فطری جذبوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے- چنانچہ اگر فرائڈ کی بات درست ہے کہ بہن بھائی، باپ بیٹی، یا ماں اور بیٹے کے مابین بنیادی طور پر جذبہء جنس کارفرما ہے- تو جذبہء جنس کی یہ کارفرمائی ایک عام انسان کے لیے چنداں بری نہیں- بشرطیکہ رشتوں کا تقدس برقرار رہے-

صراط مستقیم

اس کتاب میں ہمارے پیش نظر تھا کہ ہم انسان کی قوت جنسیہ کا ہر طرح سے جائزہ لیں- اور ہم نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے تاریخ، سائنس، فلسفہ، نفسیات، حیاتیات اور عمرانیات کی رو سے جنسیات کے مسئلہ کو سمجھنے کی بزعم خود کوشش کی- ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ انسانی ذات شدت سے اثر انداز ہونے والے اس جذبے کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے- تاکہ انسان کے نہ ختم ہونے والے طویل مصائب کے اسباب معلوم کیے جا سکیں- ہم ایک محتاط تحقیق کے بعد بالآخر اس

نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کا یہ فطری جذبہ مدت ہوئی اپنی حدود حقیقی سے تجاوز کر چکا ہے اور اب اس کا یہ تجاوز انسانی فطرت کا حصہ بن چکا ہے- لہٰذا جب تک انسان کے دماغ سے غیر قدرتی سیکس کا خناس نہیں نکل جاتا اس کی فلاح ممکن نہیں-

ہم نے دیکھا ہے کہ دنیا بھر کے مفکرین انسان کے لیے بہتر نظام زندگی کے خواہشمند ہیں- اور انہوں نے اپنے تئیں انسانوں کے شانت رہنے کی بسیار کوشش کی ہے- بڑے بڑے نظامات وضع کیے ہیں اور لمبے چوڑے افکار پیش کیے ہیں- لیکن کوئی بھی نظام آج تک انسانیت کی ڈولتی ہوئی ناؤ کو سہارا نہیں دے سکا-

انسان کی یہ ڈولتی ہوئی ناؤ جو درحقیقت جذبۂ جنس کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت کی وجہ سے ہچکولے کھا رہی ہے صرف اور صرف قرآنی افکار کے چپوؤں کی مدد سے ساحل مراد تک لائی جا سکتی ہے- کیونکہ انسان نے جب بھی مصیبت میں پھنس کر قرآن کو پکارا ہے-

اھدنا الصراط المستقیم...... ہمیں سیدھا راستہ دکھا-

تو ہمیشہ قرآن کی طرف سے جواب آیا ہے-

ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی اللمتقین

ترجمہ: یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں جو (ہدایت کے طلبگاروں) متقیوں کے لیے ہدایت ہے-

قرآن حکیم کی لازوال تعلیم فکر انسانی کے لیے نور خورشید سے کم نہیں- لیکن صد افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو محض ایک مقدس کتاب کا درجہ دے کر ہزار غلافوں میں چھپا رکھا ہے- علامہ اقبالؒ کے بقول-

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

ہم نے قران حکیم کو ترک کیا- چنانچہ پوری دنیا میں ذلت و خواری ہمارا مقدر بن گئی- آج سارے عالم میں چرچا ہے کہ ''مسلمان گئے''- اہل یورپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر کی خاک تک ہر طرف مسلمان رسواء ہو رہے ہیں- اسلام انسانیت کی بہتری کا...... اکلوتا سہارا ہے- لیکن اسے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت قتل و خون ریزی، دہشت گردی اور جنسیت پرستی کا...... مذہب قرار دے دیا گیا- یہ درحقیقت اہل زمین کی بہت بڑی بدنصیبی ہے- انسان نظام جمہوریت کو آزما چکا ہے- کیمونزم کو لینن کے ساتھ ہی دفن کر چکا ہے- امپیریل ازم کے تجربے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے- نظام سرمایہ داری کے مظالم سہہ چکا ہے- لیکن افسوس اسلام کو بطور نظام آزمانے سے ابھی تک محروم ہے- انسان اسلام کی برکتوں سے ابھی بہت دور ہے- افسوس کہ

وہ اس نظام حیات کو صرف مذہب سمجھتا ہے- بالکل ویسا مذہب جیسا عیسائیت، جیسا یہودیت، جیسا ہندوازم، اور جیسا بدھ مت کو...... انسان بدبخت ہے اور بدنصیب بھی کہ اسلام سے دور ہے- اہل یورپ کو بھول ہے کہ وہ کبھی انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر سکیں گے- ان کے پاس انسانیت کے لیے وہ سسٹم ہی نہیں جو اہل زمین کی پر مشقت زندگی کا سہارا ہے- قرآن حکیم میں محفوظ قوانین ابد الآباد تک ہر دور کے انسانوں کے لیے بطور ایک سسٹم کافی و شافی ہیں- بڑے بڑے ذہین اور نامور لوگ قرآن کی اس حقانیت کا اعتراف کر چکے ہیں- ایک یورپین مفکر مورلیس بکا یئے قرآن بائبل اور سائنس لکھ کر یہ ثابت کر چکا ہے کہ قرآن بائبل کی طرح غیر عقلی حکایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جدید ترین نظام زندگی ہے- اسلام سے پہلے افلاطون کی عقلیت پسندی کا چرچہ تھا- لیکن یونان کا وہ بے اولاد فلسفہ انسان کی عملی قوتوں کو تقریباً چاٹ چکا تھا- قرآن نے ''**سیروفی الارض**'' کی دعوت دے کر انسان کو عقلیت پسندی کے ساتھ ساتھ عملیت پسندی کی طرف مائل کیا ہے- اہل یورپ اسلامی تاریخ کو قرآن یا مسلمانوں کی تاریخ نہیں لکھتے بلکہ عربوں کی تاریخ کہہ کر پکارتے ہیں- حالانکہ سب جانتے ہیں کہ عربوں کے پاس کیا تھا- وحشت، بربریت اور جہالت کے سوا حجاز کے ریگستانوں میں کچھ نہیں اُگتا تھا- اسلام کا ظہور مکے کی گمنام بستی میں اس وقت ہوا جب زمین پر انسان زندگی مفلوج ہو چکی تھی- ایسے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی عظیم تہذیب مسلمانوں کا کرشمہ نہیں بلکہ عربوں کا تحفہ ہے-

مغربی مفکرین اپنے آپ کو جس قدر بھی فراغ دل پوز کریں- ان کے لب و لہجے میں تعصب، کینہ پروری اور تنگ نظری ہمیشہ صاف جھلکتی ہے- برصغیر میں آنے سے پہلے برطانیہ دنیا کا غلیظ ترین ملک تھا- اسی طرح سقوط غرناطہ سے پہلے پورا یورپ اپنی تاریخ کے سیاہ ترین دور سے گزر رہا تھا- یہ مسلمان ہی تھے- جن کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اہل مغرب کے لیے جنت کی غذا بن گئیں- لیکن یہاں آ کر ایک سوال ہر سوچنے والے کو پریشان کرتا ہے کہ اسلام کی حقانیت اور قرآن حکیم کی تعلیم اہل زمین میں رائج اور راسخ کیوں نہ ہو سکی- اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام بطور ایک نظام حیات کے دنیا والوں کے سامنے ماسوائے ادوار رسولؐ کے کبھی پیش ہی نہیں کیا گیا- آمد اسلام سے قبل ہی ابلیس کے بہت سے سپاہی اس کے خلاف گھات لگا چکے تھے- خلفاء بنوامیہ کا دور شروع ہوتے ہی بہت سے فرزندان ابلیس عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے صرف ایک مذہب ہونے کا تصور اتارنا شروع ہو گئے- گویا اسلامی نظام کی برکتوں سے اہل زمین ابھی شعوری طور پر واقف ہی نہ ہونے پائے تھے کہ یہ دین حق عیسائیوں کے مذہب کی طرح محض ایک مذہب ہی کی حیثیت سے متعارف کروا دیا گیا- لیکن بخدا...... اگر قرآن حکیم محفوظ نہ رہتا تو یقیناً اسے ماضی کے

تحریف شدہ مذاہب کی طرح ایک چلا ہوا کارتوس کہہ کر پھینک دیا جانا ہی بہتر تھا- لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ قرآن محفوظ رہے گا- سو وہ محفوظ رہا چنانچہ اب دنیا کے ارباب دانش کو مذاہب سے تعصب کی عینک اتار کر اسلام کو ایک نئ نظر سے دیکھنا ہوگا- لیکن دنیا کے ارباب دانش اسی وقت ایسا کر سکتے ہیں جب اسلام کو پیش کرنے والے اس کے محض ایک مذہب ہونے کی بجائے ایک معاشرتی نظام ہونے کا سبق عام کریں- اب تک آنے والے انسانوں میں بہت سے ہمدردان انسانیت ایسے ہیں جنہیں بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے- ایسے لوگ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئے اور غیر مسلموں میں بھی لیکن پچھلی صدی میں علامہ اقبالؒ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے جو انسان اہل زمین کو عطا فرمایا وہ شاید آنے والے انسان کی قسمت کا روشن ستارہ ثابت ہوگا- کیونکہ علامہ اقبالؒ نے انسانیت پر یہ احسان کیا ہے کہ پورے زور و شور کے ساتھ اور جدید لہجے میں اسلام کی نئ تصویر دنیا کے سامنے پیش کی ہے- نئ تصویر سے میرا مطلب ہے وہ حقیقی تصویر جو قرآن کی صورت میں نبی کریمؐ کے قلب اطہر پر اتری تھی- علامہ اقبالؒ کی فکر نے ملت اسلامیہ کو نشاۃ ثانیہ کی نوید سنائی ہے- جس کے نتیجے میں یورپ کے ہاتھوں قدم قدم پر خفت اٹھانے والا' احساس کمتری کا مارا ہوا مسلمان پھر سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس نہیں بلکہ امید کا ابھرتا ہوا سورج ہے- اسی فکر کے نتیجے میں زمین کے سینے پر پاکستان جیسی مکمل مسلمان ریاست وجود میں آئی ہے- اسی فکر کے نتیجے میں کوہ ہندوکش کی گود سے طالبان کی تحریک خلافت اٹھی تھی جس نے ایک آبگینے کی طرح مختصر وقت کے لیے نمودار ہو کر سارے عالم کو حسن اعتدال' توازن اور مرکزیت کا ایک ایسا نمونہ دکھایا ہے- جو سچے دانشوروں کے سامنے حقیقی اسلام کی تصویر دکھانے کے لیے کافی ہے- اگرچہ طالبان مہمانوں کی طرح آئے اور مہمانوں کی طرح چلے گئے- لیکن وہ چھ سال کے قلیل عرصے میں دنیا والوں کو بتا گئے کہ انسانیت کا اصل مسئلہ معاش نہیں بلکہ مرکزیت ہے- ہم طالبان کی چند سختیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی جرأت و بہادری اور حق گوئی کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں-

اس وقت مغرب اور اسلام آمنے سامنے ہیں- یہ ہتھیاروں کی جنگ کا زمانہ نہیں سیٹلائیٹ کا دور ہے- تنگ نظر مغربی حکمران اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ جیت چکے ہیں اور اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عام مسلمان اپنے پروردگار سے مایوس ہو کر امریکہ کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں-

سچ تو یہ ہے کہ اب بھی اگر ہمارے علماء دین کو یورپ کی سائنسی سوچ کے ساتھ ہر محاذ پر مقابلہ کرنے کا خیال نہ آیا- تو پھر یقیناً دست ایزدی قرآن کی دولت ہمارے دامنوں سے اٹھا کر کسی اور کے دامن میں ڈال دے گا- وقت گزرتا جا رہا ہے اور ہم ابھی پہلا قدم بھی نہیں اٹھا پائے-

اختتامیہ

میں نے اپنی گزارشات مکمل کر لیں- اگرچہ ابھی بھی بہت سے موضوعات تشنۂ تکمیل ہیں-
پھر بھی مجھے توقع ہے کہ میری یہ عاجزانہ سی کاوش رائیگاں نہیں جائے گی- میرے پیش نظر
ئے الٰہی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں- آخر میں میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ کسی
قطہ پر میری رہنمائی فرمانا چاہیں تو میں ان کا بے حد ممنون ہوں گا-

دعا گو
ادریس آزاد
پوسٹ بکس نمبر 1064
اسلام آباد

حوالہ جات وحواشی

۱- شہاب نامہ صفحہ ۵۵۳

۲- بحوالہ طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۷ء

۳- بحوالہ امپکٹ انٹرنیشنل لندن مارچ ۲۰۰۱ء

۴- ایضاً

۵- ایضاً

۶- طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۷ء

۷- شہوانیت سے الوہیت تک' گرور جنیش

۸- بحوالہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

۹- ''معرکہ مذہب وسائنس'' از ڈاکٹر ڈریپر ترجمہ مولانا ظفر علی خان

۱۰- کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

۱۱- سائنس دانوں کے بقول کائنات کی ابتداء Big Bang سے ہوئی-

۱۲- سائنسی نقطہ نظر کہ تمام سیارے سورج سے الگ ہوئے-

۱۳- سائنس کے بقول ابتدائی چھ مرکبات میتھین امونیا وغیرہ بادلوں میں تیار ہوئے-

۱۴- سائنس دانوں کے بقول ابتدائے آفرینش میں زمین پر لاکھوں سال بارش ہوتی رہی-

۱۵- واذ قلنا للملئكة انی جاعل فی الارض خليفه o

۱۶- وخلق كل شيء من ماء

۱۷- قالوا اتجعل فيها

۱۸- الله نور السموات والارض

۱۹- نحن نسبح بحمدک ونقدس

۲۰- خلقكم من طين' خلقكم من ماء

۲۱- زندگی کا ابتدائی خلیہ

۲۲- انسانی پیکر اپنا کر

۲۳- خشکی پر زندگی کی نمود

۲۴- وقد خلقكم اطواراً

۲۵- نظریہ ارتقاء کے مطابق انسان کی ارتقائی منازل

۲۶- واذ قلنا للملئكة السجدو لآدم

۲۷- ولا تقر باهٰذه الشجرة

۲۸- باب پیدائش

۲۹- وهو الذى خلق من الماء بشراً

۳۰- هو الذى خلقكم من طين

۳۱- وقد خلقكم اطوارا لتركبن طبقاً عن طبق

۳۲- سللة من طين

۳۳- ڈھانچے' کھوپڑیاں یا برف میں دب کر مرنے والے انسانوں کے مکمل بدن

۳۴- احادیث میں ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر جنات بستے تھے-

۳۵- لقد خلقنا الانسان فی احسن تقويم .

۳۶- خلق فسوىٰ والذى قدر فهدىٰ

۳۷- واوحىٰ ربک الى النحل

۳۸- فالهمها فجورها وتقواها

۳۹- واذ قلنا للملئکة اسجدوا
۴۰- قرآن کی زبان میں سمع' بصر' فواد
۴۱- ایضاً
۴۲- ایضاً
۴۳- فاانفخ فیه
۴۴- نحن نسبح بحمدک
۴۵- وسخرلکم ما فی السموٰت والارض
۴۶- وحملها الانسان ......
۴۷- وعملو الصلحٰت
۴۸- الا ابلیس ابیٰ وستکبر
۴۹- آیت قرآنی
۵۰- الذی یوسوس فی صعور الناس
۵۱- انسان کو بہشت میں بالآخر دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ (الحدیث)
۵۲- حدیث میں ہے کہ انسان جنت میں اللہ کا دیدار کرے گا۔
۵۳- خطبات اقبالؒ
۵۴- هن لباس الکم
۵۵- نساؤکم حرثلکم
۵۶- وانزل الملکین ببابل هاروت و ماروت
۵۷- عہد نامہ قدیم' کتاب یرمیاہ باب ۵۱' نشان نمبر ۷
۵۸- ہیروڈوٹس
۵۹ کتاب یرمیاہ
۶۰- حضرت سلیمان علیہ السلام کی "غزل الغزلات" باب ۷ نشان ۱ تا ۶ (عہد نامہ قدیم)
۶۱- تاریخ بابل ضمیات بابل
۶۲- مشہور انگریز سیاح مسٹر رج
۶۳- تاریخ بابل وضمیات بابل
۶۴- ہیرلڈم
۶۵- بحوالہ ہیرلڈم
۶۶- بحوالہ ہیرلڈم اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا
۶۷- عہد نامہ قدیم کتاب یسیعاہ
۶۸- شہوانیت سے الوہیت تک از گرور جنیش
۶۹- عہد نامہ قدیم باب یرمیاہ نشان ۷ باب ۵
۷۰- قدیم تاریخ ضمیات
۷۱- ہسٹری آف سیریا
۷۲- ولکنس اور ڈونلڈ مکنزی
۷۳- پروفیسر جارج ایبرس
۷۴- طوالت کے پیش نظر ان علاقوں کے جنسی عقائد کی تفصیل درج نہیں کی جاتی
۷۵- ایضاً
۷۶- راماین' ہندوؤں کی کلاسیکل ڈکشنری
۷۷- ڈیتھ آف بدھا' سیکریٹس آف بدھا
۷۸- ضمیات یونان' از پروفیسر ہیلڈے
۷۹- پولس رسول کا خط رومیوں کے نام
۸۰- Patterns of Culture by Ruthbenedict
۸۱- هن لباس لکم وانتم لباس الهن
۸۲- آیت قرآنی
۸۳- وغرهم فی دینهم ما کانوا یفترون
۸۴- اس زمانہ میں برقعہ اوڑھنے یا چہرہ ڈھانکنے والی کسبیاں (جسم فروش

عورتیں) ہوتی تھیں۔

۸۵- Sex and Culture

۸۶- بغداد از محمد سعید مطبوعہ مکتبہ القریش لاہور

۸۷- لیس کمثلہ شیء

۸۸- سرگزشت فلسفہ از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

۸۹- پیام مشرق

۹۰- حضرت سید نفیس شاہ صاحب، نفیس رقم

۹۱- خطباتِ اقبالؒ

۹۲- مظاہر فطرت اور قرآن از ڈاکٹر عبدالودود

۹۳- ایضاً

۹۴- ڈش پر دیکھی گئی ایک دستاویزی فلم ''مسٹریز''

۹۵- تشکیل جدید

۹۶- کرامت حسین جعفری

۹۷- ایلگزینڈر رسولزنیٹسن

۹۸- صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا سکینڈل

۹۹- Homosex Uality از امام علاؤالدین

۱۰۰- فادر اینڈریو ایم گریلے

۱۰۱- گرور جنیش اور اس کا حلقہ

۱۰۲- شہوانیت سے الوہیت تک

۱۰۳- طلوع اسلام مارچ ۱۹۷۵ء از غلام احمد پرویز

۱۰۴- ہارورڈ کلاسیکس

۱۰۵- Patterns of Culture

۱۰۶- ایضاً

۱۰۷- عرسوں اور میلوں میں لکڑی کا ایک مصنوعی کنواں جس میں موٹر سائیکل یا کار

چلانے کا کرتب دکھایا جاتا ہے۔

۱۰۸- Patterns of Culture by Ruthbeni dict

۱۰۹- امام علاء الدین شہباز

۱۱۰- (Homosexuality) از امام علاء الدین

۱۱۱- ''ویبسٹر'' ڈکشنری

۱۱۲- کتاب ایڈا کائیل

۱۱۳- فرشتے: فرشتہ سیرت انسان

۱۱۴- نہ ہونے کے برابر

۱۱۵- اور پھر انسان کی تخلیق ہوئی

۱۱۶- ''ماہنامہ المرشد'' اپریل ۲۰۰۱ء

۱۱۷- معرکہ مذہب و سائنس۔ ترجمہ ڈاکٹر ڈریپر از مولانا ظفر علی خان

۱۱۸- ایک انگریز مورخ (۱۷۳۷ء-۱۷۹۴ء) جس نے روم کی مفصل تاریخ لکھی۔

۱۱۹- تشکیل انسانیت

۱۲۰- تشکیل انسانیت، یہ معلومات ہم نے غلام جیلانی برق کی کتاب ''یورپ پر اسلام کے احسان'' سے لی ہے۔

۱۲۱- شہاب نامہ

۱۲۲- طلوع اسلام مارچ (۱۹۵۸ء از پرویز)

جن کتب سے استفادہ کیا گیا

۱- قرآن حکیم

۲- کتاب مقدس (بائبل)

۳- Reconstruction of Relegious thought in Islam

۴- معرکہء مذہب و سائنس از ڈاکٹر ڈریپر ترجمہ: مولانا ظفر علی خان

۵- یورپ پر اسلام کے احسانات

۶- تاریخ صنمیات بابل

۷- انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا

۸- ''مظاہر فطرت اور قرآن'' از ڈاکٹر عبدالودود

۹- ''طلوع اسلام'' مارچ ۱۹۵۷ء

۱۰- Patterns of Culture از رتھ بینی ڈکٹ

۱۱- ''Homosexuality'' از امام علاء الدین شہباز (امریکہ)

۱۲- شہاب نامہ

۱۳- چاہ بابل از قمر اجنالوی

۱۴- کاما ٹو راما (Kama to Rama) از گرور جنیش

۱۵- ہسٹری آف سیریا

۱۶- سرگزشت فلسفہ از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

۱۷- رامائن

۱۸- ہندوؤں کی کلاسیکل ڈکشنری